اسلام کا نظامِ حیات

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

مکتبہ خُدّامُ القُرآن لاہور
36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون : 3-35869501
maktaba@tanzeem.org

جملہ حقوق بحق مرکزی انجمن خدام القرآن اور دینِ حق ٹرسٹ محفوظ ہیں!

مذکورہ بالا دونوں ادارے ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی کتابوں، تحریروں اور اقتباسات کے ضمن میں اجازت دیتے ہیں کہ کوئی شخص یا پبلشر اگر ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے علمی مواد کو شائع کرنا چاہتا ہے تو وہ اشاعت سے قبل چند ضوابط کی پابندی کرتے ہوئے، قیمتاً فروخت کرنے یا مفت تقسیم کرنے کے لیے، تحریری اجازت بلامعاوضہ مذکورہ بالا دونوں اداروں میں سے کسی ایک سے ضرور حاصل کرلے۔ اگر کوئی فرد / پبلشر معیّن کردہ ضوابط کی خلاف ورزی کرے گا تو اُس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔

نام کتاب ——— اسلام کا نظامِ حیات

طبع اوّل (مارچ 2022ء) ——— 1100

ناشر ——— ناظم نشر و اشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت ——— 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: 3-35869501

مطبع ——— شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

قیمت (اشاعت خاص، مجلد) ——— 550 روپے

ISBN : 978 - 969 - 606 - 081 - 9

email:publications@tanzeem.org
website:www.tanzeem.org

فہرست

خطاب ① اسلامی نظام کی نظریاتی اساس: ایمان 05

- اسلامی تحریک کی اساس: شعوری ایمان
- ایمان کا موضوع
- کائنات اور خالقِ کائنات کا تعلق
- انسانی زندگی کی حقیقت
- اسلامی انقلاب کی فکری اساس
- یقینِ قلبی کا ذریعہ: قرآنِ مجید

خطاب ② اسلام کا اَخلاقی اور روحانی نظام 41

- اسلام کا اَخلاقی نظام
- اعلیٰ اخلاق کے لیے جذبۂ محرکہ
- اسلام کا روحانی نظام
- دین کی روحانی تعلیمات اور احیائی تحریکیں
- سلوکِ قرآنی کے تین مراحل
- تقرب الی اللہ کے دو راستے

خطاب ③ اسلام کا سماجی اور معاشرتی نظام 101

- اجتماعی نظام میں عدل و اعتدال کی تلاش
- اسلامی نظام کا مرکزی خیال
- معاشرت کا نقطۂ آغاز: رشتۂ ازدواج
- مرد کی قوامیت کے لیے تدریجی اسلوب
- خاندانی نظام کا دوسرا رُخ: حقوقِ والدین
- ضبطِ نفس اور ستر و حجاب کے اَحکام

خطاب ④ اسلام کا سیاسی اور ریاستی نظام 159

- اسلامی ریاست ایک نظریاتی ریاست
- اجتماعی خلافت کا تصوّر
- 'تھیوڈیموکریسی' ایک جامع اصطلاح
- تھیوڈیموکریسی کی عملی شکل
- عدلیہ کی اہمیت اور علماء کا کردار
- اسلامی ریاست میں شرطِ شہریت: اسلام

خطاب ⑤ اسلام کا معاشی اور اقتصادی نظام 211

- سرمایہ داری اور اشتراکیت کا تقابلی جائزہ
- اسلام کے دو معاشی نظام
- اسلام میں زکوٰۃ کا نظام اور اس کی برکات
- سود کی حرمت و شناعت
- اسلام کا نظریۂ قدرِ زائد
- معاشی توازن کے لیے اسلام کی تدابیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقدیم

''اسلام کا نظامِ حیات'' بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے لیے خصوصی دلچسپی کا موضوع تھا اور انہوں نے اس کے مختلف گوشوں پر متعدد بار اظہارِ خیال فرمایا۔ ڈاکٹر صاحبؒ کے خطابات میں اسلام کے ''Politico-Socio-Economic System'' کا حوالہ جابجا ملتا ہے۔ آج سے لگ بھگ تیس برس قبل آپؒ نے اس ضمن میں ایک مربوط سلسلۂ خطابات ارشاد فرمایا تھا اور اسلام کے نظامِ حیات کے مختلف گوشوں کو قرآنِ حکیم کی روشنی میں قدرے وضاحت کے ساتھ بیان کیا تھا۔ پہلے خطاب میں اس موضوع کے اصول ومبادی بیان کرتے ہوئے اسلامی نظام کی فکری ونظریاتی اساس ''ایمان'' پر سیر حاصل گفتگو فرمائی' جسے اس سلسلۂ خطابات میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے واضح فرمایا کہ فرد کی شخصیت کے دو رُخ ہیں' یعنی اس کا فکر اور عمل' جن میں مطابقت ضروری ہے۔ اسی طرح ایک قوم اور معاشرے کے اجتماعی فکر سے اس کے نظامِ حیات کی تشکیل ہوتی ہے اور اسلامی نظامِ حیات کی فکری اساس ''ایمان'' ہے۔

ڈاکٹر صاحبؒ کا دوسرا خطاب ''اسلام کا اخلاقی اور روحانی نظام'' کے موضوع پر ہے' جس کے دونوں حصوں پر آپ نے ایمان افروز گفتگو فرمائی۔ اس کے بعد کے تین خطابات اسلامی نظامِ حیات کے ان تین گوشوں پر محیط ہیں جنہیں ڈاکٹر صاحب Politico-Socio-Economic System سے تعبیر فرماتے تھے۔

یہ پانچ خطابات ۲۰۱۰ء میں ترتیب وتدوین کے بعد ماہنامہ ''میثاق'' کے صفحات کی زینت بنے تھے۔ ان کی ایڈیٹنگ جناب محبوب الحق عاجز' محترم اویس پاشا قرنی اور حافظ محمد زاہد نے کی تھی جب کہ نظرثانی کی سعادت راقم الحروف کے حصے میں آئی۔ اب اس مربوط سلسلۂ خطابات کو کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے لیے صدقہ جاریہ اور اس کے مرتّبین کے لیے دنیوی واُخروی فوز وفلاح کا باعث بنائے۔

۸/مارچ ۲۰۲۲ء

خالد محمود خضر

مدیر شعبہ مطبوعات

خطاب ①

اسلامی نظام کی نظریاتی اساس:

ایمان

خطبۂ مسنونہ کے بعد تلاوتِ آیات:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ - بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ قف لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ قف وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ ﴿۲۸۵﴾﴾ (البقرۃ)

﴿وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ط مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰکِنْ جَعَلْنٰہُ نُوْرًا نَّھْدِیْ بِہٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ط وَاِنَّکَ لَتَھْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۵۲﴾﴾ (الشوریٰ)

ادعیہ ماثورہ کے بعد:

معزز حاضرین اور محترم خواتین!

جس سلسلۂ خطبات کا آغاز اس وقت ہو رہا ہے، اس کا اصل موضوع ''اسلام کا نظامِ حیات'' ہے۔ چنانچہ ہمیں اسلام کے نظامِ حیات کے مختلف گوشوں پر قرآنِ حکیم کی روشنی میں غور و فکر کرنا ہے۔ لیکن ظاہر ہے، ایک خطبے میں ساری تفاصیل بیان نہیں کی جا سکتیں، لہٰذا آج کی نشست میں اس موضوع کے اصول و مبادی کو سمجھیں گے۔ بالفاظِ دیگر آج کے خطبہ میں، جو درحقیقت تمہید کی حیثیت رکھتا ہے، ہم اسلامی نظام کی فکری اساس کا مطالعہ کریں گے۔ اس بارے میں چند ابتدائی باتیں قابلِ غور ہیں۔

فرد میں فکر و عمل کی مطابقت

فرد کی شخصیت کے دو رُخ ہیں، یعنی اس کا فکر اور عمل۔ ایک نارمل انسان میں یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں، ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ فکر صحیح ہو تو عمل صحیح ہوگا اور فکر میں کجی ہو تو اس کا لازمی نتیجہ عمل میں کجی کی صورت میں نکلے گا۔ فکر محدود ہو تو عمل بھی محدود ہوگا، اور فکر میں وسعت کی صورت میں انسان کے اخلاق، معاملات، رویّے اور عمل میں بھی وسعت موجود ہوگی۔ فکر و عمل کی عدم مطابقت ایک صحت مند شخصیت میں نہیں ہو سکتی، البتہ مریض شخصیات کا معاملہ جُدا ہے۔ اُن کے ہاں ہو سکتا ہے کہ فکر اور عمل کے دھارے مخالف سمت چلتے ہوں۔ مثلاً ایک شخص کو جسمانی عوارض لاحق ہیں۔ اس کے اندر خواہش تو ہے کہ کوئی کام کرے، لیکن جسمانی کمزوری اور معذوری کے باعث وہ اس کام کو سرانجام نہیں دے سکتا۔ اسی طرح ایک آدمی کو نفسیاتی عوارض لاحق ہوں، جن کی وجہ سے اُس کی قوتِ ارادی مضمحل ہو جائے، تو وہ کچھ کرنا چاہتا بھی ہو پھر بھی کچھ کر نہیں پاتا۔ اس کی بہت ہی سادہ سی مثال ہمارے معاشرے میں سگریٹ نوشی کرنے والے لوگ ہیں۔ ہمارے ہاں کتنے ہی لوگ ہیں جو تمباکو نوشی چھوڑنا چاہتے ہیں، اس کے مضر اثرات ان کے علم میں ہوتے ہیں، لیکن وہ اپنی عادت کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں اور اس کے چھوڑنے پر قدرت نہیں پاتے۔ تو یہ استثناء ہے۔ البتہ عام اصول یہی ہے کہ ایک نارمل شخص کے فکر و عمل میں مطابقت ہو۔

البتہ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مَیں لفظ ''فکر'' استعمال کر رہا ہوں ''قول'' نہیں۔ ایک نارمل انسان میں فکر و عمل کا تضاد نہیں ہوتا۔ قول و فعل کا تضاد اور شے ہے، اور ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے قول اور عمل میں تضاد پایا جاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کو سخت غُصّہ دلانے والی شے ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝٢ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝٣﴾ (الصف)

''اے ایمان والو! کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔ اللہ کے ہاں یہ بات سخت

بیزاری کی ہے کہ تم وہ کہو جو کرتے نہیں۔''

قول و عمل کا تضاد اس لیے ہوتا ہے کہ انسان جو کچھ کہہ رہا ہوتا ہے اس پر اس کو ذاتی یقین حاصل نہیں ہوتا۔ وہ جس بات کا دعویٰ اور اعلان کرتا ہے' اُس پر عمل اس لیے نہیں کرتا کہ اس کی حقیقی سوچ وہ نہیں ہوتی۔ قول و عمل کے تضاد کی سب سے بڑی مثال ہم مسلمانوں کا طرزِ عمل ہے۔ ہماری عظیم اکثریت اس وقت جن چیزوں کو ماننے کی مدّعی ہے' وہ اکثر و بیشتر لوگوں کے ہاں صرف ایک عقیدہ کی حد تک ہیں اور بندھی پوٹلی کی صورت میں دماغ کے کسی گوشے میں رکھی ہوئی ہیں۔ یہ عقیدہ ان کے فکر میں پیوست شدہ اور ان کی سوچ میں سرایت کیے ہوئے نہیں ہے۔ بہرحال مَیں یہاں ''فکر'' کا لفظ استعمال کر رہا ہوں' اور لوگوں کے فکر و عمل میں تضاد صرف استثنائی حالات ہی میں نظر آئے گا' عام حالات میں ایسا نہیں ہوتا۔

جس طرح ایک فرد کا معاملہ ہے اسی طرح کا معاملہ ایک معاشرے' قوم اور کمیونٹی کا بھی ہے۔ ایک قوم اور معاشرہ کا بھی ایک اجتماعی فکر ہوتا ہے۔ اسی اجتماعی فکر سے اس کے نظامِ حیات کی تشکیل ہوتی ہے۔ یعنی اس کا نظامِ اقدار وجود میں آتا ہے' اس کے نظامِ اخلاق کی تعمیر ہوتی ہے' اس کے نظامِ معاشرت کی صورت گری ہوتی ہے' اُس کا نظامِ معیشت تشکیل پاتا ہے' اُس کا نظامِ سیاست وجود میں آتا ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ اجتماعی نظامِ حیات ایک حیاتیاتی اکائی (organic whole) ہے۔ یہ ایک ایسی حیاتیاتی حقیقت ہے جس کے اجزاء کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ نظامِ حیات ایک حیاتیاتی حقیقت ہونے کے ساتھ ساتھ قوم اور معاشرے کی اجتماعی فکر کے ساتھ مربوط ہوتا ہے۔ اگر اجتماعی فکر' اجتماعی سوچ اور اجتماعی نقطۂ نظر تبدیل نہ ہو تو معاشرے کے اجتماعی نظامِ حیات میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ (یاد رہے کہ مَیں لفظ ''فکر'' استعمال کر رہا ہوں' ایک ایسے موروثی عقیدہ کی بات نہیں کر رہا جو محض نسلاً بعد نسلٍ چلا آتا ہے' لیکن قوم کے اجتماعی فکر اور سوچ میں پیوست نہیں ہوتا۔) مثال کے طور پر کمیونزم' ڈیموکریٹک سوشلزم یا سوشل ڈیموکریسی' یہ بھی اجتماعی نظام ہیں جن سے ایک خاص قسم کی معیشت اور

ایک خاص طرز کی سیاست وجود میں آتی ہے۔ یہ ایک مخصوص اجتماعی فکر کی پیداوار ہیں۔ ان نظاموں کی فکری اساس جدلی مادّیت کا نظریہ ہے' جس نے پوری کائنات اور تاریخ کی ایک مادّی توجیہہ کی۔ اس نظریہ یا فکر کے مطابق انسان کے لیے اہم ترین مسئلہ اس کا معاشی مسئلہ ہے' لہٰذا اجتماعی زندگی میں اصل شے وقت کا معاشی نظام ہے' اور معاشی نظام ہی سے اخلاقی اقدار وجود میں آتی ہیں۔ یہ فکر و فلسفہ ایک شخص نے اپنی کتاب میں پیش کیا۔ اس فکر نے کچھ لوگوں کے ذہنوں پر تسلّط قائم کیا۔ پھر انہی لوگوں نے اس فکر کے زیرِ اثر اشتراکی انقلاب برپا کیا۔ کمیونزم' سوشلزم اور سوشل ڈیموکریسی وغیرہ یہ جدلی مادّیت کے شیڈز ہیں۔ ان سب کی فکری اساس اسی پر استوار ہے۔ اسی طرح کا معاملہ اسلام کے نظامِ حیات یا اسلامی نظامِ زندگی کا ہے۔ اس کی بھی ایک فکری اساس ہے۔ اس کے لیے ہمارے ہاں ایک اصطلاح ''ایمان'' ہے۔ لیکن مَیں یہ اصطلاح استعمال کرنے کی بجائے اس کے لیے ''فکری اساس'' کا لفظ استعمال کر رہا ہوں' تاکہ آپ اس حقیقت پر ذرا وسعتِ نظر سے غور کر سکیں۔

'اسلام کا نظامِ حیات' کی اصطلاح: حادث یا قدیم؟

''اسلام کا نظامِ حیات'' ایک ایسی اصطلاح ہے جو حقیقتاً تو قدیم ہے' لیکن واقعتاً حادث ہے۔ حادث اس معنی میں کہ ہمارے دینی لٹریچر میں اس اصطلاح کا کوئی وجود نہیں تھا۔ یہ اصطلاح نہ تو قرآن مجید میں موجود ہے اور نہ احادیث نبویہؐ کے ذخیرہ میں جو میری نگاہ سے گزرا ہے' مجھے مل سکی ہے۔ میرا گمان ہے کہ ہمارے متقدمین' مفکّرین اور ائمّہ کے ہاں بھی یہ اصطلاح موجود نہیں ہے۔ بلکہ میرے علم کی حد تک لفظ ''نظام'' بھی پہلی بار شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے استعمال کیا ہے۔ انہوں نے ''فَکُّ کُلِّ نِظَامٍ'' کا انقلابی نعرہ لگایا۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ ''اسلامی نظامِ حیات'' کی اصطلاح حادث ہے۔ یہ اصطلاح قدیم اس اعتبار سے ہے کہ یہ نوشتۂ دیوار کی مانند ایک روشن حقیقت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جزیرہ نمائے عرب میں جو انقلاب برپا کیا اور آپؐ جو ہمہ گیر تبدیلی لائے' اس نے زندگی کے تمام گوشوں کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا برپا کردہ

انقلاب صرف عقیدے کی تبدیلی نہ تھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ اس سے صرف انفرادی زندگی میں تبدیلی آ گئی تھی اور محض انفرادی اخلاق کی تربیت اور تزکیہ کا سامان ہو گیا تھا۔ یہ ساری چیزیں بھی موجود تھیں، لیکن ان کے ساتھ ساتھ یہ انقلاب ایک مکمل نظامِ معیشت، ایک مکمل نظامِ سیاست وحکومت، ایک مکمل قانونِ حدود وتعزیرات، ایک مکمل قانونِ وراثت، ایک مکمل قانونِ فوجداری و دیوانی کا حامل تھا۔ الغرض یہ زندگی کے ہر ہر گوشے کو بدل دینے والا انقلاب تھا۔ یہ کامل نظامِ حیات تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس نظامِ حیات کا عملی نمونہ بھی قائم کر کے دکھا دیا۔ ساری دنیا مانتی ہے کہ یہ نظام تقریباً تیس برس کامل صورت میں دنیا بھر میں قائم رہا۔ اگرچہ بعد میں اس پر زوال آیا، لیکن آنِ واحد میں یہ سارا نظام ختم نہیں ہو گیا، بلکہ اس کا خاتمہ بھی بتدریج ہوا۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ اسلام کا نظامِ حیات حقیقتاً تو قدیم ہے، لیکن جہاں تک ''اسلامی نظامِ حیات'' کی اصطلاح کا تعلق ہے تو یہ ایک حادث اصطلاح ہے۔

میرے نزدیک ''اسلامی نظامِ حیات'' کی اصطلاح کا آغاز بہت ہی مرعوبیت کے ساتھ اور شکست خوردہ ذہنیت کی بنا پر ہوا۔ جب مغرب میں مختلف عمرانی نظریات سامنے آئے، مختلف نظامِ ہائے حیات کا تصوّر اُبھرا تو اُن سے مرعوبیت کے سے انداز میں ہمارے ہاں بھی ان نظریات کا ایک عکس اسلامی نظامِ حیات یا اسلامی نظام کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مثلاً جب یورپ میں آمریت کا دور دورہ ہوا اور فاشزم اور نازی ازم کا غلغلہ بلند ہوا تو ہمارے ہاں بھی کچھ لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ آمریت ہی صحیح اسلامی نظام ہے۔ پھر جب وہاں جمہوریت کا نعرہ لگا تو ہم نے یہ کہہ دیا کہ ہمارا نظامِ سیاست بالکل جمہوری ہے اور یہی نظام واقعتاً حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عطا کردہ ہے۔ اسی طرح جب وہاں سوشلزم کا شہرہ ہوا تو اسی مرعوبیت کے ساتھ ہم نے کہا کہ سوشلزم عین اسلام ہے اور یہ کہ اسلام سوشلزم کا داعی ہے۔ یہی معاملہ ''نظامِ حیات'' کی اصطلاح کا ہے۔ مغرب میں نظامِ زندگی کا تصوّر اُبھر کر سامنے آیا اور اس ضمن میں انسان نے مختلف ارتقائی مراحل طے کیے تو ہمارے ہاں بھی ''اسلام کے نظامِ حیات'' کا تصوّر پیدا ہوا۔

البتہ جیسے جیسے وقت گزرا' ہمارے ہاں ایسے مفکّرین پیدا ہوئے جو بحمدِ اللہ مرعوبیت اور شکست خوردہ ذہنیت سے بہت حد تک آزاد تھے۔ انہوں نے مغرب کے عمرانی نظریات کا تنقیدی مطالعہ کیا اور اس میں صحیح اور غلط اجزاء کو علیحدہ علیحدہ کیا۔ پھر ان اجزاء کے حوالے سے اسلام کے نظامِ حیات کو مرتّب اور مدوّن کر کے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ نظامِ حیات کے حوالے سے مرعوبیت کی کیفیت اب ایک شعور اور خود اعتمادی والی فضا میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اس کا ایک اور منطقی تقاضا بھی سامنے آیا۔ اسلامی نظامِ حیات کی طرح لوگوں میں یہ تصوّر بھی اُبھرا کہ اسلامی نظامِ حیات کو قائم کرنے کے لیے ایک ''اسلامی تحریک'' برپا کرنا ضروری ہے' بالکل اسی طرح جیسے مغرب میں مختلف نظام ہائے حیات کے لیے تحریکیں چلیں' مثلاً جمہوری تحریک' اشتراکی تحریک' نازی تحریک وغیرہ۔

'اسلامی تحریک' کی اصطلاح کا پس منظر

لفظ ''تحریک'' بھی ہمارے ہاں ابتدائی دینی لٹریچر میں موجود نہیں ہے۔ ایک زمانے میں اس لفظ کا استعمال شروع ہوا تو ہمارے بعض بزرگوں نے اس پر گرفت کی کہ اس لفظ کا استعمال خطرات سے خالی نہیں ہے۔ اس لیے کہ لفظ ''تحریک'' کے مخصوص مفاہیم ہیں۔ اگر آپ اسلام کو ایک ''تحریک'' قرار دیں گے تو اس سے اُن مفاہیم کو پھیلنے سے نہیں روک سکیں گے جو تحریک کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ سارے مفاہیم اور تصوّرات بھی اسلام میں شامل ہو جائیں گے۔ اس حوالے سے ایک دور میں مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ایک وقیع شذرہ بھی تحریر کیا تھا۔

اسلامی تحریک کی اصطلاح دراصل گزشتہ صدی کی تیسری دہائی کے بعد بکثرت استعمال ہونا شروع ہوئی۔ دراصل مسلم لیگ جو پہلے خواص کی جماعت تھی' ۱۹۳۷ء کے بعد عوامی تحریک کی صورت میں اُبھری۔ اس دور میں مسلم لیگ نے کانگرس کی تحریک کے مقابلے میں مسلمانوں کو جمع کرنے کے لیے اسلامی حکومت' اسلامی نظام اور اسلامی سیاست جیسی اصطلاحات کو بکثرت استعمال کیا۔ چنانچہ اس سے ان اصطلاحات کا بہت چرچا ہوا

اور لوگوں میں اسلامی حکومت قائم کرنے کا ایک جذبہ اُبھرا۔ انہیں خیال آیا کہ ہمارا بھی اپنا ایک نظام ہے اور ہمیں اپنے اس نظام کو برپا کرنا چاہیے' اسلامی حکومت قائم ہونی چاہیے۔

۱۹۳۹ء میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے علی گڑھ کے سٹریچی ہال میں ایک تقریر کی' جس میں انہوں نے اس دور کے تناظر میں یہ بیان کیا کہ بہت سے سیاسی اور سماجی عوامل کے باعث اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک اسلامی حکومت کے قیام کی شدید خواہش تو پیدا ہو چکی ہے اور اُن میں ایک جوش و جذبہ پایا جاتا ہے' لیکن یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی جا رہی ہے کہ اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے۔ انہوں نے بھرپور تجزیے اور مضبوط دلائل کے ساتھ یہ بات ثابت کی کہ مسلمانوں کی ایک قومی تحریک کے ذریعے اسلامی ریاست کبھی قائم نہیں ہو سکتی۔ اس کے نتیجے میں صرف ایک قومی ریاست ہی وجود میں آسکتی ہے۔ اُن کا یہ تجزیہ ایک تلخ حقیقت تھی جسے بعد میں تاریخ نے سچ ثابت کر دیا۔ آج پاکستان کے قیام کو ۴۱ برس ہو چکے ہیں۔ (یاد رہے کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا یہ خطاب ۱۹۸۸ء کا ہے) مسلم لیگ کی قومی تحریک کے نتیجے میں پاکستان تو معرضِ وجود میں آ گیا' لیکن اسلامی حکومت اور اسلامی نظام کا خواب تا حال شرمندۂ تعبیر ہے۔ مولانا مودودیؒ نے واضح کیا کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے ایک ''اسلامی تحریک'' ضروری ہے' جس کے کچھ نمایاں خدوخال ہیں۔ انہوں نے اس حوالے سے خود پیش قدمی بھی کی کہ قومی تحریک کی منجدھار سے ہٹ کر ایک الگ راستہ اپناتے ہوئے' جماعتِ اسلامی' کے نام سے ایک جماعت کی تاسیس کی۔

اسلامی تحریک کی اساس: شعوری ایمان

مولانا مودودیؒ نے یہ بات تو صحیح فرمائی تھی کہ اسلامی نظام ایک اسلامی تحریک ہی کے نتیجے میں برپا ہوگا' لیکن یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہیے کہ اس تحریک کے ضمن میں اہم ترین شے اُس کی فکری اساس ہے۔ فکری اساس ہی کے لیے ہم لفظ ''ایمان'' استعمال کرتے ہیں۔ جب تک ایمان ایک شعوری عقیدے کی شکل نہ اختیار کر لے' جب تک وہ ایک ذاتی یقین (personal conviction) کی صورت میں نہ ڈھلے اور اس کے اندر

یقین کی گہرائی اور گیرائی کی کیفیت نہ پیدا ہو جائے' اس وقت تک ایک حقیقی اسلامی تحریک کا آغاز نہیں ہوگا۔ آپ ایک مسلمان قوم کے موروثی عقائد کی بنیاد پر' جن میں یقین کی حرارت اور گہرائی و گیرائی نہ ہو' ایک جماعت تو بنالیں گے' اور ہوسکتا ہے کہ جماعت کے لوگوں میں وقتی جوش و خروش بھی پیدا ہو جائے' لیکن اس سے اسلامی تحریک برپا نہیں ہوگی۔ ہمارے ہاں کتنی ہی تحریکیں ہیں جو جوش و خروش کا مظاہرہ کر چکی ہیں۔ اس حوالے سے نظامِ مصطفیٰ ﷺ کی تحریک ایک مثالی تحریک تھی' لیکن اس سے کیا نتیجہ برآمد ہوا؟ اسلامی تحریک برپا کرنے کے لیے ضروری یہ ہے کہ ہم اس موروثی عقیدے پر انحصار نہ کریں جس کا نام ہم نے ''ایمان'' رکھ لیا ہے۔ اس لیے کہ یہ شعوری ایمان نہیں' یہ ہمارا ایک وراثتی عقیدہ ہے جو نسلاً بعد نسلٍ ہم میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ یہ عقیدہ ہماری ذاتی سوچ میں پیوست اور ہمارے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے نہیں ہے۔ اس نے ہمارے ذاتی یقین کی شکل اختیار نہیں کی ہے۔ اس میں burning faith کی حرارت موجود نہیں ہے۔ لہٰذا اسلامی تحریک کے لیے فکری اساس کی تعمیرِ نو ناگزیر ہے۔ (مَیں جان بوجھ کر لفظ ''ایمان'' کی بجائے ''فکری اساس'' استعمال کر رہا ہوں۔ اس کے لیے میرے سامنے علّامہ اقبال کے خطباتِ مدراس کا عنوان ہے: Reconstruction of Religious Thought in Islam یعنی ''فکرِ اسلامی کی تشکیلِ نو'')

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے انسانی تاریخ کا عظیم ترین انقلاب برپا کیا اور اس کے لیے آپؐ نے عظیم انقلابی جِدّ و جُہد کی۔ اس اعتبار سے اگر آپ نبی کریم ﷺ کی عظیم جِدّ و جُہد کو انقلابی تحریک سے تعبیر کریں تو مجھے اختلاف نہیں ہوگا۔ لیکن یہ بات پیشِ نظر رہنی ضروری ہے کہ حضور ﷺ کی اس جِدّ و جُہد میں بھی ایک ترتیب رہی ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے کہا تھا ؎

خدا کے کام دیکھو' بعد کیا ہے اور کیا پہلے
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے!

نبی اکرم ﷺ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اندر ایمان کی بنیادوں کو استوار کرنے میں

بڑی محنت کرنا پڑی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان صرف ایک عقیدہ یا وراثتاً منتقل ہو جانے والے چند عقائد کا مجموعہ نہیں تھا' بلکہ وہ اُن کے رگ و پے میں سرایت کر جانے والی ایک زندہ حقیقت تھی۔ اُن کے لیے ایمانی حقائق محض سنے ہوئے حقائق نہیں تھے بلکہ ایسے یقین کی شکل اختیار کر چکے تھے جس کو حدیثِ جبریل میں ان الفاظ میں تعبیر فرمایا گیا: ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ)) ''تم اللہ کی یوں عبادت کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو'' — یہ حدیثِ جبریل کا سب سے زیادہ معروف متن ہے اور ان الفاظ کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔ دو اور صحابہ' حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے جو روایات مروی ہیں' اُن کے الفاظ میں باریک سا فرق ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے: ((اَنْ تَخْشَی اللّٰہَ تَعَالٰی کَاَنَّکَ تَرَاہُ)) ''تمہیں اللہ سے اس طرح کی خشیت ہونی چاہیے گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو''۔ اور دوسری روایت میں آیا ہے: ((اَنْ تَعْمَلَ لِلّٰہِ کَاَنَّکَ تَرَاہُ)) ''کہ تم عمل کرو (یا محنت کرو) اللہ کے لیے گویا کہ تم اُسے دیکھ رہے ہو'' — ((فَاِنْ لَمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ)) ''اگر تم اُسے نہیں دیکھ رہے تو (یہ احساس تو ہو کہ) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔'' کم از کم اس درجے میں تو استحضار موجود رہے۔ چنانچہ اسی کا عکس ہمیں ایک صحابیؓ کے قول میں ملتا ہے۔

ایک روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نمازِ فجر کے بعد حسبِ معمول مسجد میں بیٹھے تھے۔ آپؐ نے ایک صحابی سے پوچھا: آج تمہاری صبح کیسے ہوئی؟ انہوں نے جواب دیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! مجھے ایک خالص اور سچے مؤمن کی صبح نصیب ہوئی ہے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر سوال کیا: تمہاری اس ایمانی کیفیت کی صفت اور علامت کیا ہے؟ صحابیؓ نے عرض کیا: حضور میری کیفیت تو یہ تھی کہ گویا میں اپنی آنکھوں سے جنّت کو دیکھ رہا ہوں اور گویا اپنی آنکھوں سے جہنّم کو دیکھ رہا ہوں۔ چنانچہ جب تک یقین کی یہ گہرائی پیدا نہیں ہوگی' اسلامی تحریک نہیں چل سکتی۔ اس کے بغیر ایک سیاسی تحریک تو برپا ہو سکتی ہے اور اس میں گہرا مذہبی رنگ اور نمایاں جوش و ولولہ بھی ہو سکتا ہے' اس میں لوگ قربانیاں بھی دے سکتے ہیں اور تن من دھن بھی لگا سکتے ہیں' جیسا کہ ماضی قریب میں مسلمانانِ پاکستان

نے تحریک نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں جانیں دی ہیں' لیکن ایک اسلامی تحریک' جو اسلامی نظام کو قائم کر سکے' اس کی بنیادیں اگر ایمان پر نہ اٹھائی گئی ہوں اور اس کی فکری اساس پختہ' محکم اور مستحکم نہ ہو تو وہ کبھی اسلامی نظام کے قیام اور حقیقی اسلامی انقلاب کے برپا ہونے پر منتج نہیں ہو سکتی' بلکہ وہ لازماً کہیں درمیان میں رہ جائے گی۔ یا تو اس کا جوش وخروش ٹھنڈا پڑ جائے گا' یا وہ مشرق یا مغرب کی طرف رخ موڑ لے گی' یا ماحول کے ساتھ مصالحت کر لے گی' یا تحریک کے وابستگان کی ہمت جواب دے جائے گی اور وہ اپنی کم ہمتی کے لیے طرح طرح کے بہانے تراشیں گے۔

اب مَیں اسلامی نظام کی فکری اساس کے لیے دوسرا لفظ ''ایمان'' استعمال کر رہا ہوں۔ آیئے' ایمان کی حقیقت کے بارے میں کچھ باتیں سمجھ لیجیے!

ایمان کا موضوع

پہلی بات یہ ہے کہ ایمان کا موضوع کیا ہے؟ ایمان کا موضوع وہی سوالات اور مسائل ہیں جو فلسفے کا موضوع ہیں۔ یہ حقیقت پیشِ نظر رہے کہ انسانوں کی عظیم اکثریت تقلیدی مزاج کے لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ وہ جس معاشرے میں آنکھیں کھولتے ہیں' وہاں جو کچھ مانا جا رہا ہوتا ہے' وہ بھی اُسے مان لیتے ہیں اور جو کچھ کیا جا رہا ہو' وہی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ سوسائٹی میں جو بھی عقائد' نظریات اور افکار پہلے سے موجود ہوتے ہیں وہ اُن پر تنقیدی نگاہ ڈالے بغیر انہیں جوں کا توں قبول کر لیتے ہیں اور زندگی کی بھاگ دوڑ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ لیکن معاشرے میں ایک بہت ہی معمولی اقلیت ایسے لوگوں کی بھی پائی جاتی ہے جن کے اندر جستجو ہوتی ہے' ایک جذبہ اور ایک پیاس ہوتی ہے۔ وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ ہم کسی شے کو صرف اس لیے نہیں مان سکتے کہ بہت سے لوگ اسے مانتے ہیں' بلکہ تب مانیں گے جب ہمارا اپنا فہم' ہماری اپنی میزانِ عقل اُسے قبول کرے گی۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں قرآن ''اولوالالباب'' قرار دیتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا:

﴿ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ

لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾

''بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔''

یہی صاحبِ شعور ہیں اور عقل سے کام لینے والے ہیں۔ سورۃ البقرۃ میں ان کے لیے ''اولوالالباب'' کی جگہ ''قَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ'' کے الفاظ آئے ہیں۔ فرمایا:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾﴾

''بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں' رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں' کشتیوں (اور جہازوں) میں جو دریا (اور سمندر) میں لوگوں کے فائدے کی چیزیں لے کر رواں ہیں' اور مینہ میں جس کو اللہ آسمان سے برساتا ہے پھر اس سے زمین کو مُردہ ہو جانے کے بعد زندہ کر دیتا ہے' اور زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلانے میں' اور ہواؤں کے چلانے میں' اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں' عقل مندوں کے لیے (اللہ کی قدرت کی) نشانیاں ہیں۔''

گویا ''اولوالالباب'' اور ''قَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ'' مترادف الفاظ ہیں۔ اس قسم کے لوگ غور کرتے ہیں' سماج میں پائے جانے والے افکار و نظریات پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کیا شے قابلِ قبول ہے اور کیا ردّ کر دینے کے قابل ہے۔

ان لوگوں کے غور و فکر کے اصل مسائل کیا ہیں؟ یہ معلوم کرنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ علم کے دو گوشے ہیں: ایک تجرباتی علم ہے جو حواس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے' جبکہ دوسرا حقیقتِ کُلّی کی تلاش کا علم ہے۔ اسی علم کے مسائل اولوالالباب کے غور و فکر کا میدان ہیں۔ یعنی اس کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ کیا کائنات کا وجود ہمیشہ سے ہے اور وہ ہمیشہ رہے گی یا وہ حادث ہے؟ اگر حادث ہے تو کیا وہ خود بخود وجود میں آ گئی ہے یا کسی نے

اسے بنایا ہے؟ ہماری حقیقت کیا ہے؟ کیا ہم بھی حیوان ہیں' جیسے زمین میں اور حیوانات چل پھر رہے ہیں؟ اگر ہمارے اور حیوانات کے مابین فرق ہے' تو فرق کی نوعیت کیا ہے؟ کیا یہ صرف کمیتی فرق ہے' جیسے گھوڑے اور گدھے میں فرق ہے کہ ایک ذرا coarse animal ہے اور ایک refined animal ہے۔ کیا ہم میں اور گوریلے میں بس اتنا ہی فرق ہے کہ ہم ذرا refined ہو گئے ہیں اور وہ ابھی ارتقاء کی منازل طے کر رہا ہے؟ یا یہ کہ ہمارے اور حیوانوں میں بنیادی فرق نوعیت کا ہے؟ پھر یہ کہ ہمارے محرکاتِ عمل کیا ہیں؟ اور جبلّی افعال (instinicts) کون کون سے ہیں؟ اسی طرح آیا خیر و شر کوئی حقیقت ہے؟ کیا یہ محض سراب اور دھوکا ہے؟ (جیسا کہ انگریزی کا ایک بہت گمراہ کن محاورہ ہے:

"Nothing is good or bad, only thinking makes so"

یعنی کوئی بھی شے نہ اچھی ہے نہ بُری' یہ صرف انسان کی سوچ ہے جو اُسے اچھا یا بُرا بنا دیتی ہے۔) یا یہ کوئی حقیقی اقدار ہیں؟ اگر خیر و شر حقیقی اقدار ہیں تو کیا یہ مستقل ہیں یا ان میں تبدیلی آتی رہتی ہے؟ پھر یہ کہ وہ قوتِ محرکہ (motivating force) کون سی ہے جو انسان کو خیر اختیار کرنے پر مجبور کرے' خواہ بظاہر اس میں نقصان ہو رہا ہو اور شر اور بُرائی سے منع کرے' خواہ بظاہر اس میں فائدہ نظر آتا ہو؟ مثلاً سچ بولنا خیر ہے' لیکن بسا اوقات انسان کو بظاہر نظر آتا ہے کہ سچ بولنے میں خسارہ ہو رہا ہے۔ اسی طرح ایک شخص جانتا ہے کہ جھوٹ بولنا شر ہے' لیکن کبھی انسان محسوس کرتا ہے کہ جھوٹ بولنے میں نفع ہو رہا ہے۔ فارسی کا ایک شعر ملاحظہ ہو: ؎

اے دیانت بر تو لعنت از تو رنجے یافتم
اے خیانت بر تو رحمت از تو گنجے یافتم!

(یعنی اے دیانت تجھ پر لعنت ہو' تیری وجہ سے تو مجھے رنج و غم کا سامنا کرنا پڑا (لوگ مجھ سے ناراض ہو گئے) اور اے خیانت تجھ پر رحمتیں ہوں' تیرے ذریعے مجھے خزانے ملے ہیں۔)

اب ان صورتوں میں سچ بولنے اور جھوٹ سے بچنے پر آمادہ کرنے والی قوت کون سی ہے؟

فلسفے کا ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ کیا واقعی، حتمی اور یقینی علم کا حصول انسان کے لیے ممکن ہے یا نہیں؟ اگر یقینی علم کا حصول ممکن ہے تو اس کی ماہیت کیا ہے؟ پھر یہ کہ زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ ہمارا وجود صرف پیدائش سے موت تک ہی محدود ہے یا اس دنیا سے آنے سے پہلے بھی ہمارا وجود تھا اور یہ زندگی ہمارے اُسی وجود کا تسلسل ہے؟ اور اگر موت کے بعد بھی یہ وجود رہے گا تو اس کی کیا کیفیت ہوگی؟

اولوالالباب کی تلاش و جستجو

ان تمام مسائل اور سوالوں پر اصحابِ عقل سوچ بچار کرتے ہیں، اگرچہ ایسے لوگ انسانی معاشروں میں خوردبینی اقلیت (microscopic minority) ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے اس قسم کے سوالوں کی تلاش میں عمریں کھپا دیتے ہیں۔ ان لوگوں کو دنیا کی کسی شے سے دلچسپی نہیں رہتی، جب تک کہ وہ ان سوالات کا کوئی تسلّی بخش جواب حاصل نہ کرلیں۔ گہرے غور و فکر اور تلاش و جستجو کے بعد انہیں جو جواب ملتا ہے وہ انہیں اتنا عزیز ہوتا ہے کہ اس کے لیے اپنی جان تک قربان کر دیتے ہیں۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی زندگیوں میں خواہ ان کی باتوں کو رد کیا گیا ہو، چاہے انہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہو، چاہے ان کو جاہل، پاگل اور مجنون کہا گیا ہو، لیکن ان کے مرنے کے بعد عامۃ النّاس اُن کے نظریے کو قبول کر لیتے ہیں اور کروڑوں لوگ ان کے پیروکار بن جاتے ہیں۔

گوتم بدھ کی مثال لے لیجیے۔ ان کے پاس کیا کچھ نہیں تھا؟ جوان بیوی موجود تھی، شیر خوار بچہ تھا، عالیشان گھر تھا، شان و شوکت تھی۔ الغرض زندگی میں جتنی بھی چیزوں سے انسان کو دلچسپی ہوسکتی ہے وہ ساری کی ساری چیزیں اُن کے پاس موجود تھیں۔ لیکن اُن کے ذہن میں کچھ سوالات پیدا ہوئے، مثلاً دنیا میں دکھ کیوں پائے جاتے ہیں؟ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ایک شخص ٹھوکر کھا کر گرتا ہے اور اُس کا سر پھٹ جاتا ہے۔ اسی طرح ایک شیر خوار بچہ والدین کی نگاہوں کے سامنے دم توڑ رہا ہوتا ہے اور والدین بے بسی کی تصویر بنے کچھ نہیں کر سکتے اور اُن پر صدمے کا پہاڑ ٹوٹ جاتا ہے۔ پھر یہ کہ انسان کے لیے ان دکھوں سے نجات کا کوئی راستہ ہے بھی یا نہیں؟ اس قسم کے سوالوں نے گوتم بدھ کو کرب

میں مبتلا کر دیا۔ چنانچہ جوان بیوی' شیر خوار بچہ اور گھر بار چھوڑ کر تلاشِ حقیقت کے لیے جگہ جگہ پھرتے رہے' کبھی ایک رِشی کے پاس پہنچے تو کبھی دوسرے کے پاس۔ اس تلاش و جستجو کے نتیجے میں انہوں نے جو کچھ پایا' اس سے قطع نظر کہ وہ کتنا صحیح ہے' یہ حقیقت ہے کہ آج کروڑوں لوگ اُن کے نام لیوا اور پیروکار ہیں۔ دوسری مثال سقراط کی ہے۔ سُقراط نے غور و فکر سے کچھ نتائج اخذ کیے اور پھر انہیں عام کرنا شروع کیا۔ چونکہ اُس کے افکار معاشرے کی فکر سے مختلف تھے' لہٰذا قوم نے اس کے سامنے دو اختیار (options) رکھے' یا تو خاموش رہو اور اپنے نظریات کی تبلیغ نہ کرو' یا پھر زہر کا پیالہ پی کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لو۔ سقراط نے اسی مجلس میں زہر کا پیالہ پی لیا' مگر اپنے نظریات کی تبلیغ سے باز رہنا گوارا نہ کیا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ غور و فکر کے نتیجے میں انسان کو جو کچھ ملتا ہے اس کی قدر و قیمت اس کی نگاہ میں کیا ہوتی ہے۔ سقراط کی زندگی میں تو اُس کے ساتھ یہ سلوک ہوا' لیکن بعد میں اس کے فلسفے کو پذیرائی ملی۔ آج پوری دنیا میں مغربی فلسفے کی جو دو شاخیں چلی آتی ہیں یعنی حقیقت پسندی (Realism) اور تصوّریت (Idealism) اُن کے امام کی حیثیت سقراط کو حاصل ہے۔

تیسری مثال حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی ہے۔ وہ ایران میں پیدا ہوئے' جہاں کے لوگ آتش پرستی میں مبتلا تھے۔ اُن کی طبیعت کو یہ چیز گوارا نہ ہوئی۔ انہوں نے سوچا عجیب بات ہے کہ ہم خود آگ جلائیں اور خود ہی اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جائیں۔ تلاشِ حقیقت کی جستجو نے انہیں مضطرب کر دیا۔ چنانچہ اپنا گھر بار اور اپنا ملک چھوڑ کر شام پہنچے۔ وہاں کچھ عیسائی راہبوں کی خدمت میں رہے۔ اس سے اُن کے علم کی پیاس کو کچھ تسکین حاصل ہوئی۔ اس کے بعد آپؓ ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے شخص کے پاس گئے۔ جس طرح گوتم بدھ ہندوستان کے رِشی مونی (جوگیوں کا خاموش رہنے والا گروہ) میں سے کبھی ایک کے پاس اور کبھی دوسرے کے پاس گئے' ایسے ہی سلمان فارسیؓ کئی لوگوں کے پاس گئے۔ آخری عالم شخص جس کے پاس آپؓ گئے تھے' جب اس کے انتقال کا وقت آیا تو آپؓ نے اس سے کہا کہ آپ کا آخری وقت آ گیا' لیکن

ابھی میری پیاس نہیں بجھی' اب مجھے بتایئے کہ آپ کے بعد مَیں کہاں جاؤں؟ اس عالم نے کہا کہ میری نظر میں اس وقت کوئی ایسا عالم نہیں جو صحیح راستہ پر ہو اور مَیں تمہیں اس کا پتا بتا سکوں۔ البتہ ایک نبی کے ظہور کا وقت قریب آ گیا ہے جو دینِ ابراہیمی پر ہوگا۔ عرب کی سرزمین پر اُس کا ظہور ہوگا اور ایک نخلستانی زمین کی طرف وہ ہجرت کریں گے۔ اگر تمہارا وہاں پہنچنا ممکن ہو تو ضرور پہنچنا۔ اُن کی علامت یہ ہوگی کہ صدقہ کا مال نہیں کھائیں گے' البتہ ہدیہ قبول کریں گے۔ ان کے دونوں شانوں کے قریب مہرِ نبوت ہوگی۔ جاؤ قسمت آزمائی کرو' شاید اللہ تمہیں ان کے قدموں تک پہنچا دے۔ چنانچہ آپؓ ایک قافلے کے ساتھ عرب کی طرف چل نکلے۔ راستے میں قافلے پر ڈاکہ پڑا تو انہیں غلام بنا کر فروخت کر دیا گیا۔ آپؓ کو خریدنے والا مدینہ کا ایک یہودی تھا' چنانچہ آپؓ مدینہ پہنچ گئے۔ آپؓ کی حیثیت چونکہ غلام کی تھی' لہٰذا یہ سننے اور جاننے کے باوجود کہ مکّہ میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے' پابند ہونے کی بنا پر وہاں جا نہیں سکتے تھے۔ مَیں یہ کہا کرتا ہوں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے حوالے سے شاید یہ بات غلط نہ ہو کہ ان کی حقیقت یا طلبِ ہدایت کی پیاس کا ثمرہ ہے کہ عام محاورے کے برعکس کنواں پیاسے کے پاس چل کر پہنچا۔ یعنی رسولِ خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے آئے اور حضرت سلمان فارسیؓ کی آپؐ تک رسائی ہوئی اور آپؐ کی خدمت میں طویل عرصہ رہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام نے بھی غور و فکر کے مراحل طے کیے

مَیں نے مشرق' مغرب اور شرقِ اوسط سے تین مثالیں دیں' اب مَیں آپ کو تصویر کا دوسرا رُخ دکھا دینا چاہتا ہوں۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے حوالے سے بھی یہ بات اپنی جگہ پر حقیقت ہے کہ انہوں نے بھی غور و فکر کے مراحل طے کیے۔ سورۃ الشوریٰ (آیت ۵۲) میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے فرمایا:

﴿مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ط﴾

''(اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم!) آپ کو معلوم نہیں تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا

ہوتا ہے' لیکن ہم نے اس (قرآن) کو نُور بنایا ہے' اس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔''

اگرچہ مفسّرین نے اس 'ایمان' کے ضمن میں یہی کچھ کہا ہے کہ اس سے مراد تفصیلی ایمان ہے' کیونکہ اجمالاً ایمان تو ہر نبی کے دل میں موجود ہوتا ہے۔ مَیں اس کی تعبیر یوں کرتا ہوں کہ نبی کے دل میں بِالقُوّۃ ایمان موجود ہوتا ہے' ہاں اس کا بالفعل ظہور آغازِ وحی کے ساتھ ہوتا ہے۔ درحقیقت جو بات یہاں کہی گئی ہے اسی کی طرف اشارہ سورۃ الضحیٰ میں ہے۔ وہاں فرمایا: ﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝٧﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کو اللہ نے تلاشِ حقیقت میں سرگرداں (حقیقت کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے) پایا تو راہ دکھائی۔''

بہرحال یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ انبیاء کرام علیہم السلام غور وفکر کے دور سے نہیں گزرے۔ سوچ بچار کا دور اُن پر بھی آتا رہا اور وہ بھی ان تمام مراحل سے گزارے گئے۔ یہاں تک کہ جب وہ عقل وفطرت کے راستے پر چلتے اور غور وفکر کی منازل طے کرتے ہوئے حقیقت کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے اور دستک دی تب اُن پر دروازہ کھلا۔

حضور ﷺ کے بارے میں تو صراحت موجود ہے کہ آپؐ غارِ حرا میں غور وفکر کیا کرتے تھے۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صِدّیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سب سے پہلی وحی جو رسول اللہ ﷺ پر اُترنی شروع ہوئی وہ سچے خواب تھے' جو آپؐ بحالتِ نیند دیکھتے تھے' چنانچہ جب بھی آپؐ خواب دیکھتے تو وہ صبح کی روشنی کی طرح ظاہر ہو جاتا۔ پھر آپؐ کو تنہائی سے محبت ہونے لگی اور آپؐ غارِ حرا میں کئی کئی روز تک تنہا رہنے لگے۔ وہاں آپؐ تحنّث کیا کرتے۔ شارحینِ حدیث نے اس کے لیے الفاظ استعمال کیے ہیں: كَانَ صفة تعبّدہٖ فی غارِ حراءِ التفکر والاعتبار ''غارِ حرا میں آپؐ کی عبادت کی کیفیت یہ تھی کہ آپؐ غور وفکر اور سوچ بچار کیا کرتے تھے''۔ معلوم ہوا کہ غور وفکر کے مراحل سے حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ بھی گزرے ہیں۔ وحی کے ذریعے ایمان کی گہرائی اور اس کے خاکے میں تفصیلات کا رنگ بھرا گیا۔

یہی معاملہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے۔ ان کے غور وفکر کے مراحل کا بیان سورۃ

الانعام میں آیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝﴾

''اور ہم اس طرح ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کے عجائبات دکھانے لگے' تا کہ وہ خوب یقین کرنے والوں میں ہوجائیں۔ (یعنی) جب رات نے ان کو (پردۂ تاریکی سے) ڈھانپ لیا تو (آسمان میں) ایک ستارے پر نظر پڑی' کہنے لگے یہ میرا پروردگار ہے! پھر جب وہ غائب ہوگیا تو کہنے لگے کہ مجھے غائب ہوجانے والے پسند نہیں۔ پھر جب چاند کو دیکھا کہ چمک رہا ہے' کہنے لگے یہ میرا پروردگار ہے! لیکن جب وہ چھپ گیا تو بول اٹھے کہ اگر میرا پروردگار مجھے سیدھا راستہ نہیں دکھائے گا تو مَیں ان لوگوں میں ہوجاؤں گا جو بھٹک رہے ہیں۔ پھر جب سورج کو دیکھا کہ جگمگا رہا ہے تو کہنے لگے میرا پروردگار یہ ہے یہ سب سے بڑا ہے۔ مگر جب وہ بھی غروب ہوگیا تو کہنے لگے: لوگو جن چیزوں کو تم (اللہ کے) شریک بناتے ہو' مَیں ان سے بےزار ہوں۔ مَیں نے سب سے یکسو ہوکر اپنے آپ کو اسی ذات کی طرف متوجّہ کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور مَیں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔''

اگرچہ ان آیات کی ایک تعبیر اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مظاہرِ فطرت سے مکالمہ اپنی قوم پر اتمامِ حُجّت کے لیے تھا۔ لیکن بعض مفسّرین کی رائے یہ بھی ہے کہ یہ خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فکر کے ارتقاء کے مراحل ہیں جن کا ذکر یہاں ہوا ہے۔

انبیاء کرامؑ کی دعوت اور فلاسفہ کے نظریات کا اصل فرق

تلاشِ حقیقت سے متعلقہ سوالوں کے جوابات کے حوالے سے ہمیں انسانی تاریخ میں دو گروہ ملتے ہیں۔ ایک وہ لوگ جن کو ہم فلسفی اور حکماء کہتے ہیں' جنہوں نے اپنے غور و فکر' سوچ بچار' اپنی منطق اور عقل کے گھوڑے دوڑا کر حقیقت کی پردہ کشائی کی کوشش کی ہے۔ اس غور و فکر کے نتیجے میں انہیں جو محسوس ہوا' اُسے انہوں نے مرتّب کیا۔ اُن کے ان افکار کو ہم فلسفہ کہتے ہیں کہ فلاں حکیم کا یہ فلسفہ ہے' فلاں فلسفی کا یہ نظامِ فکر ہے۔ فلسفی اور حکماء کے جوابات کا واحد ذریعہ غور و فکر ہے۔ انہوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اُن کے پاس غور و فکر کے علاوہ کوئی اور ذریعہ بھی ہے جس سے انہیں یہ حقائق معلوم ہوئے۔ انہوں نے ہمیشہ یہی دعویٰ کیا کہ یہ فکر جو ہم پیش کر رہے ہیں' ہمارے اپنے غور و فکر اور سوچ کا نتیجہ ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ آج تک کسی فلسفی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ غور و فکر سے جو نتائج اُس نے اخذ کیے ہیں وہ صد فی صد حق ہیں۔ خود علّامہ اقبال نے اپنے خطبات کے دیباچے میں یہ الفاظ لکھ دیے ہیں کہ مَیں ہرگز دعویٰ نہیں کرتا کہ جو کچھ مَیں نے ان خطبات میں کہا ہے وہ حرفِ آخر ہے' بلکہ ہمارا کام یہ ہے کہ طالب علمانہ انداز میں غور و فکر جاری رکھیں۔ ہوسکتا ہے جیسے جیسے وقت گزرے اس سے صحیح تر باتیں سامنے آجائیں۔

دوسرا گروہ انبیائے کرام علیہم السلام کا ہے۔ فلاسفہ کے مقابلے میں انبیاء کرامؑ جو دعوت پیش کرتے رہے' اُس کے بارے میں انہوں نے یہ نہیں کہا کہ جو کچھ ہم پیش کر رہے ہیں وہ ہماری سوچ اور ہمارے غور و فکر کا نتیجہ ہے' بلکہ دوٹوک انداز میں یہ کہا کہ اس کا ذریعہ وحی ربّانی ہے' وحی کے ذریعے ہمیں ان حقائق تک رسائی ہوئی ہے۔ پھر یہ کہ انہوں نے صاف اعلان کیا کہ یہ دعوت صد فی صد حق ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کے آغاز ہی میں لوگوں پر واضح کر دیا گیا: ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ﴾ (البقرۃ:۲) ''یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں (یہ کُل کا کُل حق ہے)۔'' اسی طرح سورۂ مریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول نقل ہوا ہے۔ وہ اپنے والد سے کہتے ہیں: ابّا جان! آپ کو میری پیروی کرنی ہوگی۔

﴿يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿٤٣﴾﴾

''ابّا جان! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا' پس میری پیروی کریں' مَیں آپ کی سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کروں گا۔''

بظاہر یہ بات غیر منطقی اور غیر معقول دکھائی دیتی ہے کہ بیٹا باپ سے پیروی کا تقاضا کرے۔ اس لیے کہ دنیا میں باپ زندگی کے مختلف مراحل سے گزرا ہوا ہوتا ہے' اس کا تجربہ زیادہ ہوتا ہے اور بیٹے کا تجربہ کم ہوتا ہے۔ لہٰذا بیٹے کا باپ سے اپنی پیروی کا مطالبہ کرنا بظاہر عجیب لگتا ہے' لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام علم وحی کی بنیاد پر والد سے پیروی کا مطالبہ کر رہے تھے' اور وہ انہی کے پاس تھا' باپ کو حاصل نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ انبیاء کرام علیہم السلام جو دعوت پیش کرتے ہیں وہ وحی کی بنیاد پر کرتے ہیں اور پھر اس دعوے کے ساتھ کرتے ہیں کہ یہ حق ہے۔ اصطلاحاً ان کی دعوت کو برحق ماننے کا نام ایمان ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام عقل وفطرت کے منافی بات منوانا چاہتا ہے اور ایمانی حقائق کے پیچھے کوئی عقلی اور منطقی بنیاد نہیں ہے۔ بلکہ وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ تو تمہاری فطرت کی آواز ہے' یہ تمام حقائق تمہارے اندر موجود ہیں' لیکن خوابیدہ (dormant) ہیں' وحی نے آ کر صرف ان کو جگایا ہے' وحی کے ذریعے ان میں یقین کی گہرائی اور گیرائی پیدا ہوئی ہے۔

اسلام کا تصوّرِ کائنات وانسان

اب مَیں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ وہ کیا حقائق ہیں جن کا انکشاف وحی کے ذریعے انبیاء کرام علیہم السلام پر ہوا ہے۔ ان حقائق کو اگر ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو واضح ہوگا کہ یہ دراصل اسلام کا تصوّرِ کائنات وانسان ہے' اسلامی نظامِ حیات کی نظریاتی اساس ہے' ایک فکر وفلسفہ ہے۔ اسلامی نظامِ حیات بالفعل وجود میں آنے کا احساس تب ہی ہوگا جب یہ فکری اساس تعمیر ہوگی۔ اگر یہ اساس ہی تعمیر نہیں ہوتی تو اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ اسلام کا نظامِ حیات اپنی حقیقی صورت میں دنیا میں دوبارہ قائم ہو سکے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ ان حقائق کے ضمن میں جو چیزیں مَیں آپ کے سامنے بیان

کروں گا' وہ اگرچہ سب کے سب قرآن مجید کے حقائق ہیں' تاہم ان میں سے بعض حقائق کو قرآن نے جلی انداز میں بیان کیا ہے اور بعض حقائق قرآن میں اشارات کی شکل میں آئے ہیں۔ ان میں جو صریح و جلی حقائق ہیں انہی کے مجموعے کا نام ایمان ہے۔ ان حقائق کی ضرورت ہر عام و خاص کو ہے۔ ایک ذہین شخص بھی اس کی احتیاج رکھتا ہے اور ایک عام انسان بھی۔ لہٰذا یہ حقائق جو ایمان کے بنیادی اجزاء ہیں' عام انسانی فہم کے قریب تر ہیں اور ان کو تکرار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ اسلام کا تصوّرِ کائنات و انسان پوری طرح تب ہی واضح ہوگا جب ان صریح اور جلی حقائق کے ساتھ مخفی حقائق کو بھی جمع کرلیا جائے۔ پس ان جلی اور خفی حقائق کو مَیں ایک ترتیب کے ساتھ آپ کے سامنے بیان کر رہا ہوں۔

کائنات اور خالقِ کائنات کا تعلق

پہلی بات یہ ہے کہ یہ کُل کائنات' یہ سلسلۂ کون و مکان' یہ سلسلۂ موجودات جو تا حدِّ نگاہ ہمارے سامنے ہے' حادث اور فانی ہے۔ یہ ہمیشہ سے نہیں ہے اور نہ ہی ہمیشہ رہے گا۔ ایک اللہ ہی کی ہستی ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اور اس ہستی کے ساتھ کائنات کی نسبت خالق اور مخلوق کی ہے۔ اللہ نے اسے بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ صرف اس کا خالق ہے بلکہ وہی اس کی صورت گری کرنے والا اور وہی منتظم ہے۔

اللہ کی یہ تخلیق بالحق اور بامقصد ہے۔ یہ کوئی رام کی لیلا نہیں ہے' نہ دیوتاؤں کی تماشگاہ یا تھیٹر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ اگر ہمارا ارادہ ہوتا کہ کوئی کھیل تماشا کریں تو ہم اپنے پاس سے کوئی بندوبست کر لیتے۔ سورۃ الانبیاء میں دوٹوک انداز میں فرما دیا گیا: ﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝۱۶﴾ ''ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو ان کے درمیان ہے' کھیل تماشے کے لیے نہیں بنایا''۔ اسی طرح سورۂ آلِ عمران میں فرمایا: ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۱۹۱﴾ ''اے ہمارے رب! تُو نے یہ (کارخانۂ قدرت) بے مقصد نہیں پیدا کیا۔ تُو پاک ہے' پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔''

یہ کائنات ایک خاص وقت تک کے لیے ہے' جب اس کا وقت پورا ہو جائے گا تو فنا ہو جائے گی' جبکہ اللہ کی ہستی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اللہ کا کوئی مدِ مقابل' کوئی ہم سر اور ہم پلّہ نہیں۔ انسان خیر و بھلائی اور اعلیٰ سے اعلیٰ خوبی کا جو تصوّر کر سکتا ہے وہ اللہ کی ذات میں بتمام و کمال موجود ہے۔ مثلاً قدرت ایک قدر ہے' تو اللہ تعالیٰ ''عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ'' ہے۔ علم ایک اعلیٰ قدر ہے تو اللہ تعالیٰ ''بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ'' ہے۔ زندگی ایک اعلیٰ شے ہے' تو وہ ''اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ'' ہے' اور اس کی حیات اتنی مکمل ہے کہ ''لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ'' (نہ تو اُسے نیند آتی ہے اور نہ اُونگھ)۔

کائنات اور خالقِ کائنات کے تعلق سے ان حقائق کو تسلیم کرنے کا نام ایمان باللہ ہے اور یہی ایمان سارے ایمانیات کی اصل اساس اور جڑ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایمانِ مجمل کا ذکر آتا ہے تو اس میں سوائے ایمان باللہ کے اور کسی شے کا ذکر نہیں ہوتا' صرف اللہ اور اُس کی صفات کا ذکر ہوتا ہے۔ ایمانِ مجمل میں ہم میں سے ہر شخص یہ اقرار و تصدیق کرتا ہے کہ:

((آمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ وَقَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَ تَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ))

''مَیں ایمان لایا اللہ پر جیسے کہ وہ ظاہر ہے اپنے اسماء و صفات سے۔ اور مَیں نے اُس کے تمام احکام قبول کیے۔ مَیں اس کا زبانی اقرار کر رہا ہوں اور اس پر دل سے یقین رکھتا ہوں۔''

اگر اللہ تعالیٰ پر ایمان ایک حقیقتِ کُلّی بن کر آپ کے دل میں جاگزیں ہو گیا ہے' اللہ کی ہستی' اُس کے حاضر و ناظر ہونے' اُس کے ''عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر'' اور ''بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْم'' ہونے اور اُس کے ہمیشہ ساتھ ہونے کا یقین اگر دل میں موجود ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان باللہ حقیقتاً موجود ہے۔ اور اگر یہ یقین نہیں تو پھر یہ محض ایک عقیدہ ہے' ایک dogma ہے' ایک موروثی خیال ہے' جو آپ کو وراثتاً منتقل ہو گیا ہے۔

انسان کی تخلیق کے دو مراحل

دوسری بات یہ ہے کہ کائنات کی تخلیق کا نقطۂ کمال انسان ہے۔ یوں تو یہ آسمان' زمین' ستارے' سیارے' فضائیں' پہاڑ سب اللہ کی تخلیق ہیں اور یہ مخلوقات اس کی نشانیاں اور اس کی عظمت کے مظاہر ہیں' لیکن اللہ تعالیٰ نے تین وجود ایسے پیدا کیے ہیں جو مکلّف ہیں۔ ایک فرشتے ہیں جو نوریٔ الاصل ہیں' دوسرے جِنّات ہیں جن کا مادۂ تخلیق آگ ہے' اور تیسری مخلوق انسان ہے جو سلسلۂ ارضی کی مخلوقات (نباتاتی و حیواناتی سلسلۂ حیات) کی چوٹی پر فائز ہے۔ انسان کے شرف و امتیاز اور بلند مقام کا سبب کیا ہے؟ درحقیقت انسان کا وجود دو چیزوں سے مرکب ہے۔ ایک اس کا جسدِ حیوانی یا جسدِ مادّی ہے جو خاکیٔ الاصل ہے۔ یہ اسی زمین سے بنا ہے۔ نظریۂ ارتقاء سے قطع نظر' قرآن اور سائنس دونوں اس نکتہ پر متفق ہیں کہ انسان کی ابتدا قشرِ ارض (crust of the earth) سے ہوئی ہے۔ دوسرا انسان کا روحانی وجود ہے جو خاکیٔ الاصل نہیں' بلکہ نوریٔ الاصل ہے اور فرشتوں سے بھی بلند تر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ آدم کے وقت فرشتوں سے فرمایا: ﴿فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ ﴿٧٢﴾﴾ (ص) ''تو جب مَیں اس کی نوک پلک سنوار لوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں' تو اس کے سامنے سجدے میں گر پڑنا''۔ معلوم ہوا کہ انسان اور حیوانات میں فرق صرف کمیت کا نہیں بلکہ اصل فرق نوعیت کا ہے۔ حیوانات صرف اس خاکی اور زمینی وجود پر مشتمل ہیں اور ان کا کُل وجود یہی ہے' جبکہ انسان جسدِ حیوانی کے ساتھ روحانی وجود بھی رکھتا ہے۔ شیخ سعدیؒ کہتے ہیں ؎

آدمی زادہ طرفہ معجون است
از فرشتہ سرشتہ وز حیوان

یعنی یہ آدمی زادہ عجیب معجونِ مرکب ہے۔ اس میں فرشتہ بھی ہے اور حیوان بھی۔ فرشتہ اس معنی میں کہ جس طرح فرشتے نوریٔ الاصل ہیں ہماری ارواح بھی نوریٔ الاصل ہیں' اور حیوان اس اعتبار سے کہ جانوروں کی طرح ہمارا وجودِ حیوانی بھی اسی خاک سے بنا ہے۔ انسان میں یہ دونوں چیزیں آکر جمع ہوگئی ہیں۔ یہی اس کے شرف و امتیاز کا سبب ہے اور

اسی بنا پر اس کو خلافت سے سرفراز فرمایا گیا۔ سورۂ صٓ میں فرمایا گیا: ﴿خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ (آیت ۷۵) ''جسے مَیں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا۔''

انسان کی تخلیق میں عالَمِ امر اور عالَمِ خلق دونوں جمع ہو گئے۔ اسی لیے صوفیائے کرام انسان کو ''عالَمِ اصغر'' کہتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر انسان کی تخلیق دو مراحل میں ہوئی۔ پہلا مرحلہ وہ ہے جس میں ارواحِ انسانیہ کو پیدا کیا گیا اور یہ ارواح ''جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَةٌ'' کی شکل میں تھیں۔ اُن میں باپ بیٹے اور پوتے پڑپوتے کی کوئی نسبت نہیں تھی۔ یہ تمام ارواح بیک وقت وجود میں آئیں۔ اسی عالَمِ امر میں اللہ تعالیٰ نے تمام ارواحِ انسانیہ سے اپنی بندگی کا عہد لیا۔ اللہ نے پوچھا: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ ''کیا مَیں تمہارا ربّ نہیں ہوں'' ﴿قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا﴾ (الاعراف: ۱۷۲) ''سب نے کہا: کیوں نہیں، ہم گواہی دیتے ہیں (کہ اے اللہ تُو ہی ہمارا رب ہے)۔'' انسان کی تخلیق کا دوسرا مرحلہ عالَمِ خلق میں اُس کے جسدِ حیوانی کی تخلیق ہے۔ اس مرحلے میں تمام انسان یکبارگی پیدا نہیں کیے گئے، بلکہ اُن کی پیدائش میں زمانی فصل چلا آ رہا ہے۔ ہمارے جدِّ امجد حضرت آدم علیہ السلام شاید آج سے دس ہزار سال پہلے دنیا میں آ گئے تھے۔ اس کے بعد اب تک اربوں انسان پیدا ہوئے اور مر گئے۔ آج ہم اس دنیا میں ہیں، کل کوئی اور ہوگا۔

انسان کی تخلیقِ اوّل کے بارے میں اشارہ اس آیت میں ملتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ روزِ محشر اپنے دربار میں کھڑے تمام لوگوں سے یہ فرمائے گا: ﴿لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿۴۸﴾﴾ (الکھف) ''جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا (اسی طرح آج) تم ہمارے سامنے آئے ہو، لیکن تم نے تو یہ خیال کر رکھا تھا کہ ہم نے تمہارے لیے (قیامت کا) کوئی وقت مقرر ہی نہیں کیا''۔ پہلی تخلیق کے مرحلے پر اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو بیک وقت پیدا کیا اور میدانِ حشر میں بھی اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو اپنے سامنے حاضر کر دے گا۔ بہر حال یہ چیزیں وہ ہیں جو مخفی حقائق ہیں۔ قرآن مجید میں ان کے ضمن میں صرف اشارات آئے ہیں۔

انسانی زندگی کی حقیقت

تیسری چیز جو قرآن مجید کے ہر صفحے پر نمایاں کی گئی ہے، وہ انسانی زندگی کی حقیقت سے متعلق ہے۔ وہ لوگ جو صرف حواس کے دائرے تک اپنے آپ کو محدود رکھیں وہ تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ پیدائش سے پہلے بھی ہمارا کوئی وجود تھا اور نہ یہ مان سکتے ہیں کہ موت کے بعد بھی ہمارے وجود کا تسلسل برقرار رہے گا۔ ان لوگوں کے نزدیک لامحالہ زندگی پیدائش اور موت کا درمیانی وقفہ قرار پائے گی۔ یہی چالیس، پچاس، ساٹھ سالہ عرصہ کُل زندگی شمار ہوگا۔ بہادر شاہ ظفر سے منسوب یہ شعر اسی زندگی سے متعلق ہے ؎

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں!

لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی صرف پیدائش سے موت تک کے وقفے کا نام نہیں ہے۔ بقولِ اقبال: ؎

تُو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی!

انسان جو تخلیق کا نقطۂ عروج ہے، اس کی کُل زندگی یہی نہیں ہے، بلکہ اس کی زندگی بہت طویل ہے۔ موت معدوم ہوجانے کا نام نہیں، بلکہ ایک عالَم سے دوسرے عالَم میں منتقل ہونے کی کیفیت ہے۔ گویا بقولِ میرؔ: ؎

مرگ اِک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر!

موت تو زندگی کا تسلسل ہے۔ انسان کی آنکھ یہاں بند ہوتی ہے تو کسی اور عالَم میں کُھل جاتی ہے ؎

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے!

دُنیوی زندگی انسان کی طویل زندگی کا ایک مختصر سا حصّہ ہے۔ موت کا وقفہ ڈال کر

درحقیقت زندگی کے اس چھوٹے سے حصے کو علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ یہ وقفہ کیوں ڈالا گیا ہے' اس کا جواب انبیاء کرام علیہم السلام نے دیا ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ انسان کی آزمائش کرنا چاہتا ہے۔ یہ زندگی ایک امتحان اور ایک ٹیسٹ ہے۔ قرآن عزیز کہتا ہے:

﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط﴾

(الملک:۲)

''اُس (اللہ) نے موت اور زندگی (کے سلسلہ) کو اس لیے پیدا کیا تا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں کون اچھے اعمال کرتا ہے۔''

اسی مضمون کو علّامہ اقبال نے شعری پیرایہ میں یوں بیان کیا ہے: ؎

قلزمِ ہستی سے تُو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

اس امتحان کا نتیجہ موت کے بعد نکلے گا' جب انسان کو دوبارہ اُٹھایا جائے گا اور اس کا حساب کتاب ہوگا۔ اس امتحانی وقفے میں اُس نے جو کمایا' جو کھایا' جو زبان سے کہا' جو آنکھ سے دیکھا' ہر شے کا پورا پورا حساب ہوگا۔ انسان کا ہر ایک چھوٹا بڑا عمل اُس کے سامنے آجائے گا۔ کوئی بہت بڑا (giant) کمپیوٹر ہوگا کہ ایک بٹن دبے گا اور آپ کی پوری زندگی کی رِیل آپ کے سامنے آجائے گی' جسے دیکھ کر مجرمین حیران و سرگرداں ہوجائیں گے۔ قرآن کہتا ہے:

﴿وَوُضِعَ الْکِتٰبُ فَتَرَی الْمُجْرِمِیْنَ مُشْفِقِیْنَ مِمَّا فِیْہِ وَیَقُوْلُوْنَ یٰوَیْلَتَنَا مَالِ ھٰذَا الْکِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَۃً وَّلَا کَبِیْرَۃً اِلَّآ اَحْصٰىھَا ج وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ط وَلَا یَظْلِمُ رَبُّکَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾﴾ (الکھف)

''اور (اعمال کی) کتاب کھول کر رکھی جائے گی' تو تم گناہ گاروں کو دیکھو گے کہ جو کچھ اس میں (لکھا) ہوگا اس سے ڈر رہے ہوں گے' اور کہیں گے: ہائے ہماری شامت' یہ کیسی کتاب ہے کہ نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے نہ بڑی کو (کوئی بات بھی نہیں) مگر اسے لکھ رکھا ہے۔ اور جو عمل انہوں نے کیے ہوں گے سب کو حاضر

پائیں گے۔ اور تمہارا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔''

اور کہا جائے گا:

﴿اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝۱۴﴾ (بنی اسراءیل)

''اپنی کتاب پڑھ لے۔ تُو آج اپنا آپ ہی محاسب کافی ہے۔''

کوئی بھی اپنے اس اعمال نامے کو جھٹلا نہ سکے گا۔ اس حساب کتاب کے نتیجے پر ہی انسان کی ابدی زندگی کی کامیابی یا ناکامی کا دارومدار ہے۔ یا تو انسان کو دائمی جنّت ملے گی یا پھر اُسے آتشِ جہنّم کا ایندھن بنا دیا جائے گا۔

اسلامی انقلاب کی فکری اساس

زندگی کے متعلق ان حقائق پر گہرا یقین ہونا ضروری ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اس زندگی کو محض عارضی سفر سمجھے' اور حدیث کے مطابق اس حقیقت کو دل میں جاگزیں کر لے کہ مَیں تو یہاں راہ چلتا مسافر ہوں۔ یہ دنیا میرا گھر نہیں ہے' نہ یہ دل لگانے کی جگہ ہے' بلکہ یہ امتحان گاہ ہے۔ یہاں تو مجھے جانچا جا رہا ہے۔ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے اور کامیابی و ناکامی اور فیصلے کا دن تو قیامت کا دن ہے۔ یہاں کی ہار معمولی اور یہاں کی جیت عارضی ہے' جب کہ وہاں کی ہار جیت مستقل ہے۔ یہ زندگی تو گویا تین گھنٹے کا ایک ڈرامہ ہے' جس میں کسی کو فقیر کا کردار مل گیا' لہٰذا اس کے بدن پر چیتھڑے ہیں اور کسی کو بادشاہ کا کردار ملا ہے اور وہ بڑا اعلیٰ لباس زیب تن کیے ہوئے ہے۔ تین گھنٹے کے بعد نہ وہ بادشاہ بادشاہ ہے' نہ فقیر فقیر ہے۔ دنیا کی کیفیات' غربت و امارت' عہدے اور مناصب کا یہی حال ہے۔ یہ سب دھوکے کا سامان ہے۔ اسی لیے قرآن مجید کہتا ہے:

﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝۱۸۵﴾ (آل عمران)

''دنیا کی زندگی تو سوائے دھوکے کے سامان کے اور کچھ نہیں۔''

یہ یقین گویا اس نظامِ حیات کی فکری اساس ہے جس کو ہم قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جب تک یہ حقیقت ہمارے رگ و پے میں سرایت نہ کر جائے' جب تک یہ ایک زندہ یقین کی صورت اختیار نہ کر لے' تب تک وہ قوت پیدا ہو ہی نہیں سکتی جو اسلامی انقلاب برپا کرنے

کے لیے لازمی ہے اور نہ کبھی انقلاب آسکے گا۔ البتہ یہ بات بھی ذہن میں ضرور رکھیے' ورنہ مغالطہ ہو جائے گا' کہ یقین کی یہ گہرائی اور گیرائی تمام کے تمام لوگوں میں نہ تو پہلے کبھی ہوئی ہے اور نہ آئندہ کبھی ہوگی۔ تمام انسانوں میں یہ یقین تو صرف قیامت کے دن ہی پیدا ہوگا' جب سب حقائق آنکھوں کے سامنے آجائیں گے۔ لیکن اسلامی نظام کے بالفعل نفاذ کے لیے ضروری ہوگا کہ کسی معاشرے میں ایک مؤثر اقلیت اس یقین سے سرشار ہو جائے اور اپنے یقین کی گہرائی کی بنا پر اسلام کی خاطر ہر قسم کی قربانی اور ایثار کے لیے تیار ہو جائے۔ (واضح رہے کہ مَیں ''اکثریت'' کا لفظ استعمال نہیں کر رہا' اس لیے کہ میرا دعویٰ ہے کہ اکثریت کی کیفیت کبھی یہ نہیں ہو سکتی۔) جب تک اس قسم کی مؤثر اقلیت پیدا نہ ہو جائے جو ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾﴾ (الانعام) ''بے شک میری نماز' میری عبادت' میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ ربّ العالمین ہی کے لیے ہے'' کو اپنی زندگی کا مقصد نہ بنا لے' اور جب تک یہ فکری اساس ان کے دلوں میں پختہ نہ ہو جائے عملی طور پر اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ اسلامی تحریک کی جِدّوجُہد نتیجہ خیز اور کامیاب ہو جائے۔ ہم تمنّا تو کرتے رہیں گے کہ اسلام آجائے' اسلام کا نظامِ حیات قائم ہو جائے' لیکن تمنّا سے اسلام نہیں آئے گا۔ ہم مقالے پڑھتے رہیں گے' تقریریں کرتے رہیں گے کہ یہ اسلام ہے اور یہ اسلام نہیں ہے' لیکن اس سے بالفعل اسلامی نظام کی عمارت کی تعمیر ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوگا۔

محاسبۂ اُخروی کی بنیاد: پانچ چیزیں

اگلی بات بہت اہم ہے۔ اگر ہماری دنیا کی زندگی امتحان ہے تو امتحان تو کچھ سکھا کر لیا جاتا ہے یا کچھ دے کر آدمی کو جانچا جاتا ہے۔ آپ کو اپنے بچے کے رجحان کا اندازہ کرنا ہو تو آپ اُسے دس روپے دیں گے اور پھر دیکھیں گے کہ وہ کیا کرتا ہے۔ آیا وہ یہ رقم لے کر باہر جا کر چاٹ کھا لیتا ہے یا کوئی کتاب خریدتا ہے یا پھر کوئی کھلونا خرید لاتا ہے۔ گویا آپ اسے کچھ دے کر جانچیں گے۔ آپ کسی کو کچھ اختیار دیجیے' پھر پتا چلے گا کہ اس کا رجحان کیا ہے' خیر کی طرف ہے یا شر کی طرف! آپ کچھ نہ کچھ چوائس دیں گے تو پھر ہی کسی کی

آزمائش کر سکیں گے۔ ہمیں جو یہاں امتحان گاہ میں ڈالا گیا ہے تو سوال یہ ہے کہ ہمیں کیا سکھایا گیا اور کیا دیا گیا' جس کی بنیاد پر ہماری آزمائش کی جارہی ہے؟ ایمان بالآخرۃ کے ایک اہم نکتے کو سمجھنے کے لیے یہ بہت اہم سوال ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس امتحان گاہ میں کئی چیزیں دے کر بھیجا ہے۔

سب سے پہلی شے جو اللہ نے ہمیں دی' وہ سماعت و بصارت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف آیات میں اس کا تذکرہ فرمایا:

﴿قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ﴾

(الملک:۲۳)

''کہہ دیجیے اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور تمہارے لیے کان' آنکھ اور دل بنائے۔''

﴿وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ﴾ (المؤمنون:۷۸)

''اور وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے کان' آنکھیں اور دل بنائے ہیں۔''

سماعت اور بصارت ہمارا پہلا اثاثہ ہے۔ یہ اللہ کی دی ہوئی وہ faculties ہیں جن کی بنیاد پر ہم مسئول اور ذمہ دار ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں یہی بات بایں الفاظ کہی گئی ہے:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ﴿۳۶﴾﴾

''اور (اے بندے!) جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ۔ یقیناً کان' آنکھ اور دل ان سب (جوارح) کے بارے میں ضرور باز پُرس ہوگی۔''

دوسری شے جو اللہ نے ہمیں دی وہ عقل ہے۔ اللہ نے ہم میں سے ہر شخص کے دماغ میں ایک کمپیوٹر نصب کیا ہے۔ اس میں جو بھی sense data فیڈ کیا جارہا ہے اُس کو آپ process کر کے اُس سے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ علم کے ذرائع میں تجربہ اور عقل یہ دو چیزیں تو وہ ہیں جو ہر شخص کو معلوم ہیں اور ہر انسان کے پاس ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی

کے پاس کم اور کسی کے پاس زیادہ ہیں۔

تیسری چیز جو اللہ نے ہمیں عطا فرمائی' وہ نیکی اور بدی کا شعور ہے۔ اس کے لیے انسان کو محنت کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر انسان اپنی فطرت کی بنیاد پر یہ جانتا ہے کہ کیا خیر ہے اور کیا شر ہے' کیا بھلائی ہے اور کیا بُرائی' کیا نیکی ہے اور کیا بدی! اس کو پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ خداداد صلاحیت ہے' جو ہر ایک میں موجود ہے۔ چنانچہ سورۃ الشّمس میں فرمایا:

﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝٧ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝٨﴾ (الشمس)

''اور قسم ہے نفسِ انسانی کی اور جیسا کہ اُس کے اعضاء کو برابر کیا۔ پھر اس کو بدکاری (سے بچنے) اور پرہیزگاری (اختیار کرنے) کی سمجھ دی۔''

یعنی نفسِ انسانی جو اللہ نے بنایا اور تیار کیا' اللہ نے اس کے اندر نیکی اور بدی کا شعور بھی پیدا کر دیا۔ یہ شعور آپ کو حیوانات میں نہیں ملے گا۔ اسی شعور کا ایک مظہر انسان میں اخلاقی حس ہے' جو بُرائی پر روک ٹوک کرتی ہے۔ یہ تین چیزیں (یعنی ہمارے sense organs جن سے ہم معلومات اخذ کرتے ہیں' ہمارے دماغ کا کمپیوٹر جس سے ہم اس تمام sense data کو process کرتے ہیں' اور خیر و شر کا امتیاز اور اس کا شعور) ہمارے نفس میں ودیعت شدہ ہیں۔ یہ ہمارے حیوانی وجود کے عناصر ہیں۔

ان کے علاوہ جو شے ہمیں دی گئی ہے وہ روح ہے' جو ہمارے اندر پھونکی گئی ہے اور جس کی نسبت ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ...﴾ (السجدة:٩)

''پھر اللہ نے اس (انسان) کی نوک پلک درست کی اور اس میں اپنی روح میں سے پھونکا.....''

اس میں دو چیزیں موجود ہیں' ایک اپنے رب کی معرفت اور دوسرے اپنے رب کی انتہائی گہری محبّت۔ تو مجموعی طور پر یہ پانچ چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے دے کر ہمیں دنیا میں بھیجا ہے۔

اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے' وہ نہایت اہم ہے۔ یعنی اگر کوئی نبی اور رسول نہ آتا' کوئی کتاب بھی نازل نہ ہوتی' کوئی وحی بھی نہ اُترتی' تب بھی ان چیزوں کی بنیاد پر انسان مکلّف اور جواب دہ تھا' اس لیے کہ ان پانچ چیزوں کی مدد سے اسے ہر سوال کا جواب مل سکتا ہے۔ چنانچہ دنیا میں بہت سے لوگ ایسے رہے ہیں جن تک کسی نبی کی دعوت نہیں پہنچی اور ہوسکتا ہے کہ آج بھی سائبیریا کے دور دراز گوشوں میں کہیں ایسے لوگ موجود ہوں جو یہ جانتے بھی نہ ہوں کہ نبی آخر الزماں ﷺ دنیا میں تشریف لائے تھے' حضرت محمد ﷺ نامی جلیل القدر' رفیع الشان شخصیت دنیا میں گزری ہے' پھر بھی یہ لوگ اللہ کے سامنے جوابدہ ہوں گے اور ان کا حساب کتاب ہوگا۔ اچھی طرح جان لیجیے' جواب دہی کی اصل بنیاد متذکرہ بالا پانچ چیزیں ہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے ہر بندے پر اصل حُجّت ہیں۔ البتہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مظہر ہے کہ اس نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے ہر دور میں اپنے نبی اور رسول بھیجے اور اُن پر اپنا کلام نازل فرمایا۔ اللہ کے یہ منتخب بندے سیرت و کردار کے نہایت اعلیٰ نمونے تھے۔ اُن کا دامنِ کردار بے داغ اور اُن کی زندگیاں کُھلی کتاب کی مانند تھیں۔ یہ عالی مرتبت ہستیاں اعلانِ نبوت سے پہلے ہی اپنے معاشرے کے اندر چمکتی دمکتی مشعلیں تھیں۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کی مدد سے ایمانی حقائق کو لوگوں پر منکشف کر دیا۔

قرآن کریم میں موجود جلی اور مخفی حقیقتوں کا یقینِ کامل

مَیں نے آپ کے سامنے جو کچھ بیان کیا' اس میں کچھ تو جلی اور واضح چیزیں ہیں جو ہر فرد کے ذہن کی گرفت میں آسکتی ہیں اور جو ہر شخص کے لیے لازمی بھی ہیں۔ یہ چیزیں آپ کو قرآن کے ہر صفحے پر مل جائیں گی' جبکہ کچھ چیزیں اشارات کی صورت میں آئی ہیں۔

وہ چیزیں جو ہر شخص کے جاننے کی ہیں اور قرآن میں جلی انداز سے آئی ہیں' ان میں سے پہلی شے ایمان باللہ ہے۔ ایمان باللہ ہی انسان میں نیکی کا جذبۂ محرکہ (motivating force) پیدا کرنے والی اصل شے ہے۔ دل میں ایمان موجود ہو تو آدمی اللہ کی محبت کی بنا پر بھلائی کے کام کرتا ہے اور اللہ کی رضا جوئی اور خوشنودی کے لیے

بدی سے رکتا ہے۔ وہ ہر دم ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں میرا اللہ مجھ سے ناراض نہ ہو جائے۔ ایمان باللہ گویا مثبت قوتِ محرکہ ہے۔ دوسری شے ایمان بالآخرۃ ہے۔ ایمان بالآخرۃ بھی قوتِ محرکہ ہے' لیکن یہ ایک طرح کا کوڑا ہے۔ یہ یقین کہ قیامت کے دن حساب کتاب ہوگا' جواب دہی ہوگی' میرا ایک ایک عمل میرے سامنے آجائے گا' یہ دراصل انسان کے اندر اُسے شر سے بچانے اور خیر کی طرف راغب کرنے کی ایک منفی قوت ہے' اگرچہ اس کا بھی ایک مثبت پہلو ہے۔ بہرحال یہ دونوں چیزیں اتنی اہم ہیں کہ ہر فرد کی ضرورت ہے۔ شیخ احمد سرہندیؒ نے انہی کو مبدأ و معاد سے تعبیر کیا ہے۔ تیسری چیز ایمان بالرسالت ہے۔ ایمان بالملائکہ' ایمان بالکتاب اور ایمان بالرسل یہ تینوں ایمان بالرسالت کے اجزاء ہیں۔

البتہ بعض حقائق جو ذرا مخفی ہیں' قرآن حکیم میں اشارات کی صورت میں آئے ہیں۔ مثلاً اس دنیا میں آنے سے پہلے بھی ہماری ایک زندگی ہے' قرآن نے اس کو زیادہ نمایاں نہیں کیا' صرف ایک دو مقامات پر اشارے دیے ہیں۔ مثلاً قرآن حکیم میں اہلِ جہنّم کی فریاد نقل ہوئی ہے:

﴿قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿١١﴾﴾ (المؤمن)

''وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! تُو نے ہمیں دو مرتبہ مارا اور دو مرتبہ زندہ کیا' پس ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں' تو کیا اب یہاں سے نکلنے کا بھی کوئی راستہ ہے؟''

اللہ تعالیٰ نے عالَمِ ارواح میں ہماری روحوں کو پیدا کیا۔ اس کے بعد ارواح کو گویا کسی کولڈ سٹوریج میں رکھ دیا۔ یہ گویا اماتتِ اولیٰ ہے۔ پھر انسان کا یہاں احیاء ہوا' جب اس کے جسدِ خاکی کے ساتھ جو رحمِ مادر میں تیار ہوا' اس کی روح کو شامل کیا گیا۔ یہ احیائے اولیٰ ہے۔ پھر اس پر موت واقع ہوگی جب انسان اس دنیا کو چھوڑ جائے گا' اور یہ ''اماتتِ ثانیہ'' ہوگا' جس کے بعد انسان کا زمین والا حصّہ زمین میں رہ جائے گا اور جو آسمان سے آیا تھا وہ

آسمان کی طرف چلا جائے گا۔ قرآن حکیم میں فرمایا گیا: ﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۝۵۵﴾ (طٰہٰ) ''اسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور اسی سے دوسری دفعہ نکالیں گے''۔ تا آنکہ جب بعث بعد الموت کا مرحلہ آجائے گا تو انسان کو زمین سے نکالا جائے گا۔ یہ گویا دو اماتتیں اور دو احیاء ہو گئے جو سورۃ المؤمن کی مذکورہ بالا آیت میں بیان ہوئے۔

اسی طرح اس بات کی طرف بھی صرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ انسان کی حقیقت کیا ہے اور اُس کا اصل وجود کون سا ہے؟ انسان کا اصل وجود یہ جسدِ حیوانی نہیں بلکہ کچھ اور (روحِ ربانی) ہے۔ اللہ تعالیٰ اور روحِ انسانی کے درمیان اتنا گہرا ربط و تعلق ہے کہ جب انسان اللہ کو بھول جاتا ہے تو گویا اپنے وجود کو بھی بھلا دیتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ﴾ (الحشر:۱۹) ''ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے ان کو اپنے آپ سے غافل کر دیا''۔ یعنی اللہ کو بھلانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنی حقیقت کو فراموش کر بیٹھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھنے کے بجائے' بس زیادہ ارتقاء یافتہ حیوان سمجھ لیا۔ یہ دراصل اللہ کو بھلانے کی نقد سزا ہے جو انہیں اسی دُنیا میں مل رہی ہے۔ یہاں ''اَنْفُسَهُمْ'' (اپنے آپ) سے مراد وجودِ حیوانی نہیں ہو سکتا' اس لیے کہ کوئی بھی شخص اپنے حیوانی وجود کو نہیں بھولتا۔ اس کا نفع و نقصان اور اس کی تکلیف و راحت کا خیال تو اُسے ہر دم رہتا ہے۔ اسی کو تو خوش رکھنے کی خاطر وہ حلال و حرام کی بھی پروا نہیں کرتا۔ انسان اپنے جس وجود سے غافل ہو جاتا ہے وہ دراصل اُس کا روحانی وجود ہے' اور یہی اصل وجود ہے۔ اُپنشد کا ایک بہت خوبصورت جملہ ہے:

"Man in his ignorance identifies himself with the material sheeths which encompass his real self."

''انسان اپنی نادانی اور جہالت میں اپنے آپ کو ان مادّی غلافوں سے تعبیر کر بیٹھتا ہے جن کے اندر اُس کی اصل حقیقت مضمر اور پنہاں ہے۔''

انسان کی اصل انا' اس کی اصل خودی اس کا وہ روحانی وجود ہے جو حقیقت میں مسجودِ ملائک بنا' نہ کہ یہ حیوانِ انسان۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿٧٢﴾﴾ (ص)

''پھر جب مَیں اس کو درست کرلوں اور اُس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا۔''

افسوس کہ انسان اپنے اصل روحانی وجود کو بھول گیا۔ جب تک اسلامی نظامِ حیات کی یہ فکری اساس ہمارے اندر مستحکم نہ ہو جائے' حقیقتِ کائنات کا یہ پورا تصوّر دل و دماغ میں راسخ نہ ہو جائے' تب تک اسلامی نظامِ حیات کا نفاذ یا اسلامی انقلاب' یہ صرف ایک آرزو اور تمنّا ہی رہے گی۔ اسلامی نظام کے بالفعل نفاذ کے لیے پہلا کام یہ ہے کہ فکرِ اسلامی کی تشکیلِ نو ہو اور ایمان ایک روشن یقین (burning faith) کی شکل اختیار کرے' اگلا قدم پھر ہی اٹھ سکے گا۔

یقینِ قلبی کا ذریعہ: قرآن مجید

مَیں نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کی تفصیلات میں تو کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے' لیکن کم از کم اس کی واضح اور کھلی کھلی باتیں تو ہر مسلمان مانتا ہے' البتہ اصل کمی یقین کی ہے جب کہ یقینِ قلبی بہت ضروری ہے۔ بقولِ اقبال ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں' یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!

لیکن اب سوال یہ ہے کہ وہ یقین کیسے پیدا ہو؟ یہ یقین کہاں سے آئے؟ اس کے لیے مَیں پھر عرض کروں گا کہ اس کا ذریعہ قرآن حکیم ہے۔ قرآن حکیم میں حضور ﷺ سے خطاب ہوا:

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٥٢﴾﴾ (الشوریٰ)

''اور (اے نبی ﷺ!) اسی طرح ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے ایک روح

(یعنی قرآن) اپنے امر میں سے۔ آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے' لیکن ہم نے اس (قرآن) کو ایسا نُور بنایا ہے جس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔ اور بے شک (اے محمد ﷺ!) آپ سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتے ہیں۔''

حضورِ اقدس ﷺ جو یقینِ مجسّم بنے اور پھر آپؐ سے یہ یقین معاشرے کے اندر متعدّی ہوا اور لوگوں میں پھیلا' قرآن مجید اس کا بھی یہی synthesis کرتا ہے۔ سورۃ الضحیٰ میں فرمایا: ﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝۷﴾ ''اور اُس نے آپؐ کو تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو ہدایت دی۔'' یعنی آپؐ تفکّر و اعتبار (غور و فکر) کے مراحل طے کرتے ہوئے جب ایسے مرحلے تک جا پہنچے گویا حقیقت کے دروازے پر دستک دی' تو آپؐ پر دروازے وا کر دیے گئے۔ پھر اس کے بعد اس میں یقین کا رنگ وحی کے ذریعے سے پیدا ہوا۔ آج ہمارے دلوں میں اگر ایمان کی شمع روشن ہو سکتی ہے تو اسی نورِ وحی یعنی آیاتِ قرآنی سے ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہی ہمارے اندر ایمان کی جوت جگا سکتی ہے۔ اللہ کی معرفت یوں تو ہمارے دلوں میں موجود ہے' لیکن وہ خوابیدہ (dormant) ہے۔ اسے بیدار کرنے کے لیے آیاتِ قرآنیہ نازل ہوئی ہیں اور یہ قرآن مجید ہی کے ذریعے متحرک (activate) ہو سکتی ہے ؎

ایسے کچھ تار بھی ہیں سازِ حقیقت میں نہاں
چُھو سکے گا نہ جنہیں زخمۂ مضرابِ حواس

انسان کی فکر کی سطح پر ایمان کو (activate) کرنے کے لیے تو آیاتِ آفاقیہ موجود ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ﴾

(حٰمٓ السجدۃ: ۵۳)

''ہم عنقریب اُن کو اطرافِ عالَم میں اور خود اُن کی ذات میں بھی نشانیاں دکھائیں گے' یہاں تک کہ اُن پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے۔

لیکن اُس کے اندر کے تاروں کو چھیڑنے کے لیے آیاتِ قرآنیہ کا نزول ہوا ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۵۷)

''جو لوگ ایمان لائے ہیں اُن کا دوست اللہ ہے جو ان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے جاتا ہے۔''

وہ لوگ جو ذہنی صلاحیتیں رکھتے ہوں اور جنہوں نے غور و فکر کے مراحل طے کیے ہوں' ان کے اندر قرآن مجید کی آیات ہی کے ذریعے سے یہ ایمان اُبھرے گا اور اسی کے ذریعے فکر کی جڑیں مضبوط ہوں گی۔ آپ غالب کا ایک شعر سنتے ہیں تو جھوم جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس شعر نے آپ کے وجود کے اندر کے تاروں میں سے کسی تار کو چھیڑ دیا ہے۔ آپ کا اپنا کوئی احساس تھا جو اس شعر کے ذریعے متحرک ہوا اور آپ جھوم گئے۔

ایمان و یقین حواس کے مشاہدے اور خارجی تجربہ سے پیدا نہیں ہوسکتا۔ علّامہ اقبال نے تو یہاں تک ثابت کیا ہے کہ خارجی تجربہ بسا اوقات انسان کو دھوکا دے دیتا ہے۔ مثلاً آپ ایک گرم چیز کو زیادہ دیر چھونے کے بعد کم گرم شے کو چھوئیں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ ٹھنڈی ہے۔ لیکن ایک ٹھنڈی شے کو چھونے کے بعد آپ اسی کم گرم شے کو چھوئیں تو معلوم ہوگا کہ وہ گرم ہے۔ اندازہ کیجیے' ایک ہی شے کو آپ کے حواس گرم بھی بتا رہے ہیں اور ٹھنڈا بھی۔ گویا خارجی تجربہ دھوکہ دے سکتا ہے اور اس سے انسان کو طرح طرح کے مغالطے ہوسکتے ہیں۔ یقینِ قلبی آیاتِ قرآنیہ سے پیدا ہوگا۔ حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو قرآن کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس کرتے ہیں گویا یہ قرآن میں لکھا ہوا نہیں بلکہ ان کے اپنے دل پر نقش ہے۔ کلام اللہ اور اُن کے دل کے درمیان اتنی ہم آہنگی اور توافق ہوتا ہے کہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو میری فطرت کی پکار ہے۔ (اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ!)

اسلامی انقلاب کے لیے فکری اساس کی پختگی

آیاتِ قرآنیہ کے ذریعے تزکیہ اگرچہ دِقّت طلب کام ہے' لیکن یہ انتہائی ناگزیر ہے۔ ایمان کی تعمیرِ نو (reconstruction of faith) کے لیے یہ محنت بہرحال کرنی پڑے گی۔ ضروری ہے کہ پہلے سماج کے ایک طبقے اور گروہ کے اندر یہ ایمان پیدا ہو' پھر اس طبقے سے متعدّی ہو کر کچھ اور لوگوں کے دلوں میں گھر کرے' اور یہ یقین اس درجے تک ہو کہ وہ غلبۂ دینِ حق کے لیے اپنا تن من دھن لگا دینے کے لیے تیار ہو جائیں' اُن میں وہ قوت پیدا ہو جائے کہ اللہ کی رضا اور اُخروی فلاح کے لیے اپنی ہر شے قربان کر سکتے ہوں۔ تب صحیح طور پر اسلامی تحریک کے لیے افراد کی تیاری کی پہلی شرط پوری ہوگی۔ ایسے ہی افراد انقلاب کے مراحل سے گزرتے ہوئے وہ انقلاب لائیں گے جس سے اسلام کا نظامِ حیات بالفعل قائم ہو جائے گا۔ اگر ہم محض موروثی عقیدے' جو ہمیں وراثتاً منتقل ہوتا ہوا چلا آ رہا ہے' مگر لوگوں کی سوچ اور ان کے نظامِ اقدار کے اندر سرایت کیے ہوئے نہیں ہے' کی بنیاد پر کوئی جذباتی تحریک اٹھا کر یا کچھ وقتی ہنگامے کھڑے کر کے' مطالبات کا ایک طومار سامنے لا کر' سیاسی تحریکیں چلاتے رہے تو اس سے کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے جو مَیں نے بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں اُس زندہ ایمان سے نوازے جسے مَیں نے ''روشن یقین'' (burning faith) سے تعبیر کیا ہے۔ (آمین!)



خطاب ②

اسلام کا اَخلاقی اور رُوحانی نظام

خطبۂ مسنونہ کے بعد تلاوتِ آیات:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ - بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝۹ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝۱۰﴾ (الشمس)

وقال اللّٰهُ تعالیٰ:

﴿وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۚ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝۱۷۹﴾ (الاعراف)

وقال عزّوجل:

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝۲۸ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝۲۹﴾ (الحجر)

وقال تبارک وتعالیٰ:

﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۸۵﴾ (بنی اسراءیل)

وفی الحدیث:

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَالَ: مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ، وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَيْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ، وَمَا يَزَالُ عَبْدِیْ يَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ، فَاِذَا

اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِهٖ وَیَدَهُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِهَا وَلَئِنْ سَأَلَنِیْ لَاُعْطِیَنَّهٗ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَاُعِیْذَنَّهٗ))(۱)

معزّز حاضرین ومحترم خواتین!

جیسا کہ عنوان سے ہی ظاہر ہے' دو موضوعات کو یہاں پر جمع کیا گیا ہے: ''اسلام کا اخلاقی نظام'' اور ''اسلام کا روحانی نظام''۔ اس لیے کہ یہ دونوں انتہائی مربوط ہیں اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایک ہی موضوع کی دو سطحیں (levels) ہیں۔ مؤخّر الذکر کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مقدّم الذکر سے بلند تر ہے' یا بالفاظِ دیگر وہ اسی مضمون کا عمیق تر پہلو ہے۔

خطاب کا پس منظر

مئی ۱۹۸۸ء کے ''حکمتِ قرآن'' میں میری چند تحریریں شائع ہوئی تھیں جو ان دونوں موضوعات سے متعلق ہیں۔ ''حقیقتِ زندگی''، ''حقیقتِ انسان'' اور ''عظمتِ صوم''۔(۲) میرے ان مضامین میں بہت سے مسائل جو عرفِ عام میں تصوّف سے متعلق ہیں' زیر بحث آئے ہیں۔ مَیں نے ''عرفِ عام'' کا لفظ جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ مَیں بعد میں عرض کروں گا کہ تصوّف کی اصطلاح دراصل بہت سے مغالطوں کا موجب بنی ہے۔ اگرچہ اس کا موضوع قرآن وسُنّت کے اہم موضوعات میں سے ہے' لیکن چونکہ ہمارے ہاں اس موضوع پر بہت ردّوقدح اور بحث وتمحیص ہے' پھر ایک جانب غلو ہے تو دوسری جانب انتہا پسندی' لہٰذا میرے پاس بہت سے خطوط آئے اور بہت سے حضرات نے گفتگو کی' بعض جرائد نے اس پر تبصرے کیے۔ پھر رفقائے تنظیم اسلامی اور انجمن خُدّام القرآن کے احباب بھی مطالبہ کرتے رہے کہ اب مَیں اس موضوع پر اپنے خیالات کو

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الرقاق' باب التواضع۔

(۲) اب یہ تحریریں دو کتابچوں کی صورت میں دستیاب ہیں: (۱) زندگی' موت اور انسان (۲) عظمتِ صوم۔ شائع کردہ مکتبہ خُدّام القرآن لاہور (مرتّب)

زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کروں۔ تحریر کا تو مجھے اب تک موقع نہیں مل سکا' تاہم مَیں کوشش کروں گا کہ آج اپنی بات وضاحت سے آپ حضرات کے سامنے رکھوں۔ ان چند تمہیدی گزارشات کے بعد مَیں اس موضوع کے پہلے حصّے کی جانب بڑھتا ہوں۔

(حصّہ اوّل)

اسلام کا اَخلاقی نظام

اس عنوان کے ذیل میں تین باتیں ہیں جو مَیں ترتیب کے ساتھ آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

اسلام میں اَخلاقِ حسنہ کی اہمیت

پہلی بات جو میرے نزدیک كَلَّا اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ کے درجے میں ہے' یاددہانی کے طور پر عرض کی جاتی ہے اور ہم میں سے کسی کے لیے یہ نئی بات نہیں ہوگی' لیکن اس گفتگو کا حق ادا نہیں ہوسکتا اگر ان حقائق کو تازہ نہ کرلیا جائے۔ وہ بات یہ ہے کہ اسلام میں اخلاق کی اہمیت اس درجہ ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا گیا: ((أَيُّ الْإِيمَانِ أَفْضَلُ؟)) اے اللہ کے رسول ﷺ فرمایئے کہ سب سے افضل' سب سے اعلیٰ اور سب سے عمدہ ایمان کون سا ہے؟ تو جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: ((خُلُقٌ حَسَنٌ))(۳) یعنی وہ ایمان جس کے ساتھ اخلاقِ حسنہ موجود ہوں۔ اسی طرح دوسری حدیث میں یہ قولِ مبارک سامنے آتا ہے: ((أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا))(۴) ''اہلِ ایمان میں سب سے زیادہ کامل الایمان شخص وہ ہے جو اخلاق میں سب سے عمدہ ہے''۔ یعنی جس کے اخلاق سب سے اعلیٰ ہیں۔

ہمارے سامنے وہ آیاتِ قرآنیہ بھی ہیں جن میں نبی اکرم ﷺ کے اخلاقِ عالیہ

---

(۳) مسند احمد بن حنبل' مسند العشرة المبشرين بالجنة' تتمة مسند الكوفيين' حديث عمرو بن عبسة۔

(۴) سنن الترمذی' كتاب الرضاع' باب ما جاء فی حق المرأة على زوجها۔

سے متصف ہونے کا تذکرہ ہے' جیسے سورۂ نٓ (القلم) کی ابتدائی آیات' جو بعض محققین کے نزدیک دوسری وحی ہے جو حضور ﷺ پر نازل کی گئی:

﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ① مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ② وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ③ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ④﴾

''نون۔ (اے نبی ﷺ) قسم ہے قلم کی اور اُس چیز کی جسے (لکھنے والے) لکھ رہے ہیں کہ آپؐ اپنے ربّ کے فضل سے مجنون نہیں ہیں۔ یقیناً آپؐ کے لیے تو کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔ اور بے شک آپؐ اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر ہیں۔''

اے نبی ﷺ! اگر کوئی آپؐ کو مجنون کہہ رہا ہے تو آپؐ دل گرفتہ نہ ہوں۔ ان کے کہنے سے آپؐ مجنون نہیں ہو جائیں گے۔ آپؐ کے اخلاق تو خود منہ بولتا ثبوت ہیں کہ آپؐ کی شخصیت نہایت متوازن ہے۔ آپؐ کے اخلاق تو انتہائی اعلیٰ ہیں: ﴿اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝﴾

بعض احادیث مبارکہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ایمان اور اخلاقِ حسنہ لازم و ملزوم ہیں۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا اللَّعَّانِ وَلَا الْفَاحِشِ وَلَا الْبَذِيِّ))(۵)

''مؤمن کبھی بھی طعنے دینے والا' لعنت ملامت کرنے والا' فحش گوئی کرنے والا اور بداخلاق نہیں ہو سکتا۔''

اور میرے نزدیک اس ضمن میں حرفِ آخر ہے وہ حدیثِ مبارکہ جو متفق علیہ ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ' وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ' وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ!)) ''اللہ کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں ہے! دوسری مرتبہ پھر یہی فرمایا' تیسری مرتبہ پھر آپ ﷺ نے یہی فرمایا کہ اللہ کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں ہے''۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم لرز گئے ہوں گے کہ کون ہے وہ شقی شخص جس کے بارے میں حضور ﷺ تین مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر فرما رہے ہیں کہ وہ شخص مؤمن نہیں۔ ((قِيلَ وَمَنْ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟)) ''پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول کون؟'' تو جواب میں یہ ارشاد ہوتا ہے: ((الَّذِي

---

(۵) سنن الترمذی' کتاب البر والصلة' باب ما جاء فی اللعنة۔ وشعب الایمان للبیهقی' الرابع والثلاثون من شعب الایمان' فصل فی فضل السکوت عن کل ما لا یعینیه۔

لَا يَأْمَنُ جَارُهُ بَوَايِقَهُ)) (۶) ''وہ شخص جس کی ایذا رسانی سے اس کا پڑوسی چین یا امن میں نہیں ہے''۔ یہ حدیث بہت سے افراد نے پہلے بھی سنی ہوگی' لیکن اس اعتبار سے توجّہ کریں کہ یہاں کسی گناہِ کبیرہ کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ یہاں شرک کا تذکرہ نہیں ہے' زنا کا تذکرہ نہیں ہے' چوری' ڈاکہ یا قتل کا تذکرہ نہیں ہے' صرف وہ شے بیان فرمائی جس کو ہم کج خُلقی کہتے ہیں۔

مَیں یہاں متکلمانہ بحثیں نہیں چھیڑنا چاہتا' ظاہر ہے کہ یہاں یہ بات مراد نہیں ہے کہ جس شخص کی یہ کیفیت ہے وہ اسلام کے دائرے سے نکل گیا' وہ کافر ہو گیا — بلکہ کوئی اور حقیقت ہے جس کی نفی محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس شدّت سے فرما رہے ہیں۔ یہ قانونی ایمان نہیں ہے جس کی بنیاد پر کسی کو دنیا میں مسلمان سمجھا جاتا ہے' لیکن اسے حقیقتِ ایمان کہہ لیں یا ایمان کا تکمیلی درجہ کہہ لیں کہ اُس شخص کی محرومی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تین مرتبہ اللہ کی قسم کھائی ہے جس کی ایذا رسانی سے اُس کا پڑوسی چین میں نہیں ہے۔

اس موضوع پر آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہؐ کا بہت سا ذخیرہ سامنے لایا جا سکتا ہے مگر میں اسی پر اکتفا کرتے ہوئے اب دوسری بات کی طرف آ رہا ہوں۔

قرآنِ حکیم کی روشنی میں اخلاقیات کی فلسفیانہ اساس

علمِ اخلاق یا اخلاقیات کے ذیل میں قرآن حکیم کی اہم ترین تعلیم' جو اخلاقیات کی فلسفیانہ اساس بنتی ہے' یہ ہے کہ انسان کے نفس میں اللہ تعالیٰ نے نیکی و بدی کا شعور الہامی طور پر ودیعت کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں نے آج اپنی گفتگو کا آغاز سورۃ الشّمس کی اِن آیات سے کیا ہے: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷﴾ اور نفسِ انسانی کی قسم اور جیسا کچھ اللہ نے اس کو بنایا' سنوارا' اس کی نوک پلک درست کی۔ ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸﴾ اور الہامی طور پر اس میں ودیعت کر دیا فجور اور تقویٰ کا علم' نیکی اور بدی کا شعور' خیر اور شر کا امتیاز' اِثم و بِر کے مابین تمیز۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں نیکی اور بدی کے لیے خیر اور

(۶) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب اثم من لا یأمن جارہ بوایقہ' وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب تحریم ایذاء الجار۔

شر کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں' اِثم و بِرّ کے الفاظ بھی آئے ہیں' لیکن جامع ترین اصطلاح ہے'' معروف'' اور ''منکر''۔ معروف کے لفظی معنی ہیں جو شے جانی پہچانی ہے' جبکہ منکر اُس شے کو کہتے ہیں جس کے بارے میں اجنبیت محسوس کی جائے' جس کو پہچانا نہ جا رہا ہو۔ اس اعتبار سے قرآن مجید نیکی اور بدی کے بارے میں یہ بنیادی تصوّر سامنے لاتا ہے۔ مَیں یہاں نفسِ انسانی کی اصطلاح استعمال کر رہا ہوں' کیونکہ آیاتِ مبارکہ میں ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷﴾ آیا ہے۔ نفسِ انسانی میں جو بھی ارتقائی عمل ہوا ہے اس کے نتیجے میں حیوانات کے مقابلے میں ایک بالکل نئی استعداد اور صلاحیت پیدا ہوئی ہے اور وہ ہے خیر اور شر میں امتیاز کی صلاحیت۔ انسان اپنی اس فطرت کے اعتبار سے جانتا ہے کہ کیا خیر ہے اور کیا شر ہے؟ کیا نیکی ہے اور کیا بدی؟ ''خیر'' اس کے لیے معروف کے درجے میں ہے' جبکہ شر' بُرائی' بدی اور اِثم کو وہ منکر سمجھتا ہے۔ یہ درحقیقت خیر اور شر (good and evil) کے بنیادی تصوّرات ہیں جو پوری نوعِ انسانی کا مشترک اثاثہ ہیں' ان میں آپ کو کہیں کوئی فرق معلوم نہیں ہوگا۔ سچ بولنا ہر معاشرے میں' ہر دور میں خیر قرار دیا گیا اور جھوٹ بولنا ہر معاشرے میں' ہر دور میں بدی قرار پایا۔ ایفائے عہد ہر دَور میں' ہر معاشرے میں نیکی قرار پائی اور وعدہ خلافی ہر دور میں' ہر معاشرے میں ایک بُرائی سمجھی گئی۔

اس کا ذرا تقابل کریں دوسرے الفاظ کے ساتھ۔ ایک ہے شریعت کے احکام اور اوامر و نواہی کہ یہ فرض ہے' یہ واجب ہے اور یہ حرام ہے' اس کے قریب نہ پھٹکو۔ واضح رہے کہ یہ دوسری منزل ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کے لیے انسان کو وحی اور نبوت کی تعلیم کی ضرورت ہے۔ مثلاً شراب حرام ہے' اس کا معاملہ ایسا نہیں ہے کہ انسان طبعاً اس کا فیصلہ کر سکے' سؤر کا گوشت حرام ہے' اس کے بارے میں آج بھی لوگوں کو اشکال ہے کہ کیوں حرام ہے؟ یہ وہ چیزیں ہیں جو درحقیقت شریعت کے نقل پر مبنی ہیں۔ جو اللہ ربّ العزت نے فرمایا اور جو اللہ کے رسول ﷺ نے ہم تک پہنچایا ہے ان احکام کی اطاعت ہمارے ذمّے ہے' ان کی خلاف ورزی کو ہم معصیت قرار دیتے

ہیں۔ جبکہ منکر کی اصطلاح اس سے وسیع تر مفہوم کی حامل ہے۔ یہ وہ پہلی منزل ہے جو اَخلاقی اَقدار (Ethical Values) پر مشتمل ہے۔ یہ اخلاقی اقدار پوری نوعِ انسانی کی مشترک متاع ہیں۔ ہر دور میں، تمام اقوام میں اور ہر علاقے میں ان کو مانا گیا ہے کہ یہ اچھائیاں ہیں، بھلائیاں ہیں، نیکیاں ہیں اور یہ بُرائیاں ہیں، یہ شر ہے اور یہ خیر ہے۔

اس اعتبار سے مَیں چاہتا ہوں کہ چند احادیثِ مبارکہ آپ کے سامنے رکھوں۔ بڑی پیاری حدیث ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ((اِذَا سَرَّتْکَ حَسَنَتُکَ وَسَائَتْکَ سَیِّئَتُکَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ))(۷) ''اگر تمہیں کوئی اچھا کام کر کے خوشی ہو اور کوئی بُرا کام کر کے تمہیں خود ملال ہو، تو تم مؤمن ہو''۔ یہ احساس گویا ایمان کی علامت ہے۔ معلوم ہوا کہ فطرت مسخ نہیں ہوئی، اس فطرت کے اندر خیر و شر کا امتیاز برقرار ہے۔ تبھی تو نیکی کر کے تمہیں مسرّت ہوئی ہے، خوشی ہوئی ہے، اور کوئی کام اگر غلط ہو گیا ہے، کسی بدی کا ارتکاب ہو گیا ہے تو اس پر تمہیں خود گھٹن محسوس ہوئی ہے، تمہیں خود ضیق اور تنگی کا احساس ہوا ہے۔ یہ علامت ہے اس بات کی کہ فطرت اپنی صورت پر برقرار ہے، فطرت مسخ (pervert) نہیں ہوئی۔

اس سے بھی زیادہ حکیمانہ قول ہے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جو بہت ہی اہم فلسفیانہ حقیقت پر مشتمل ہے: ((وَالْاِثْمُ مَا حَاکَ فِی نَفْسِکَ وَکَرِهْتَ أَنْ یَطَّلِعَ عَلَیْهِ النَّاسُ))(۸) ''گناہ وہ ہے جو تمہارے سینے میں کھٹکے اور تم اسے ناپسند کرو کہ وہ کام لوگوں کے علم میں آئے''۔ جیسا کہ سورۃ القیامۃ میں ''نفسِ لوّامہ'' کی قسم کھائی گئی ہے:

﴿لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ ۝۱ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝۲﴾

''نہیں! مَیں قسم کھاتا ہوں روزِ قیامت کی۔ اور نہیں! مَیں قسم کھاتا ہوں نفسِ ملامت گر کی۔''

یہ وہ ضمیرِ ملامت گر ہے کہ اگر ہم سے کسی بُرائی کا صدور ہو جاتا ہے تو ہمیں اس کی بنا پر اندر

(۷) مسند احمد بن حنبل، مسند العشرة المبشرین بالجنة، مسند الانصار، حدیث ابی اُمامة الباهلی الصدّی...

(۸) جامع الترمذی، کتاب الزهد، باب ما جاء فی البر والاثم۔

ہی اندر کوئی شے ملامت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ انگریزی میں اسے یوں تعبیر کرتے ہیں: ''My conscious is biting me'' یعنی ''میرا ضمیر مجھے کچوکے دے رہا ہے''۔ درحقیقت یہ اسی آیتِ مبارکہ کی ترجمانی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھ لیجیے کہ ایک ہے انسان کا انفرادی ضمیر (individual conscious) جس پر مذکورہ بالا حدیث میں آنحضور ﷺ کی جانب سے گویا اظہارِ اعتماد کیا گیا ہے۔ یہ ضمیر ایک زندہ حقیقت ہے اور یہ علامت ہے اس بات کی کہ فطرتِ انسانی اپنی صحت پر برقرار ہے۔ آپ کے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ مَیں یہ کام کرتو بیٹھا ہوں لیکن کسی کے علم میں نہیں آنا چاہیے۔ اس لیے کہ لوگ ملامت کریں گے' میرے بارے میں بُری رائے قائم کریں گے۔ اسی طرح نوعِ انسانی کا ایک اجتماعی ضمیر (collective conscious) بھی ہے جس کا اثبات کیا جارہا ہے۔ بہرحال احکامِ شریعت کے معاملے کو' جو ایک بلند تر منزل ہے' آج کی بحث سے خارج سمجھئے۔ لیکن جہاں تک انسانی اخلاقیات کا تعلق ہے تو ان چیزوں کے لیے انسان کسی تلقین یا تعلیم کا حاجت مند نہیں ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی عطا ہے' یہ دولت اُس کے پاس ہے۔ یہ پہچان' یہ فہم' یہ شعور' یہ امتیاز اس کے اندر ودیعت شدہ ہیں۔ لہٰذا صداقت وامانت' ایفائے عہد' صلہ رحمی' خدمتِ خلق' یہ وہ بنیادی اوصاف ہیں جو مجمع علیہ ہیں۔

ایک حدیث ملاحظہ کیجیے' حضرت اَنس رضی اللہ عنہ جو نو برس تک حضور ﷺ کے ذاتی خادم کی حیثیت سے آپؐ کے ساتھ رہے ہیں' ان کی گواہی ہے کہ: قَلَّمَا خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِلَّا قَالَ: ((لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهٗ ' وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهٗ)) (۹) ''شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہوگا کہ ہمیں اللہ کے رسول ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا ہو اور اس میں یہ الفاظ نہ فرمائے ہوں: ''جس شخص کے اندر امانت داری کا وصف نہیں ہے اس کا کوئی ایمان نہیں' اور جس میں ایفائے عہد کا مادّہ نہیں اس کا کوئی دین نہیں''۔ امن' امانت اور

---

(۹) رواہ البیھقی فی شعب الایمان۔ مشکاۃ المصابیح' کتاب الایمان' الفصل الثانی۔ ومسند احمد بن حنبل' باقی مسند المکثرین من الصحابۃ' مسند انس بن مالکؓ۔

ایمان کا قریبی رشتہ ہے اور لفظی طور پر بھی ان کا مادّہ ایک ہی ہے۔

ایفائے عہد کا دین سے جو معنوی ربط ہے اس کو سمجھ لیجئے' کہ درحقیقت دین بھی تو بندے اور رب کے درمیان ایک عہد ہے۔ نماز میں ہم عہد کرتے ہیں: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ (الفاتحۃ) ''پروردگار! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے''۔ یہ ایک بڑا عہد ہے' جو شخص چھوٹے چھوٹے وعدے پورے نہ کرتا ہو وہ اتنا بڑا عہد' پوری زندگی کا عہد کیسے نبھائے گا؟ چنانچہ جس شخص میں امانت کا وصف نہیں اس میں ایمان نہیں' اور جس میں پاسِ عہد نہیں اُس کا کوئی دین نہیں!!

اسی طرح خدمتِ خلق کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا یہ قول یاد کیجیے: ((خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَنْفَعُ النَّاسَ))(۱۰) ''لوگوں میں بہترین وہی ہیں جو لوگوں کو فائدہ پہنچائیں۔''

یہ جو بنیادی اخلاقیات ہیں' مثلاً صداقت' امانت' ایفائے عہد' صلہ رحمی' خدمتِ خلق' کمزوروں پر رحم' غریبوں کی امداد' یتیموں اور مسکینوں کی سرپرستی' یہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے بارے میں قرآن فرماتا ہے:

﴿اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝۱ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝۲ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝۳﴾ (الماعون)

''کیا دیکھا آپ نے اُس شخص کو جو جھٹلاتا ہے بدلے کو؟ پس وہی ہے جو دھکے دیتا ہے یتیم کو' اور نہیں ترغیب دیتا مسکین کو کھانا کھلانے کی۔''

یہ وہ چیزیں ہیں جو فطرتِ انسانی کی جانی پہچانی ہیں' معروفات ہیں۔ ہر انسان جانتا ہے کہ یہ نیکی ہے اور اس کی ضد شر ہے۔

اعلیٰ اخلاق کے لیے جذبۂ محرکہ

یہاں تک تو سب جانتے ہیں' مگر عملاً جو مسئلہ درپیش ہے اس کا اظہار غالبؔ نے اس شعر میں کیا ہے ؎

---

(۱۰) شعب الایمان للبیھقی' فصل فی ذکر ما ورد من التشدید...کنز العُمّال ۸/ ۲۰۱۔ کتاب المواعظ والرقاق .....

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!

اسی طرح فارسی کا ایک بہت تلخ شعر ہے، جو گزشتہ خطاب میں بھی بیان ہو چکا ہے ؎

اے دیانت بر تو لعنت از تو رنجے یافتم
اے خیانت پر تو رحمت از تو گنجے یافتم (۱۱)

ایک شخص جانتا ہے کہ سچ بولنا خیر ہے، مگر سچ بولنے سے نقصان ہو رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جھوٹ بولنا شر ہے، لیکن جھوٹ بول کر لاکھوں کا نفع حاصل ہو رہا ہے۔ اب وہ کون سی قوتِ محرکہ (motivating force) ہوگی اور وہ کون سا جذبۂ محرکہ ہوگا جو اسے آمادہ کرے گا کہ سچ بولنا ہے، چاہے جان بھی جانے کا اندیشہ ہو، چاہے اس کی وجہ سے نقصان ہو جائے۔ یہ ہے اصل مسئلہ علم الاخلاق کا، ورنہ جہاں تک بنیادی نیکی کا تصوّر ہے، انسان اندھا بہرا نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح انسان کو خارجی سماعت و بصارت عطا فرمائی ہے اسی طرح نفسِ انسانی کو باطنی بصیرت عطا فرمائی ہے کہ کیا خیر ہے، کیا شر ہے، کیا نیکی ہے، کیا بدی ہے! یہ جو جذبۂ محرکہ ہے اس کے بارے میں بعض نظریات دنیا میں رائج ہیں۔ خاص طور پر جدید مغربی دنیا میں فلاسفرز نے اخلاقیات کی جو اساسات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ اساسات بالکل ریت کی دیوار کی مانند ہیں، جن کے لیے کوئی استحکام نہیں۔ ہم یہاں ان کا مختصر تعارف پیش کر رہے ہیں۔

(ا) نظریۂ مسرّت: یعنی نیکی سے خوشی ہوتی ہے، اچھے اخلاق سے انشراح ہوتا ہے۔ اس کی جزوی صداقت مَیں خود نبی اکرم ﷺ کی احادیث کی روشنی میں بیان کر چکا ہوں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ مسرّت اخلاقیات کی مستقل اور مستحکم اساس بن سکتی ہے؟ جب کہ سوال ہوگا کہ مسرّت کس کی؟ ہوسکتا ہے ایک آدمی کی مسرّت دوسرے آدمی کی مسرّت سے ٹکرا رہی ہو۔ اسی طرح مسرّت اور تلذّذ (sensual gratification) میں بڑا باریک سا پردہ رہ

(۱۱) ''اے دیانت تجھ پر لعنت ہو، تجھ سے مَیں نے سوائے رنج کے کچھ نہ پایا۔ اے خیانت تجھ پر رحمت ہو، تیری وجہ سے مَیں نے خزانہ حاصل کیا!!''

جاتا ہے۔ وہ جو کہا گیا ہے ع ''مَردی و نامَردی قدمے فاصلہ دارد'' (ہمت اور بے ہمتی میں ایک قدم کا فاصلہ ہے)۔ جس طرح فکر' سوچ اور روحانی مسرّت کا یقیناً اخلاق کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے اسی طرح دنیا جانتی ہے کہ بہت سے لوگ ہیں جن کی شخصیتیں مسخ ہو جاتی ہیں' انہیں دوسروں کو اذیت پہنچا کر مسرّت حاصل ہوتی ہے۔ اذیت پسند لوگ (sadist) دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مسرّت اعلیٰ اخلاق کی کوئی بنیاد نہیں بن سکتی' کیونکہ یہ کوئی پائیدار قوتِ محرکہ نہیں ہے۔

(ب) نظریۂ منفعت: ایک دوسرا فلسفہ ہے ''منفعت''۔ انگریزی کی مشہور کہاوت ہے: Honesty is the best Policy — یقیناً جزوی اعتبار سے یہ بات درست بھی ہے۔ کاروبار میں اگر ایک شخص دیانت اور صداقت کا معاملہ کر رہا ہے تو اُس کی ساکھ بن جائے گی' لوگ اس پر اعتماد کرنے لگیں گے' وہ ایک کامیاب تاجر ثابت ہوگا' اُس کی صداقت وامانت دنیا میں بھی اس کے لیے نافع ہو جائے گی۔ جزوی اعتبار سے یہ بات صحیح ہے' لیکن اسی کو آگے بڑھایئے تو ایک کی منفعت دوسرے کی مضرت بھی بن جاتی ہے۔ ایک کا نفع دوسرے کے لیے نقصان بنتا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ کوئی مستقل اصول نہیں ہے۔

(ج) نظریۂ اجتماعی منفعت: ایک اور تصوّر دنیا میں دیا گیا ہے ''اجتماعی منفعت'' کا کہ اگر کسی شخص کا تعلق کسی اجتماعیت سے ہے اور اس کے دل میں اس اجتماعیت کے لیے' مثلاً اپنی برادری (community)' اپنی قوم یا اپنے وطن کے لیے اگر سچی محبّت کا جذبہ ہے تو یہ بھی اخلاق کی بنیاد بنتی ہے۔ مَیں یہاں بھی تسلیم کروں گا کہ جزوی طور پر یہ بات صحیح ہے کہ قوم پرست اور وطن پرست انسان اپنی قوم اور وطن کے لیے ایک اچھا انسان ہوگا' ان کو دھوکہ نہیں دے گا' ان سے فریب نہیں کرے گا۔

یہاں پر میرا ذہن منتقل ہوا ہے نبی اکرم ﷺ کے خطبات میں سے ایک بہت ہی ابتدائی دور کے خطبے کی جانب جسے ''نہج البلاغہ'' کے مرتّبین نے بھی شامل کیا ہے۔ اس میں نبی اکرم ﷺ نے اسی بنیاد کو ایک دلیل کے طور پر پیش فرمایا ہے۔

((اِنَّ الرَّائِدَ لَا یَکْذِبُ أَھْلَهٗ ، وَاللّٰهِ لَوْ کَذَبْتُ النَّاسَ جَمِیْعًا مَا کَذَبْتُکُمْ ،

وَلَوْ غَرَرْتُ النَّاسَ مَا غَرَرْتُكُمْ ، وَاللّٰهِ الَّذِی لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، اِنِّی لَرَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ خَاصَّةً وَاِلَی النَّاسِ کَافَّةً ، وَاللّٰهِ لَتَمُوتُنَّ کَمَا تَنَامُوْن ، وَلَتُبْعَثُنَّ کَمَا تَسْتَیْقِظُوْنَ، وَلَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ، وَلَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَبِالسُّوْءِ سُوْءًا ، وَاِنَّهَا لَلْجَنَّةُ أَبَدًا أَوِ النَّارُ أَبَدًا)) (۱۲)

''بے شک راستہ دکھانے والا اپنے قافلے والوں کو دھوکہ نہیں دیتا۔ اور اللہ کی قسم! اگر مَیں بالفرض تمام لوگوں سے جھوٹ بول سکتا تو بھی تم سے جھوٹ نہ بولتا' اور اگر بالفرض تمام نوعِ انسانی کو دھوکہ دے سکتا تو بھی تمہیں دھوکہ نہ دیتا۔ پس اللہ کی قسم' جس کے سوا کوئی معبود نہیں' بلاشبہ مَیں تمہاری جانب رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں خصوصیت کے ساتھ اور تمام نوعِ انسانی کی جانب عمومیت کے ساتھ۔ اللہ کی قسم' بلاشبہ تم سب مرجاؤ گے جیسے سوجاتے ہو' اور بلاشبہ تم سب اٹھائے جاؤ گے جیسے نیند سے بیدار ہوتے ہو۔ اور ضرور بالضرور تم سب سے حساب ہوکر رہے گا اُس کے بارے میں جو تم عمل کرتے رہے' اور ضرور تمہیں بدلہ دیا جائے گا نیکی کا اچھا بدلہ اور بُرائی کا برا بدلہ۔ وہ یا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنّت ہے یا ہمیشہ ہمیشہ کی آگ۔''

یہ ایک چھوٹا سا خطبہ ہے' لیکن بہت جامع ہے۔ مَیں اس کا حوالہ اس لیے دے رہا ہوں کہ آج دنیا میں ہمارے سامنے یہ بات ایک حقیقت کے طور پر موجود ہے۔ آپ انگلستان یا امریکہ جاتے ہیں وہاں وقت کی پابندی ہوتی ہے۔ کوئی شخص چین کا دورہ کر کے آتا ہے' وہ کہتا ہے کہ اصل اسلام تو وہاں ہے' لوگوں کے اخلاق و کردار' وہاں کا نظم وضبط' لوگوں کا صاف معاملہ کرنا' دھوکہ نہ دینا' فریب سے کام نہ لینا۔ واقعہ یہ ہے کہ قوم پرستی' وطن پرستی (Nationalism) اور اس سے آگے بڑھ کر انسان دوستی (Humanism)' ایک نظریے کے ساتھ وابستگی (Idealism)' یہ چیزیں یقیناً انسان کے اندر اخلاقِ حسنہ کی ترویج اور خارج میں تنفیذ کے لیے مفید ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن یہاں بھی یہ بات سامنے آئے گی کہ اس کی وسعت (scope) تو بہت محدود (limited) ہے۔ اس لیے کہ ہمارا مشاہدہ ہے اور پوری دنیا جانتی ہے کہ جو لوگ اپنی قوم کے لیے نہایت رحم دل' نہایت سچے'

(۱۲) انساب الاشراف للبلاذری' دعاء رسول اللہ ﷺ۔ فقه السیرة للالبانی: ۹۷۔

دھوکہ نہ دینے والے' کاروبار میں راست باز ہوتے ہیں یہی لوگ دوسری قوموں کا خون چوسنا روا سمجھتے ہیں۔ یہی مہذّب قومیں جب بین الاقوامی سطح پر آتی ہیں تو ان سے بڑا جھوٹا' ان سے بڑا دھوکے باز' ان سے بڑا ظالم اور کوئی نہیں ہوتا۔ یہ لوگ پوری پوری قوموں کو بیچ کھائیں گے ع ''قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند'' (پوری قوم کو بیچ دیا اور کس قدر سستا بیچ دیا!) ہندوستان میں ایک ایک شخص کے بدلے پوری پوری آبادیاں تہس نہس کر دی گئیں۔ ایک انگریز کے قتل کا انتقام لینے کے لیے پوری پوری بستیاں تباہ و برباد کر دی گئیں۔ نہ انہیں معاہدوں کی پرواہ ہوتی ہے نہ بین الاقوامی قراردادوں کی' وہ صرف اپنے مفادات کو دیکھتے ہیں۔ خاص طور پر انگریزوں نے عرب قوم سے جو وعدے کیے تھے اور انہیں جو فریب دیا تھا' جس کی وجہ سے عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کی تھی' پہلی جنگِ عظیم کے دوران ان وعدوں کا کیا ہوا؟ وہ سارے وعدے ہوا میں تحلیل ہو کر رہ گئے۔ تو یہ نظریہ بھی اخلاقیات کی ایک بنیاد تو ہے لیکن اس کی محدودیت (limitation) ظاہر و باہر ہے۔

اصل جذبۂ محرکہ ''ایمان''

ایک ایسا جذبۂ محرکہ' ایک ایسی motivation جو کہیں ناکام نہ ہو' ہر سطح پر انسان کو خیر اور بھلائی کے لیے کھڑا رکھے اور اس میں استقامت پیدا کرے' کہیں بھی جا کر اس کی صداقت اور امانت میں ضعف پیدا نہ ہو' اس کی مثال ہمارے سامنے آتی ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے شام کا ایک شہر فتح کیا تو وہاں کے لوگوں سے جزیہ وصول کر لیا' لیکن جنگی صورتِ حال ایسی ہوئی کہ انہیں پسپائی اختیار کرنی پڑی' محسوس ہو رہا تھا کہ دشمن ہمیں گھیرے میں لے رہا ہے۔ اس صورتِ حال میں انہوں نے شہر کے لوگوں کو بلا کر ان کی جزیے کی رقم واپس کر دی۔ یہ جو اخلاق کا مرتبہ ہے جس میں کسی سطح پر جا کر بھی پستی دکھائی نہیں دیتی' یہ درحقیقت صرف اور صرف ایمان کے ذریعے ممکن ہے۔ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ اصل میں وہ جذبۂ محرکہ ہے جو قرآن ہمیں عطا فرماتا ہے۔

ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ' دونوں میں مثبت اور منفی پہلو موجود ہیں۔ ایک طرف

اللہ کی محبّت' اللہ کی رضا جوئی اور دوسری طرف اللہ کا خوف' تقویٰ' یہ احساس کہ اللہ ہم سے ناراض نہ ہو جائے' درحقیقت ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ ہم تقویٰ کا ترجمہ صرف خوف سے کر دیتے ہیں تو اس میں ایک محدودیت آ جاتی ہے۔ اصل مثبت جذبہ محبّت کا ہے۔ جیسے ایک سعادت مند بیٹا یہ محسوس کرتا ہے کہ میرے والد ناراض نہ ہو جائیں' کہیں مَیں اپنے والد کے احساسات کو ٹھیس نہ پہنچا دوں' ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے ان کی دل شکنی ہو' اس وجہ سے اگر وہ اپنے والد کی اطاعت کر رہا ہے اور جو چیزیں انہیں پسند ہیں ان کا اہتمام کر رہا ہے' تو یہ تقویٰ کی اصل حقیقت ہے۔

ایمان باللہ کی حقیقت یوں سمجھئے کہ انسان نے عُروۃُ الوُثقٰی (مضبوط کُنڈا) تھام لیا۔ اب بڑے سے بڑے امتحان میں اس کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئے گی۔ دوسرا ایمان بالآخرۃ ہے۔ مَیں صرف وضاحت کے لیے عرض کر رہا ہوں کہ اس میں سلبی پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ یعنی آخرت کا خوف' آخرت کی جواب دہی کا احساس کہ ہر سانس کے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہے۔ اس کے لیے انسان اگر شعور تازہ رکھے تو یقیناً وہ ہر قدم پر اپنا محاسبہ کرے گا کہ کہیں مجھ سے کوئی غلط حرکت تو نہیں سرزد ہو گئی اور ہوشیار رہے گا کہ کہیں مجھ سے کوئی غلط فعل نہ سرزد ہو جائے۔

ایمان بالآخرۃ کے ضمن میں سورۃ العلق کی تین آیات کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام بھی غور و فکر کے مراحل سے گزرتے ہیں۔ جیسے وحی کے آغاز سے قبل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غارِ حرا کا دور ہے۔ اس کے بارے میں شارحین نے وضاحت کی ہے کہ کان صفة تعبّده فی غار حراء التفکّر والاعتبار[۱۳] (غارِ حرا میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبادت کی کیفیت تفکّر و اعتبار پر مبنی تھی)۔ غور و فکر اور سوچ بچار ایک تو فلسفیانہ مسائل پر ہے اور ایک اپنے گرد و پیش کے حالات پر۔ سورۃ العلق کی پہلی

---

(۱۳) اس قول کا تلاش کے باوجود کوئی حوالہ دستیاب نہ ہو سکا۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے غور و فکر کے مراحل سے گزرنے کے حوالے سے مختلف آراء رہی ہیں۔ البتہ یہ بات سب کے ہاں مسلّم ہے کہ منصبِ نبوت وہبی تھا نہ کہ کسبی! (مرتّب)

پانچ آیات کی حیثیت تو سب سے پہلی وحی کی ہے' لیکن اس کے بعد جو تین آیات آئی ہیں ان کے پسِ منظر میں نبی اکرم ﷺ کے غور و فکر کا جواب ملتا نظر آتا ہے کہ ایک حسّاس انسان جس کی اپنی اخلاقی حس انتہائی بیدار ہے' وہ معاشرے میں دیکھتا ہے کہ ظلم و تعدّی ہے' حق تلفیاں ہو رہی ہیں' لوگوں پر جبر ہو رہا ہے' جھوٹ بولا جا رہا ہے' عزّتیں اور حرمتیں پامال ہو رہی ہیں۔ خاص طور پر عرب کے اُس معاشرے کا تصوّر کریں کہ اخلاقی اعتبار سے وہ معاشرہ کس سطح پر پہنچا ہوا تھا' اس میں نبی اکرم ﷺ غور و فکر فرما رہے ہیں کہ اس ظلم کا ازالہ کیسے ہو؟ انسان طرح طرح کے دکھوں' مصائب اور رنج و آلام میں مبتلا ہے۔ اس سے نجات (salvation) کا کوئی راستہ ہے یا نہیں؟ اس طرح ان آیات کے پسِ منظر میں ایک گہرا فکر معلوم ہوتا ہے جس میں رہنمائی دی جا رہی ہے۔ جیسا کہ حضرت عزیر علیہ السلام نے بیت المقدس کو اس حالت میں دیکھ کر کہ ایک اینٹ سلامت نہیں رہی' کوئی متنفّس موجود نہیں' بستی اُجڑی ہوئی ہے' فرمایا تھا:

﴿اَنّٰی یُحۡیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ۚ﴾ (البقرۃ:۲۵۹)

''اللہ اس بستی کو اس تباہی کے بعد کیسے زندہ کرے گا؟''

ایسے ہی اس معاشرے کا معاملہ تھا جو اخلاق کی انتہائی پستی تک پہنچ گیا تھا۔ اب یہ اس قعرِ مذلّت سے کیسے نکلے گا؟ یہ فکر ہے' یہ سوچ ہے!

اس پسِ منظر میں سورۃ العلق کی ان تین آیات پر غور کیجیے: ﴿كَلَّاۤ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَيَطۡغٰۤى ۙ﴾ ''نہیں! انسان سرکشی پر اتر آتا ہے''۔ دست درازی پر آمادہ ہو جاتا ہے' اپنے حدود سے متجاوز ہو جاتا ہے۔ آپؐ کا یہ مشاہدہ صحیح ہے' معاشرے میں ظلم ہے' حق تلفی ہے' ناانصافی ہے' جبر ہے' رنگ و نسل کی بنیاد پر امتیاز (discrimination) ہے' اعلیٰ اور ادنیٰ کی تقسیم ہے۔ پھر یہ کہ جھوٹ بولا جا رہا ہے' حق داروں کی حق تلفی کی جا رہی ہے۔ مشاہدہ تو یقیناً درست ہے۔ آگے فرمایا: ﴿اَنۡ رَّاٰهُ اسۡتَغۡنٰى ؕ﴾ ''سبب یہ ہے کہ انسان دیکھتا ہے اپنے تئیں کہ مستغنی ہے''۔ کہیں پکڑ نہیں ہو رہی۔ اگر کوئی انگارا ہاتھ میں لیا جائے تو ہاتھ جل جاتا ہے' مگر جھوٹ بولا جائے تو کچھ نہیں ہوتا' زبان پر چھالا تک نہیں

پڑتا۔ اگر زہر کھالیا جائے تو موت واقع ہوجاتی ہے' لیکن یتیم کا مال ہڑپ کرلیا جاتا ہے' حق داروں کا حق ہڑپ کرلیا جاتا ہے مگر کچھ نہیں ہوتا' پیٹ درد تک نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ ایک اعتبار سے تو یہ دنیا مکمل ہے کہ مادّی قانون اپنے نتائج پیدا کر رہا ہے' لیکن اخلاقی قانون یہاں نتائج پیدا نہیں کر رہا' بلکہ بسا اوقات غلط نتیجہ نکلتا ہے۔ حرام خوری کرنے والے عیش کر رہے ہیں' ظلم کرنے والے اقتدار کی مسندوں پر بیٹھے ہیں' جن لوگوں نے دوسروں کو حقوق سے محروم کیا وہی ہیں کہ جن کی چودھراہٹیں ہیں' انہیں معاشرے میں عزّت مل رہی ہے۔ پھر فرمایا: ﴿اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الرُّجْعٰی ۝۸﴾ ''یقیناً تمہارے ربّ ہی کی طرف لوٹنا ہے''۔ اس کا علاج ایک ہی ہے کہ انسان کے سامنے یہ حقیقت موجود اور مستحضر رہے کہ اسے اس زندگی میں فوری پکڑ انہیں جا رہا' فوری سزا نہیں مل رہی' لیکن یہ جو اللہ کی طرف رجوع ہے ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝۱۵۶﴾ (البقرۃ) — تو وہاں اصل آخرت کا محاسبہ ہے' جواب طلبی ہے۔ یہ ہے اصل شے کہ اگر یہ یقین دل میں قائم ہوجائے تو پھر کیسا ظلم؟ کیسی تعدی؟ کیسی ناانصافی؟ کیسے کوئی جھوٹ بولے گا' کیسے کوئی فریب دے گا' اگر یہ احساس ہو کہ ایک ایک عمل' ایک ایک قول کی جواب دہی کرنی ہے!

واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے اخلاق و اعمال کی درستی کے لیے ایک تو آخرت کی فکر' آخرت کے یقین' جواب دہی کے احساس (The Grand Accountability) کو اور دوسرے اللہ تعالیٰ کی محبّت کو بنیاد بنایا ہے۔ اور یہ محبّت دوطرفہ ہے۔ اللہ بندوں سے محبّت کرتا ہے اور بندوں سے چاہا گیا ہے کہ اللہ سے محبّت کریں۔ یہ دوسرا پہلو میں بعد میں بیان کروں گا' پہلے یہ دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جابجا اپنی محبّت کا کس قدر ترغیب وتشویق کے انداز میں مثبت اور منفی پہلوؤں سے ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۹۵﴾ (البقرۃ) ''بے شک اللہ احسان کی روش اختیار کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے''۔ احسان کا تذکرہ دونوں معنوں میں ہوتا ہے' ایک یہ کہ لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنا اور دوسرے یہ کہ ''احسان'' مراتبِ دینیہ میں سے ایک اعلیٰ مرتبہ بھی ہے جو کہ ہماری گفتگو کے دوسرے حصّے یعنی ''اسلام کے روحانی نظام'' سے

متعلق ہے۔ اسی طرح دیگر مقامات پر ہے: ﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ۝۴﴾ (التوبۃ) ﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَہِّرِیْنَ ۝۲۲۲﴾ (البقرۃ) ﴿وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ ۝۱۴۶﴾ (آل عمران) ﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ ۝۱۵۹﴾ (آل عمران) ﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۝۹﴾ (الحجرات) یعنی اللہ کو محبوب ہیں جو تقویٰ کی روش اختیار کرنے والے ہیں' توبہ کرنے والے اور ہر طرح کی طہارت و پاکیزگی کا اہتمام کرنے والے ہیں' صبر کرنے والے ہیں' توکّل کرنے والے ہیں' عدل و انصاف پر کاربند ہیں ——— اور اس کی سب سے اونچی چوٹی یہ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّہُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝۴﴾ (الصّف)

''اللہ محبّت کرتا ہے ان بندوں سے جو جنگ کرتے ہیں اُس کی راہ میں ایسے کہ جیسے سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔''

اس میں درحقیقت سب سے بڑی تحریض اور motivation ہے کہ یہ وہ چیز ہے جو کہیں بھی جا کر ختم نہیں ہوگی' کبھی بھی انسان کا ساتھ نہیں چھوڑے گی' ہر لحظہ' ہر لمحہ' ہر منزل' ہر مرحلے پر یہ انسان کے ساتھ رہے گی۔ یہ ہے اللہ کی محبّت اور اللہ کی رضا جوئی کا جذبہ اور محاسبۂ اُخروی کا احساس۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَہَی النَّفْسَ عَنِ الْہَوٰی ۝۴۰ فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ہِیَ الْمَاْوٰی ۝۴۱﴾ (النّٰزعٰت)

''اور جو شخص (دنیا میں) اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا ہوگا اور نفس کو حرام خواہش سے روکا ہوگا' تو یقیناً جنّت اُس کا ٹھکانا ہوگی۔''

یہ ہے وہ ایمان کا جذبۂ محرکہ جو قرآن اور سُنّتِ رسول ﷺ ہمیں فراہم کرتے ہیں۔ باقی جہاں تک بنیادی انسانی اخلاقیات کا تعلق ہے ان کے ضمن میں قرآن مجید نے خود ہمیں یہ ہدایات دی ہیں کہ وہ سب انسانوں کے نزدیک جانی پہچانی حقیقتیں ہیں اور ان کے لیے انسان کسی تعلیم کا محتاج نہیں۔ ان دو باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارے لیے سیرت و کردار کی تعمیر اور تہذیبِ اخلاق کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ ایمان کی گہرائی و

گیرائی کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش کی جائے' قلب میں اس کے تخم کی آبیاری ہو اور اس کی افزائش کا اہتمام کیا جائے' اس میں اضافے کی کوشش کی جائے۔ اسی کا نام درحقیقت معرفت ہے۔ سورۃ الذّاریات میں فرمایا:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾﴾

''اور نہیں پیدا کیا مَیں نے جِنّوں اور انسانوں کو مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔''

بعض حضرات نے اس کی یہ تعبیر کی ہے کہ اِلَّا لِيَعْرِفُوْنِ (۱۴) (مگر اس لیے کہ وہ میری معرفت حاصل کریں)۔ اگر اللہ کی معرفت حاصل ہوگی' اللہ کی ہستی کا یقین ہوگا' اللہ سے ملاقات کا یقین اور امید ہوگی تو انسان کے اخلاق میں عظیم تبدیلی رونما ہو جائے گی۔ قرآن مجید اس حقیقت کی طرف بار بار توجّہ دلاتا ہے۔ سورۃ الفرقان میں ارشاد ہوا ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾﴾

''اور کہتے ہیں وہ لوگ جو ہم سے ملاقات کی امید نہیں رکھتے' کیوں نہیں آتے ہمارے پاس فرشتے یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیں! تحقیق یہ لوگ اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھ رہے ہیں اور یہ لوگ حد (انسانیت) سے بہت دُور نکل گئے ہیں۔''

جب اللہ سے ملاقات کی امید نہیں رہی تو اب نیکی کی اساس کہاں رہی؟ نیکی کا اگر شعور بھی ہے تو اس پر کاربند ہونے کا جذبہ کہاں سے لائیں گے؟ ہاں اللہ کی معرفت' اللہ کی محبّت' اللہ کا شوقِ لقاء' اللہ کے حضور میں حاضری اور اس کے سامنے جوابدہی کا خوف اور اللہ کی محبّت سے سرشار ہو کر اس سے ملاقات کا اشتیاق اگر موجود ہے تو یہ ہے وہ چیز کہ بڑے سے بڑا نقصان ہو جائے لیکن انسان سچ پر' صداقت پر' امانت پر کاربند رہے گا۔ بڑی سے بڑی تکلیف آ جائے' انسان اس سے کسی جھوٹ کے ذریعے بچنے کی کوشش نہیں کرے گا۔

اس ضمن میں آخری بات یہ عرض کروں گا کہ ایمان کو تر و تازہ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نماز جیسی عظیم ترین عبادت عطا فرمائی ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَاَقِمِ

(۱۴) امام تفسیر' حضرت مجاہدؒ سے یہ تفسیر منقول ہے۔ تفسیر بحر المحیط لابی حیان' سورۃ الذاریات۔

الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ ﴿۱۴﴾ (طٰہٰ) ''اور قائم رکھو نماز کو میری یاد کے لیے''۔ اور یہ بھی نوٹ کیجیے' سورۂ طٰہٰ میں یہ بات پہلے تو مثبت انداز میں آئی۔ اسی سلسلہ خطاب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو چل رہی ہے' انہوں نے عرض کیا: ''پروردگار! میرا سینہ کھول دے' اور میرے کام کو میرے لیے آسان کر دے' اور میری زبان کی گرہ بھی کھول دے' تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔ نیز میرے گھر والوں میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا ساتھی بنا دے.....'' جب یہ درخواست منظور ہو گئی تو پھر دوبارہ حکم دیا گیا: ﴿وَلَا تَنِیَا فِیۡ ذِکۡرِیۡ ﴿۴۲﴾﴾ (طٰہٰ) ''دیکھنا میری یاد میں تساہل سے کام نہ لینا''۔ ﴿اِذۡہَبَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّہٗ طَغٰی ﴿۴۳﴾﴾ (طٰہٰ) ''جاؤ تم دونوں فرعون کی طرف کہ وہ سرکشی پر اُتر آیا ہے۔''

اقامتِ صلوٰۃ کا حکم اسی لیے دیا گیا ہے تاکہ ایمان کا شعور بیدار ہوتا رہے۔ اس پر جو ماحول کے اثرات پڑتے رہتے ہیں وہ صاف ہوتے رہیں۔ جیسے اگر کہیں برفباری ہو رہی ہو تو بار بار ضرورت پڑتی ہے کہ جو بھی برف کے گالے پڑے ہیں ان کو صاف کیا جائے۔ اسی طرح سے انسان پر جو ماحول کے اثرات مرتّب ہوتے ہیں' جو حجابات طاری ہوتے ہیں' ان کو دور کرنے کے لیے نماز کا حکم دیا گیا۔ اس کے ساتھ جو دوسری عبادات ہیں ان کا تذکرہ دوسرے نمبر پر کروں گا' لیکن یہاں پر نماز کا تذکرہ اس اعتبار سے ہو گیا کہ ایمان ہی ہماری اصل قوتِ محرکہ (motivating force) ہے اور اس کی آبیاری کو مستحکم رکھنے کا بہترین طریقہ نماز ہے۔ اس حوالے سے مجھے حفیظ جالندھری کا یہ شعر بہت پسند ہے:؎

سرکشی نے کر دیے دھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں لوحِ جبیں تازہ کریں!

ہمارا جو نفسِ عبدیت ہے یہ ماحول کے اثرات سے کچھ غبار آلود ہو جاتا ہے' اس کے اندر استکبار اور سرکشی کے جذبات سر اٹھاتے ہیں' جن کی اصلاح کے لیے نماز بہترین عمل ہے۔ یہ گویا تجدیدِ ایمان کا ایک ذریعہ ہے۔

اب مَیں اپنے موضوع کے دوسرے حصّے کی طرف آ رہا ہوں اور وہ ہے ''اسلام کا روحانی نظام!''

(حصّہ دوم)

اسلام کا روحانی نظام

''اسلام کا اخلاقی نظام'' اور ''اسلام کا روحانی نظام'' کے حوالے سے مَیں عرض کر چکا ہوں کہ یہ ایک ہی مضمون کی دو سطحیں (levels) ہیں۔ مؤخّر الذکر کو چاہے بلند تر کہہ لیں چاہے عمیق تر کہہ لیں' یہ دونوں باتیں لازم وملزوم ہیں۔ جو عمارت جتنی بلند آپ کو اٹھانی ہے اس کی بنیاد اتنی ہی گہری کرنی ہوگی۔ ایک ہی منزل کی عمارت ہے تو اتنی گہرائی کی ضرورت نہیں' دو منزلیں اٹھانی ہیں تو بنیاد اور گہری کرنی ہوگی اور کثیر المنزلہ عمارت اٹھانی ہے تو اس کے لیے اور گہری بنیاد لے جانی ہوگی۔ یوں سمجھئے کہ اخلاق کا معاملہ ایک ابتدائی درجہ ہے' لیکن روحانیت' روحانی تعلیمات اور اس کی فکری اساسات ایک عمیق تر درجہ کی غمازی کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ بلندی بھی لیے ہوئے ہیں۔ یہ اس دور کی بہت بڑی محرومی ہے کہ بعض اسباب کی بنا پر یہ موضوع بہت بدنام ہو چکا ہے' لوگوں کے ذہنوں میں اس سے بہت بُعد پیدا ہو چکا ہے اور حجابات طاری ہو چکے ہیں۔ لفظِ تصوّف بعض حلقوں میں تو گالی بن کر رہ گیا ہے۔ بعض اچھے بھلے دینی حلقے بھی اس سے مناسبت نہیں رکھتے۔ زیادہ قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ جو لوگ مذہبی اعتبار سے فعّال ہیں' کچھ کام کر رہے ہیں' اپنی سمجھ اور اپنی سوچ کے مطابق دینی خدمتوں میں لگے ہوئے ہیں' بعض اسباب سے ان کے ہاں تصوّف پر مغائرت کا پردہ حائل ہو چکا ہے اور نہ صرف اہمیت کی نفی ہے بلکہ شدّت سے انکار ہے۔ اور بعض حضرات تو تصوّف کو دین کی تعلیمات کے منافی قرار دے رہے ہیں۔ اس کے دو اسباب ہیں۔

پہلا سبب جو وسیع تر ہے اس کی جہتیں (dimensions) آفاقی (universal) ہیں اور اس نے پورے کُرّۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ ایک مادّی فکر (materialistic thought) ہے جو اس وقت چھا گیا ہے۔ یوں سمجھئے جیسے فضا میں معلّق گرد وغبار (dust suspension) ہو تو پھر ہر شخص مجبور ہوتا ہے کہ وہ اسے inhale

کرے۔ جب وہ سانس لے گا تو گرد لامحالہ اس کے پھیپھڑوں میں جائے گی۔ اسی طرح ہماری فضا کے اندر مادّہ پرستی' مادّی اخلاق' مادّی سوچ' مادّی اقدار ماحول کے اندر اس طرح موجود ہیں کہ ہمارے وجود میں' کسی کے کم کسی کے زیادہ' سرایت کر گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ روح کے کسی جُداگانہ تشخّص کا سرے سے انکار ہے اور عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ روح اور جان (life and spirit) گویا دو ہم معنی الفاظ ہیں۔ روح کا کوئی جداگانہ اور آزادانہ (independent) تشخص بھی ہے —اس کا بہت کم لوگ اقرار کرتے ہیں۔

مغربی فکر کے غلبہ اور استیلاء کے ساتھ ساتھ تصوّف سے بُعد کا دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ روحانیت اور روحانی تعلیمات کے لیے جو لفظ بطورِ عنوان اختیار کرلیا گیا یعنی ''تصوّف'' یہ درحقیقت ایسا ہی ہے جیسے کبھی مشرقی پاکستان میں ''باہری'' کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا' یعنی باہر سے آئے ہوئے لوگ۔ تصوّف باہری اصطلاح ہے' یہ قرآن کی اصطلاح نہیں ہے۔ پھر ایک اعتبار سے مجہول النسب ہے' یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا مادّہ کیا ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ چونکہ صوفیہ اپنے آپ کو مشقّت میں ڈالنے کے لیے اُون کے کپڑے پہنتے تھے' لہٰذا یہ لفظ 'صُوف' سے بنا ہے۔ بعض نے اسے 'صفا' سے مشتق قرار دینے کی کوشش کی ہے' لیکن کوئی محقّق یقینی بات نہیں کہہ سکا۔ زیادہ تر اس خیال کا اظہار کیا جاتا ہے کہ یہ یونانی اصطلاح Theosophy سے بنا ہے۔ یونانی فلسفے کے زیر اثر یہ لفظ وہاں سے آیا ہے جس نے تصوّف کی شکل اختیار کرلی —— واللہ اعلم۔ پھر رفتہ رفتہ یہ لفظ تصوّف نہ صرف دین کی اصل اصطلاح ''احسان'' کا قائم مقام بن گیا' بلکہ اس نے ''احسان'' کو بالکل ناک آؤٹ کر دیا۔ قرآن و حدیث کی اصل اصطلاح احسان ہے' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۝﴾ ''اور اللہ احسان کی روش اختیار کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔''

تصوّف یا احسان؟

حدیثِ جبریلؑ میں درحقیقت ہماری مذہبی زندگی کے تین درجات (levels) کو معیّن کیا گیا ہے۔ پہلا درجہ اسلام ہے' اس سے اونچا درجہ ایمان اور اس سے اونچا درجہ

احسان ہے۔ حدیثِ جبریل کو ''اُمّ السُّنَّة'' قرار دیا گیا ہے اور یہ حدیث کی مختلف کتابوں میں مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے۔ یہ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور صحیح مسلم میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے الفاظ کے فرق کے ساتھ وارد ہوئی ہے۔ صحیح بخاری کی روایت ملاحظہ فرمایئے:

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ النَّبِیُّ ﷺ بَارِزًا یَوْمًا لِلنَّاسِ، فَاَتَاهُ جِبْرِیْلُ، فَقَالَ: مَا الْاِیْمَانُ؟ قَالَ: ((اَلْاِیْمَانُ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَبِلِقَائِهٖ وَرُسُلِهٖ وَتُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ)) قَالَ: مَا الْاِسْلَامُ؟ قَالَ: ((اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكَ بِهٖ شَیْئًا، وَتُقِیْمَ الصَّلَاةَ، وَتُؤَدِّیَ الزَّكَاةَ الْمَفْرُوْضَةَ، وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ)) قَالَ: مَا الْاِحْسَانُ؟ قَالَ: ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ، فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ یَرَاكَ...)) (۱۵)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ ایک دن نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں میں بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور پوچھنے لگے: ایمان کسے کہتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''ایمان یہ ہے کہ تُو اللہ کا، اور اُس کے فرشتوں کا، اور اُس سے ملنے کا، اور اُس کے پیغمبروں کا یقین کرے، اور مر کر جی اٹھنے کو مانے''۔ انہوں نے پوچھا کہ اسلام کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اسلام یہ ہے کہ تُو اللہ کی عبادت اس طرح کرے کہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے، اور نماز کو قائم کرے، اور زکوٰۃ ادا کرے، اور رمضان کے روزے رکھے''۔ اُس نے پوچھا کہ احسان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''احسان یہ ہے کہ تُو اللہ کی ایسی عبادت کرے جیسے کہ تُو اُسے دیکھ رہا ہے، اور اگر یہ نہ ہو سکے تو وہ تو تجھے دیکھ ہی رہا ہے.....''

قرآن حکیم میں سورۃ المائدۃ کی آیت ۹۳ بعض اعتبارات سے مشکل بھی ہے اور بہت کم حضرات نے اس کے مضمرات پر توجّہ کی ہے۔ شراب کی حرمت کی جب آخری آیت نازل ہوگئی تو پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں تشویش پیدا ہوئی کہ اب تک ہم پیتے

(۱۵) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب سؤال جبریل النبی ﷺ

رہے' یہ چیز اگر نجس ہے' مُضِر ہے' تو اس کے اثرات تو ہمارے وجود میں شامل ہو چکے ہیں۔ اسی طرح جو حضرات حرمت کے آخری یا حتمی حکم کے آنے سے پہلے فوت ہو چکے ان کا کیا ہوگا؟ اور جو اس دوران فوت ہو گئے ان کو توبہ کا موقع نہیں ملا' ان کا کیا ہوگا؟ (یہی تشویش تحویلِ قبلہ کے موقع پر بھی ہوئی تھی کہ ہماری سولہ مہینے کی نمازیں کس حساب میں درج ہوں گی؟ وہ تو قبلہ نہیں تھا' قبلہ تو اصل یہ بیت اللہ تھا' تو ہماری سولہ مہینے کی نمازیں کیا ضائع ہو جائیں گی؟) جس طرح وہاں تسلّی کرائی گئی تھی اسی طرح اس معاملے میں قرآنِ حکیم میں اہلِ ایمان کی تسلّی کرائی گی:

﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٩٣﴾﴾ (المائدۃ)

''جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے اُن پر کچھ گناہ نہیں اُس میں جو وہ پہلے کھا پی چکے' جب کہ انہوں نے تقویٰ کی روش اختیار کی اور ایمان لائے اور نیک اعمال کیے' پھر تقویٰ اختیار کیا اور ایمان لائے' پھر تقویٰ اختیار کیا اور درجۂ احسان پر عمل کیا۔ اور اللہ دوست رکھتا ہے ایسے محسنین کو۔''

تحویلِ قبلہ کے حوالہ سے سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا تھا:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٤٣﴾﴾

''اور اللہ ایسا نہیں کہ ضائع کر دے تمہارا ایمان (نماز)۔ بے شک اللہ لوگوں پر بڑی شفقت رکھنے والا اور مہربان ہے۔''

جب اُس جانب رُخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم تھا تو رخ اُس طرف کر لیا' اور اب اِس جانب کا حکم ہے' چنانچہ اِدھر رُخ کر کے نمازیں ادا کی جائیں گی۔ اسی طرح جب شراب کی حرمت کا آخری حکم آ گیا تو اس تشویش کو رفع کرنے کے لیے یہ آیتِ مبارکہ نازل ہوئی۔ اس میں واضح کر دیا گیا کہ وہ لوگ جو ایمان کے عملی تقاضوں کو پورا کرتے رہے' نیک کام کرتے رہے' ان پر کوئی حرج نہیں ہے جو کچھ بھی وہ پہلے کھا پی گئے۔ کسی شے کے آخری حکم کے نزول سے پہلے جو بھی ان کا عمل رہا ہے' جو چیزیں استعمال کی ہیں' ان پر کوئی الزام نہیں۔

اس آیت میں تقویٰ کے تین درجے بیان ہوئے ہیں۔ تقویٰ گویا اس میں moving force یعنی آگے بڑھانے والی قوت ہے' جو انسان کو نیکی پر ابھارتی ہے۔ تقویٰ نے ان کے ایمان اور عملِ صالح میں ایک خاص رنگ پیدا کر دیا۔ پھر ان میں مزید تقویٰ پیدا ہوا تو ان کا ایمان اس قانونی ایمان سے بڑھ کر یقینِ قلبی پر مبنی حقیقی ایمان بن گیا۔ پھر ان کے تقویٰ نے ان کو اگلے مرحلہ تک پہنچایا جو مرحلۂ احسان ہے۔ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ... اور احسان کا درجہ تو محبوبیتِ خداوندی کا مقام ہے۔

تصوّف کے لفظ نے ''احسان'' کی اصطلاح کو ہمارے دینی لٹریچر سے بالکل خارج کر دیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی کتاب کا عنوان ہے ''مقالاتِ احسانی''۔ لیکن عام آدمی احسان کے اصل معنی جانتا ہی نہیں۔ اچھے بھلے پڑھے لکھے لوگوں کو معلوم نہیں کہ احسان کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ لوگوں کے ساتھ نیکی کا معاملہ کرنا چاہیے۔ بس یہ تصوّر سامنے ہے۔ جیسے ایک قاعدہ ہے کہ جہاں کوئی بدعت آئے گی سُنّت وہاں سے رخصت ہو جائے گی' بدعت کسی نہ کسی جگہ سے سُنّت کو displace کر کے اپنی جگہ بناتی ہے' اسی طرح تصوّف کی اصطلاح اس طرح چھا گئی کہ اس نے ہمارے شعور' ہماری فکر اور ہماری زبانوں سے لفظ احسان کو خارج کر دیا۔

مزید برآں بعض چوٹی کے فلسفیانہ مباحث' جیسے ماہیتِ وجود' ماہیتِ زمان وغیرہ' جو مابعد الطبیعیات (Mata physics) کے مشکل مسائل ہیں' صوفیاء کے ہاں زیر بحث رہے ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے جو بڑے صوفیاء گزرے ہیں جو تصوّف کے امام تھے' وہی بہت بڑے فلسفی بھی تھے۔ اس دور کے ایک بہت بڑے مصنّف اور مؤلّف جو کہ تصوّف کے شدید مخالف ہیں' ایک مرتبہ میری ان سے گفتگو ہو رہی تھی تو انہوں نے تسلیم کیا کہ اسلام کے اصل فلسفی صوفیاء ہی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ فلسفہ بلند ترین منزل پر انہی صوفیاء کرام کے ہاں نظر آتا ہے۔ چنانچہ بدقسمتی سے بعض فلسفیانہ مباحث بھی تصوّف کا جزوِ لازم بن گئے ہیں۔ جیسے وحدت الوجود اور وحدت الشّہود درحقیقت ایک فلسفہ ہے اور اس کا اصل میں ''احسان'' سے کوئی تعلق نہیں' لیکن چونکہ فلاسفہ اور حکماء وہی صوفیاء ہیں لہٰذا یہ خلطِ مبحث

پیدا ہوا۔ چنانچہ جن لوگوں کو فلسفہ کے پیچیدہ اور عمیق مباحث سے ذہنی مناسبت نہیں ہے انہوں نے فلسفہ اور تصوّف کو گڈمڈ کر کے دونوں کا انکار کر دیا۔ یہ مختلف اسباب ہیں جن کی بنا پر اسلام کی روحانی تعلیمات کا ایک عرض (dimension) ہمارے ذہنوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ چونکہ اس دور میں فضا سائنسی عقلیت پسندی کی ہے کہ جو شے دیکھی جا سکتی ہو' محسوس کی جا سکتی ہو' چھوئی جا سکتی ہو' جو ہمارے حواس کی گرفت میں آ سکتی ہو' جس کی ہم توثیق کر سکتے ہوں کہ ایسا ہوا ہے یا نہیں' جو ہمارے تجرباتی دائرے کے اندر آ رہی ہو' بس توجہ اور دلچسپی اور بحث و تمحیص اسی کے بارے میں ہوتی ہے' لہٰذا ان تمام اسباب نے مل جل کر یہ نتیجہ نکالا کہ دین کی تعلیم کا یہ اہم ترین شعبہ جو بعض اعتبارات سے اصل لُبِّ لُباب اور اصل مقصود قرار دیا جا سکتا ہے' اس دور میں ہماری نظروں سے اوجھل ہو رہا ہے۔

دین کی روحانی تعلیمات اور احیائی تحریکیں

اس دور میں جو احیائی تحریکیں پے در پے ناکامیوں سے دوچار ہو رہی ہیں' میرے نزدیک اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ ایمان کی وہ منزل یا ایمان کا وہ درجہ جس میں ایمان یقین کو پہنچ جائے' وہ ایک burning faith اور ایک living faith کی شکل اختیار کر لے اور اس کی حرارت انسان کو اپنے باطن میں محسوس ہو' یہ کیفیت نہیں ہے۔ بلکہ کچھ قیل و قال' کچھ فلسفیانہ و متکلمانہ گفتگو اور کچھ دلیل و استدلال سے کوئی بات ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں کچھ آگے چلتے بھی ہیں تو تھوڑی دیر میں ہمت جواب دے جاتی ہے۔ وہ استقامت جو محبّتِ خداوندی سے پیدا ہوتی ہے' غیر موجود ہے۔ اگر پاؤں وہاں جمے ہوئے نہیں ہیں تو استقامت ممکن نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝۳۰﴾ (حٰمٓ السجدۃ)

''بلاشبہ جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے' پھر اس پر جم گئے ایسے لوگوں پر فرشتے نازل ہوتے ہیں (اس بشارت کے ساتھ) کہ نہ خوف کرو اور نہ غمگین ہو اور جنّت کی بشارت پاؤ جس کا کہ تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔''

اگر یہ استقامت نہ ہوگی تو دائیں بائیں سے کسی راہِ یسیر (short cut) کی تلاش ہوگی اور فوری نتیجہ برآمد کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ جو احیائی تحریکیں پے بہ پے ناکامیوں سے دوچار ہو رہی ہیں اس کا جب آپ گہرائی میں تجزیہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ مسئلہ وہی ہے جو مَیں عرض کر چکا ہوں۔ انسان کی حقیقت کو اگر نہیں سمجھا جیسا کہ قرآن میں بیان ہوئی ہے تو اسلام کے روحانی نظام کو سمجھنا ممکن نہیں۔ اگرچہ وہ بطرزِ جلی بیان نہیں ہوئی' لیکن وہ لوگ جو اشارات سمجھنے کی استعداد رکھتے ہیں انہوں نے اسے سمجھا ہے اور بیان کیا ہے۔ انسان کا وجود مرکب وجود ہے' ایک اس کا حیوانی وجود ہے جو اس کے جسدِ خاکی اور اس کی جان کا مجموعہ ہے' جبکہ ایک اس کا روحانی وجود ہے جو اس کی روح پر مشتمل ہے۔ دونوں کا علیحدہ آزاد (independent) تشخّص ہے' دونوں اپنے اپنے تقاضے رکھتے ہیں اور یہ تقاضے بہت حد تک ایک دوسرے سے متصادم اور متضاد ہیں۔ دونوں کے رجحانات میں بُعد المشرقین ہے' ایک اِدھر کھینچتا ہے تو دوسرا اُدھر کھینچتا ہے۔ ایک کا رُخ پستی کی طرف ہے تو دوسرے کا رُخ بلندی کی طرف ہے۔ ایک کا مبدأ (origin) ہی بلندی ہے اور دوسرا وہ ہے کہ جس کا وجود خاک سے قائم ہوا ہے۔ اس اعتبار سے اگر اس حقیقت کو نہیں جانا جائے گا تو روحانی تعلیمات اور روحانی نظام کا سمجھنا قطعاً محال اور ناممکن ہے۔

یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ صرف نبی کی تعلیمات کامل ہوتی ہیں' باقی جو بھی دین کے مصلحین' مفکّرین اور اصحابِ علم ہیں ان کا علم وفکر درجہ بہ درجہ ترقی کرتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿١٩﴾﴾ (الانشقاق) ''تم لازماً سیڑھی بہ سیڑھی چڑھو گے''۔ چنانچہ ہمارے ہاں بھی اسلامی مفکّرین سے ایک خطا ہوئی۔ یہ بات تو واضح رہی کہ ایک اسلامی ریاست ایک ٹھیٹھ اسلامی تحریک کے نتیجے میں قائم ہوسکتی ہے' لیکن اس بات کا شعور کہ اس اسلامی تحریک کے افرادِ کار کے اندر ایمان کی ایک خاص گہرائی اور گیرائی درکار ہے' اس نکتہ کے حوالے سے کوتاہی محسوس ہوتی ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں اسلام ایک موروثی عقیدہ ہے' ہم پیدائشی طور پر مسلمان ہیں' مگر ایمانِ حقیقی کی وہ صورت کہ ہر شے میں اللہ ہی فاعلِ حقیقی نظر آئے' شاذ ہے۔

اکبرالٰہ آبادی نے کہا تھا ؎

تُو خاک میں مل اور آگ میں جل، جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر تعمیر نہ کر، بنیاد نہ رکھ!

چنانچہ ایمان کی بنیادیں مستحکم کیجیے۔ ایک زندہ یقین جو تحریک اسلامی کے کارکنوں کے وجود میں سرایت کیے ہوئے ہو ایسا ایمان درکار ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان کی شدّت (intensity) ایمان بالشہود کی مانند تھی، جیسا کہ حدیث میں ایک صحابی (حارث بن مالک رضی اللہ عنہ) کا قول آتا ہے: وَلَكَاَنِّي اَنْظُرُ اِلٰى اَهْلِ الْجَنَّةِ ... وَلَكَاَنِّي اَسْمَعُ عُوَاءَ اَهْلِ النَّارِ(۱۶) ''گویا میں اہلِ جنّت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، اور گویا میں جہنمیوں کی چیخ وپکار سن رہا ہوں''۔ جب تک یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی اور اسلامی تحریک کے کارکنوں کی معتدبہ تعداد کی تربیت اس انداز میں نہیں ہوتی بظاہر احوال کامیابی کا کوئی تصوّر ممکن نہیں۔

یہاں مَیں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے چند جملے نقل کر رہا ہوں جو قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ریڈیو پاکستان پر نشر ہونے والی تقاریر سے ماخوذ ہیں:

> ''فلسفہ ومذہب کی دنیا میں عام طور پر جو تخیل کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ روح اور جسم ایک دوسرے کی ضد ہیں، دونوں کا عالَم جدا ہے، دونوں کے تقاضے الگ ہیں بلکہ باہم مخالف ہیں..... اسلام کا نقطۂ نظر اس معاملے میں دنیا کے تمام مذہبی اور فلسفیانہ نظاموں سے مختلف ہے.....''

ان جملوں کے بعد مولانا مرحوم نے اس نقطۂ نظر کی پُرزور نفی کی ہے اور اس ثنویت کا انکار کیا ہے۔ میرے نزدیک یہی وہ فکر کی کوتاہی ہے جس کی بنا پر اسلام کی روحانی تعلیمات اور اس کے روحانی نظام سے نگاہیں بالکل محجوب ہو کر رہ جاتی ہیں۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ یہ صرف مولانا مودودیؒ کا جملہ نہیں ہے بلکہ ایک خاص دور کے طرزِ فکر کا عکّاس ہے۔ مولانا اصلاحی صاحب تو تصوّف کے شدید مخالف ہیں۔ ان کے الفاظ تو یہ ہیں کہ ''مَیں تصوّف کو سراسر ضلالت سمجھتا ہوں''۔ اس سے آگے کی بات آپ کو سرسید احمد خان، ان کے متبعین،

---

(۱۶) الایمان لابن ابی شیبة، کیف اصبحتَ یا حارث بن مالک؟ قال: اصبحتُ مؤمنًا...

پھر غلام احمد پرویز اور علّامہ مشرقی کے ہاں مِل جائے گی۔ یہ تمام وہ مکاتبِ فکر ہیں جنہوں نے دین پر بطور ''نظامِ زندگی'' غور وفکر کیا ہے اور غلطیوں اور کوتاہیوں سے دوچار ہوئے ہیں۔ کم از کم مولانا مودودیؒ کے بارے میں مَیں یہ عرض کر سکتا ہوں کہ بحیثیتِ مجموعی ان کا مطالعہ بہت درست ہے' خصوصیت کے ساتھ اسلام کے کامل نظامِ حیات ہونے کے حوالے سے میری دیانت دارانہ رائے ہے کہ انہوں نے سیاسی اور معاشرتی نظام میں بہت صحیح تعبیر کی ہے اور اس کی بہت عمدہ تشریح وتوضیح کی ہے۔ لیکن اصل کمی رہ گئی ہے دین کے باطنی پہلو کے حوالے سے جو دین کے ثمرات ہیں' جس کے لیے ہم ''روحانی نظام'' کا لفظ استعمال کر رہے ہیں' اس سے بُعد ہے' دُوری ہے اور بعض حالات میں اس کا انکار ہے۔

انسان ایک مرکّب وجود ہے!

اس کے برعکس اصل حقیقت یہ ہے کہ انسان کا وجود ایک مرکب وجود ہے۔ اس کا ایک وجود' جسدِ خاکی' مٹّی سے بنا ہے —— اس کی تخلیق کا طریق کار کچھ بھی ہو یہ ایک الگ بحث ہے —— اور اس کے اندر ایک روح ہے' جس کا تعلق اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے قرار دیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ.....﴾ (الحجر:۲۹) ''اور جب مَیں پھونک دوں اس میں اپنی روح میں سے.....'' یہی مضمون انہی الفاظ کے ساتھ سورۂ صٓ (آیت ۷۲) میں بھی آیا ہے۔ اس کی ہم تفصیلی توجیہہ نہیں کر سکتے کہ اس کا مفہوم کیا ہے' لیکن بہر حال اس کا possesive mode ہے۔ انسان اور اس کے خالق کے مابین جو محبّت ہے اُس کا ایک رخ ہے اللہ کا محبّت کرنا بندوں کے ساتھ' اور دوسرا رُخ ہے انسان کا محبّت کرنا اللہ کے ساتھ۔ یہ دوسرا رخ اس روحانی نظام کا اصل موضوع ہے۔ ہمارے وجود کے چونکہ دو پہلو ہیں' لہٰذا ہمارے اندر محبّتیں بھی دو ہیں۔ ایک محبّت ہے ''حُبُّ الشّھوٰت'' جیسا کہ سورۂ آلِ عمران میں فرما دیا گیا:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾﴾

''لوگوں کے لیے شہوانی خواہشات' عورتیں' بیٹے' سونے چاندی کے ڈھیر' نشان زدہ گھوڑے' مویشی اور کھیتی مزیّن کر دیے گئے ہیں۔ یہ سب کچھ دنیا کی زندگی کا سامان ہے' جبکہ حقیقت میں بہتر ٹھکانہ تو اللہ ہی کے پاس ہے۔''

ان تمام چیزوں کی محبّت انسان کے اندر موجود ہے اور یہ اس کے لیے مزیّن کر دی گئی ہیں۔ لیکن یہ ہمارے کون سے جزو کا حصّہ ہیں؟ یہ ہمارے اس حیوانی وجود کی محبّت ہے۔ یہ اس وجود کے تقاضے اور اس کے تسلسل کے ذرائع ہیں۔ اگر یہ محبّت نہ ہو تو یہ دنیا کا ہنگامہ' یہاں کی رونقیں ختم ہو کر رہ جائیں۔ یہ محبتیں بڑی قوی ہیں' بڑی شدید ہیں' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝۸﴾ (العادیات) ''اور یقیناً وہ (انسان) مال و دولت کی محبّت میں بہت شدید ہے۔'' اس کی وجہ سے ساری تمدن کی رونق ہے' گہما گہمی ہے' بھاگ دوڑ ہے۔ یہ سارا معاملہ ان محبتوں پر قائم ہے۔ جہاں تک ہماری روح اور ہمارے روحانی وجود کا تعلق ہے اس کے اندر بھی ایک محبّت ہے' لیکن وہ محبّت دبی ہوئی ہے' اس کا ہمیں شعور نہیں ہے' اسے ہم بھلائے بیٹھے ہیں۔ آیت مبارکہ ہے:

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۱۹﴾ (الحشر)

''اور ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے ان کو اپنے آپ سے غافل کر دیا۔ یہی لوگ ہیں جو نافرمان ہیں۔''

اپنے آپ سے غافل ہونا اپنے اس روحانی وجود سے غافل ہونا ہے جو اصل انسان ہے' جس کی بنا پر یہ شرف حاصل ہوا کہ انسان مسجودِ ملائک بنا' اسے خلافت میسّر آئی' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝۷۰﴾ (بنی اسراءیل)

''اور ہم نے عزّت دی آدم کی اولاد کو' اور سواری دی ان کو جنگل اور دریا میں' اور روزی دی ہم نے ان کو ستھری چیزوں سے' اور بڑھا دیا ان کو بہتوں سے جن کو پیدا کیا ہم نے بڑائی دے کر۔''

اس اصل وجود کی جانب سے ذہول ہے اور آج کا جدید فکر اس وجود کا انکار کر رہا ہے۔ ہمارے روحانی وجود کی بھی ایک محبّت ہے' لیکن یہ محبّت اللہ کی محبّت سے عبارت ہے۔ اس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک خاص تعلق و ربط ہے جسے ہم سمجھ نہیں سکتے۔ مولانا رومیؒ نے بڑے پیارے انداز میں ایک شعر میں کہا ہے ؎

اتّصالے بے تکیّف بے قیاس

ہست ربّ النّاس را باجانِ ناس (۱۷)

یہ ایک ایسا اتّصال اور ایسا قُرب ہے جسے ہم کسی شے پر قیاس نہیں کر سکتے' اسے ہم کسی مثال سے سمجھ بھی نہیں سکتے۔ اتّصال ہے' قرب ہے' انتہائی قرب ہے کہ اس سے زیادہ قرب کا تصوّر ممکن نہیں۔ اس روحانی وجود کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا گہرا تعلق اور بڑا گہرا رشتہ ہے۔ ہر انسان خود اپنے اندر محسوس کرتا ہے کہ اندر ایک خیر و شر کی کشمکش برپا ہے۔ کوئی شے اندر سے کھینچتی ہے بُرائی کی طرف اور کوئی شے اندر ہے جو مجھے بُرائی پر ملامت کرتی ہے اور مجھے خیر کی طرف کھینچتی ہے۔ اگر آپ کے پاس ایک ہی روٹی ہے' کچھ اور نہیں ہے اور کوئی سائل آ گیا تو آپ کے اندر ایک کشمکش ہوگی۔ کوئی قوت کہے گی کہ یہ روٹی اپنے پاس رکھو' یہ تو تمہاری ضرورت کو بھی کفایت نہیں کر رہی' دوسرے کو حصّہ دار بنانے کا کوئی سوال نہیں۔ لیکن کوئی شے اندر ہی اندر آپ کو راغب کرے گی کہ نہیں اس کے پاس ایک بھی روٹی نہیں ہے' اس کو بالکل فاقہ ہو جائے گا' مجھے چاہیے کہ مَیں اپنی روٹی میں اس کو شریک کروں۔ یہ ایک کشمکش ہے جو ہر انسان کا ہر وقت کا تجربہ ہے' ہر ایک کا ذاتی احساس ہے' جسے ہر شخص اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ یہ دو قوتیں ہیں جو اندر سے کھینچ رہی ہیں۔ یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیے' جیسا کہ اقبال نے کہا ہے ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز

چراغِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شرارِ بولہبی!

---

(۱۷) ''یہ ایسا اتّصال ہے کہ اس کی کیفیت نامعلوم ہے اور اسے کسی پر قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا..... ہاں مگر باری تعالیٰ انسانوں کی ارواح کے ساتھ ہے۔''

تاریخ میں جو خیر و شر نظر آ رہا ہے انسان کے باطنی خیر و شر کا مظہر ہے۔ اس حوالے سے جدید ماہرینِ نفسیات کے کام کا مطالعہ بھی مفید ہے۔ فرائڈ کے بعد نفسیاتِ جدیدہ کے میدان میں کئی نظریات آئے مگر آج بھی اس کے نظریات کو مانا جاتا ہے۔ گویا وہ نفسیاتِ جدیدہ کا باوا آدم ہے۔ فرائڈ نے بڑی وضاحت کے ساتھ انسانی شخصیت کے تین levels متعین کیے ہیں۔ اس کے نزدیک ایک id اور libido ہے' جسے ہم حیوانی داعیات (animal instincts) سے تعبیر کر سکتے ہیں' جو انسان کے اندر سفلی پہلو کا تقاضا بن کر اُبھرتے ہیں۔ صحتِ مشاہدہ سے فرائڈ یہاں تک پہنچ گیا جس کا تذکرہ قرآن میں بایں الفاظ آتا ہے: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ﴾ (یوسف:۵۳) ''یقیناً نفس (انسان کا حیوانی وجود) برائی کا حکم دیتا ہے''۔ اسے تو اپنی غرض ہے' اپنا پیٹ بھرنے سے دلچسپی ہے' اسے کوئی غرض نہیں کہ حلال ہے یا حرام ہے۔ اسے اس سے کوئی بحث نہیں کہ دوسرے کا پیٹ خالی ہے یا بھرا ہوا ہے۔ اس کے اندر جنسی جذبہ رکھا گیا ہے جو بڑا مُنہ زور ہے۔ یہ اپنی تسکین چاہتا ہے' اسے اس سے بحث نہیں ہے کہ حلال راستہ کون سا ہے اور حرام کون سا ہے۔ اس کے اندر ''حُبِّ تفوق'' (urge to dominate) بھی پائی جاتی ہے' جس کے لیے یہ حلال اور حرام' صحیح اور غلط (fair and foul) کی تمیز بھلا بیٹھتا ہے۔ اسی وجہ سے فرائڈ نفسِ امّارہ کے لیے id and libido کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ اس کے اوپر ایک انسانی شخصیت ہے' حقیقت باطنی ہے' اس کی انا یا خودی (ego) ہے۔ پھر بلند ترین درجے میں اس کی فوق انا یا ماورا خودی (super ego) ہے۔ چنانچہ خیر و شر کی کشمکش انسان کے دونوں وجودوں کے مابین جاری ہے۔ ایک اس کا روحانی وجود ہے اور ایک حیوانی وجود ہے۔ حیوانی وجود خاکیٔ الاصل ہے' جب کہ روحانی وجود کا مبدأ وہ ہے جو ملائکہ کے ہم پلّہ ہے' بلکہ ملائکہ سے بھی افضل ہے۔ اس لیے کہ ملائکہ کو تو انسان کے سامنے سجدہ ریز کر دیا گیا۔

انسان کے اندر جو دو وجود ہیں' دونوں کے تقاضے مختلف ہیں۔ آج شاید اس بات کا مذاق اڑایا جا رہا ہے' لیکن اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اس روح کے لیے جسدِ حیوانی درحقیقت

قید خانہ ہے۔ جسد پر روح کا غلبہ ہو جائے تو پھر پوری دنیا بندۂ مؤمن کے لیے قید خانہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وہ بات ہے جو نبی مکرم ﷺ نے صراحتاً فرمائی ہے: ((اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّۃُ الْکَافِرِ)) (۱۸) ''دنیا مؤمن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنّت کی مانند ہے''۔ روح ہمارے حیوانی وجود کے پنجرے میں قید ہے اور اپنے ربّ کی طرف رجوع کرنا چاہتی ہے۔ اس کا میلان ربّ کی طرف ہے' اسے اگر تسکین حاصل ہوتی ہے تو ذکرِ ربّ سے ہوتی ہے' اسے اگر انشراح ہوتا ہے تو معرفتِ ربّ سے ہوتا ہے۔ وہ ایک دہکتی ہوئی بھٹی ہے جس کے اندر محبّتِ خداوندی جوش مار رہی ہے۔ مَیں جان بوجھ کر لفظِ عشق استعمال نہیں کر رہا' اس لیے کہ یہ لفظ قرآن وسُنّت میں استعمال نہیں ہوا' فارسی شاعری میں آیا ہے۔ اس کا مفہوم درست ہے' لیکن ہمیں چاہیے کہ ہم ان اصطلاحات کی طرف رجوع کریں جو کتاب وسُنّت میں آئی ہیں۔ نئے الفاظ جب بھی آئیں گے اضافی مفہوم لے کر آئیں گے' تاہم عارضی طور پر نئی اصطلاحات کا استعمال ناگزیر ہے۔ ہر دور میں جو ذہنی صُغریٰ کُبریٰ بنتا ہے وہ اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ ذہنی رابطے اور ابلاغ (communication) کے لیے جدید اصطلاحات کا استعمال کیا جائے۔ لیکن ان کو مستقلاً اختیار نہیں کرنا چاہیے۔

لفظِ عشق مولانا رومؒ نے استعمال کیا ہے۔ اسی طرح دورِ حاضر میں رومیٔ ثانی علّامہ اقبال نے بھی یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ جب کہ قرآن وسُنّت لفظ محبّت استعمال کرتے ہیں۔ بہرکیف محبّتِ خداوندی کی ایک آگ روح کے اندر ہے۔ اکثر و بیشتر انسانوں کا حیوانی وجود اس روح کو دبائے ہوئے ہوتا ہے' چنانچہ اس کے بھاری بوجھ تلے یہ روح سسکتی رہتی ہے' تڑپتی ہے' بے چینی محسوس کرتی ہے' لیکن ہمارے جسم کے تقاضے' بطن وفرج کے تقاضے' ہماری شہوات' ہمارے اوپر اس طرح مسلّط ہیں اور ان ہی پر ہماری توجّہ اتنی مرکوز ہے' ان کے لیے ہماری بھاگ دوڑ اس شدّت کے ساتھ ہو رہی ہے کہ اپنے دوسرے وجود

---

(۱۸) شعب الایمان للبیھقی' التاسع والثلاثون من شعب الایمان وھو باب فی المطاعم ... الفصل الثانی فی ذم کثرۃ الاکل۔

کی طرف توجّہ ہی نہیں ہوتی ۔ وہ ایک طرح سے بالکل نظر انداز (ignore) ہو کر ایک طرف تڑپتی رہتی ہے' ایک عرصہ تک بے چین رہتی ہے' مگر بالآخر ہوتا یہ ہے کہ روح گویا اس مادّی وجود کے اندر دفن ہو کر رہ جاتی ہے اور یہ چلتا پھرتا انسان اس روح کے لیے مقبرہ بن جاتا ہے' بلکہ اس کے لیے لفظ ''تعزیہ'' استعمال کر لیجیے۔ اس لیے کہ تعزیہ چلتا ہے' مقبرہ کسی ایک جگہ پر کھڑا رہتا ہے۔ یہ انسان بروحانی طور پر مر چکا ہے' اس کی روح دفن ہو چکی ہے۔

جن آیات کا مَیں نے شروع میں حوالہ دیا تھا' اب ان پر غور کر لیجیے:

﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝٧ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝٨ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝٩ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝١٠﴾ (الشمس)

''اور قسم ہے نفس کی اور جیسا کہ اُسے اُس نے ٹھیک بنا دیا۔ پھر سمجھ دی اُس کو نافرمانی کی اور تقویٰ کی۔ تحقیق مراد کو پہنچا جس نے اس کو سنوارا۔ اور نامراد ہوا وہ جس نے اسے خاک میں ملا چھوڑا۔''

ایک تو اس کا ظاہری مفہوم ہے جو ہر ایک کے سامنے ہے۔ کامیاب ہو گیا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک کر لیا' اس کو سنوار لیا' اس کو رزائل سے پاک کر لیا۔ اور ناکام ہوا جس نے اس کو مٹّی میں دبا دیا۔ دَسَّ ' یَدُسُّ کے معنی ہوتے ہیں گاڑ دینے اور دبا دینے کے۔ قرآن مجید میں کُفّارِ مکّہ کے بارے میں آیا ہے کہ ان کا حال یہ ہے کہ کسی کے گھر بیٹی پیدا ہو جاتی ہے تو اس فکر میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس کو ذلّت برداشت کرتے ہوئے زندہ رکھوں یا مٹّی میں دبا دوں؟ ﴿اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ؕ﴾ (النحل:۵۹) اسی طرح آپ غور کریں کہ 'فلاح' کامیابی کو کہتے ہیں' لیکن یہ لفظ بنا ہے فَلَحَ یَفلَحُ سے' جس کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو پھاڑنا' توڑنا۔ عربی محاورہ ہے: اِنَّ الحَدِیْدَ بِالْحَدِیْدِ یُفلَحُ ''لوہا لوہے سے کاٹا جاتا ہے''۔ ''فلّاح'' جدید عربی میں کسان کو کہتے ہیں کہ وہ اپنے ہل کی نوک سے دھرتی کے سینے کو چیرتا ہے۔ اسی طرح انسان کے مادّی وجود کے اندر اس کی اصل حقیقت مضمر ہے' لہٰذا اس مادّی وجود کو کچھ توڑنا پھوڑنا ہوگا اور اس میں سے اصل حقیقت کو برآمد کرنا ہوگا۔ دراصل لفظ فلاح کے اندر وہ حقیقت مضمر ہے کہ کوئی شے بیج میں

کہیں دبی ہوئی ہے۔ سورۃ المؤمنون کی پہلی آیت ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ①﴾ کا شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فرزندِ ارجمند شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے ''موضح القرآن'' میں بہترین ترجمہ کیا ہے: ''کام نکال لے گئے وہ اہلِ ایمان''..... جیسے کوئی شے دفن تھی' بند تھی' اس پر غلاف آچکا تھا' اس پر پردے آگئے تھے' اسے پھاڑا ہے' توڑا ہے اور اس میں سے اس حقیقت کو برآمد کیا ہے۔ یہ ہے فلاح کی اصل حقیقت۔

اسی طرح ایک جملہ اپنشد میں ہے' جسے مَیں اکثر quote کیا کرتا ہوں' کیونکہ حکمت کے بارے میں ہمارا تصوّر یہ ہے کہ یہ نوعِ انسانی کی مشترک متاع ہے۔ حدیث میں آتا ہے: ((اَلْكَلِمَةُ الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ فَحَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا))(۱۹) ''حکمت کی بات تو مؤمن کی گمشدہ متاع کی مانند ہے' وہ اس کا زیادہ حقدار ہے جہاں بھی اسے پائے''۔ چنانچہ اپنشد کا جملہ ہے:

"Man in his ignorance identifies himself with the material sheaths which encompass his real self."

''انسان اپنی نادانی اور جہالت میں اپنے آپ کو اُن مادّی غلافوں سے تعبیر کر بیٹھتا ہے جن کے اندر اس کی اصل حقیقت مضمر اور پنہاں ہے۔''

اصل حقیقت اس کی رُوح ہے جو اس کے جسدِ خاکی میں پھونکی گئی تھی۔ ذہن میں رکھیے ہمارے اکثر متکلمین کے نزدیک روح ایک ''جسمِ لطیف'' ہے اور جسد ''جسمِ کثیف'' ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ صرف ایک معنوی حقیقت ہو جس کا کوئی وجود نہ ہو۔ اور یہ معاملہ ہمارے جسم سے ماورا ہے' اس کو ہم نہیں جان سکتے۔

مَیں ایک سادہ سی بات عرض کیا کرتا ہوں کہ ہمیں تو آج تک یہ بھی معلوم نہیں کہ ہماری جان کا ہمارے جسم سے کیا تعلق ہے؟ آپ فزیالوجی کی ضخیم سے ضخیم کتابیں پڑھ جائیے' کہیں پتا نہیں چلے گا کہ جان کا تعلق جسم سے کس طور سے ہے' کس عضو سے ہے۔ نیند کا ہمیں آج تک پتا نہیں کہ دماغ کے کس گوشے میں ہے کہ switch on کریں تو آدمی جاگ جائے' off کریں تو آدمی سو جائے۔ یہ سب ہماری پہنچ اور دسترس سے بہت

(۱۹) جامع الترمذی' کتاب العلم' باب ما جاء فی فضل الفقه علی العبادة ...

بعید ہے۔ اگر 'جان' کے بارے میں ہمیں معلوم نہیں تو 'روح' اس سے کہیں لطیف تر حقیقت ہے۔ اس تعلق پر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اپنے حواشی میں بہت خوب صورت انداز میں یہ فارسی شعر نقل کیا ہے ؎

جاں نہاں در جسم، اُو در جاں نہاں
اے نہاں اندر نہاں اے جانِ جاں![۲۰]

یہ ہے ہمارا روحانی وجود۔ ہوتا یہ ہے کہ جب ہمارا مادّی وجود، اس کے تقاضے اور ہمارے سفلی میلانات روح پر چھا جاتے ہیں تو مادّی وجود کے اندر روح دفن ہو کر رہ جاتی ہے۔ آگے الفاظ ہیں: ﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝١٠﴾ (الشمس) یعنی نامراد ہوا وہ جس نے اپنی روح کو دفن کر دیا۔

ایک اور مقام پر غور کیجیے:

﴿وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۡ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝١٧٩﴾ (الاعراف)

''ہم نے انسانوں اور جنّوں میں سے بہت سوں کو پیدا کیا ہے جہنم کا ایندھن بننے کے لیے۔ ان کے دل ہیں مگر وہ ان سے غور و فکر نہیں کرتے، ان کی آنکھیں ہیں مگر وہ اُن سے دیکھتے نہیں، اُن کے کان ہیں مگر وہ اُن سے سنتے نہیں۔ یہ جانوروں کی مانند ہیں بلکہ اُن سے بھی گئے گزرے۔ یہی لوگ غافل ہیں۔''

یہ تعبیر کا ایک انداز ہے۔ یہاں جبر و قدر کی بحث کو ذہن سے ذرا دور رکھئے! اب اس کی تعبیر کیا ہے؟ یہ جہنّم کا ایندھن بننے والے انسان کون ہیں؟ ان کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کون سا سننا ہے جس کی نفی ہو رہی ہے؟ کون سا دیکھنا ہے جس کی نفی ہو رہی ہے؟ کیا ابوجہل اندھا اور بہرا تھا؟ کیا ابولہب اندھا اور بہرا تھا؟ یہ تو بظاہر بڑے سوجھ بوجھ والے اور بھلے چنگے لوگ تھے۔ ابولہب کی تو بڑی بڑی موٹی آنکھیں تھیں، بہت سرخ و سفید رنگت تھی، ہر اعتبار سے ایک

(۲۰) ''روح ہمارے جسم کے اندر پوشیدہ ہے اور وہ (ذاتِ باری تعالیٰ) ہماری روح کے اندر پوشیدہ ہے..... اے وہ جو دو پردوں میں پوشیدہ ہے اے جانِ جاں!''

خوب رو اور خوبصورت انسان ـــــ لیکن قرآن کیوں کہہ رہا ہے کہ یہ اندھے ہیں؟ کون سی ان کی بینائی ہے' کون سی سماعت ہے جو معطل ہو چکی ہے؟ وہ کون سا دل ہے جس پر مہر لگ چکی ہے؟ ـــــ یہ روح کی حقیقتیں ہیں جن کو بیان کیا جا رہا ہے کہ وہ مر چکی ہیں۔ وہ اب ﴿اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ ۚ﴾ (النحل:۲۱) ہیں۔ یہ مُردہ ہیں' زندہ نہیں ہیں۔ ان کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى﴾ (النمل:۸۰) ''(اے نبی ﷺ!) آپ مُردوں کو نہیں سنا سکتے!'' اس آیت کا تعلق خواہ مخواہ سماعِ موتٰی سے جوڑ دیا گیا ہے۔ یہ اُن مُردوں کے بارے میں نہیں کہا جا رہا جو قبروں میں دفن ہو چکے ہیں۔ یہ تو وہ ہیں جو زندہ چلتے پھرتے نظر آ رہے ہیں۔ اس کے بارے میں بڑی پیاری تعبیر اقبال کے مصرعے میں ہے کہ ع ''رُوح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد''۔ ایک biological life تو تھی' ایک حیاتِ حیوانی اندر موجود تھی' لیکن وہ رُوحِ ربّانی ختم ہو چکی تھی' سلب ہو چکی تھی' یا وہ مقبرے یا تعزیے کے اندر مدفون تھی۔ ان کے بارے میں فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ﴾ ''یہ لوگ چوپایوں کی مانند ہیں''۔ یہ انسان نظر آتے ہیں' حقیقت میں چوپائے ہیں۔ یہ دو ٹانگوں پر چلنے والے' انسان کی شکل میں حیوان ہیں۔ اور حیوان بھی کیسے کیسے؟؟

مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ اپنا ایک مکاشفہ بیان فرمایا کرتے تھے جسے متعدد حضرات نے ان سے براہِ راست سنا ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ مولانا کہتے تھے کہ مَیں نوجوانی کے دور میں لاہور کے کشمیری بازار' جو اُس وقت بڑا گنجان آباد علاقہ تھا' چلا گیا۔ اچانک ایک بزرگ درویش مجھے ملے اور انہوں نے کہا: مَیں کسی انسان سے ملنا چاہتا ہوں' تم مجھے کسی انسان کی خبر دے سکتے ہو؟ (انسانم آرزوست!) اس پر مولانا نے کہا کہ آپ کو انسان نظر نہیں آ رہے؟ بھرا بازار ہے' گاہک ہیں' دکاندار ہیں۔ ان بزرگ نے جذب کی کیفیت میں کہا' میاں! مجھے تو یہاں کوئی انسان نظر نہیں آ رہا۔ ان کا یہ فرمانا تھا کہ بس اچانک مجھے بھی ایسا محسوس ہوا کہ کسی دکان پر کوئی بندر' کسی پر کوئی بھیڑیا بیٹھا ہے اور کہیں کوئی سؤر چل رہا ہے۔ اصل میں ان کی شخصیتوں کی جو معنوی حقیقت تھی گویا وہ منکشف ہو کر سامنے آ گئی۔ لباس پہنے ہوئے سفید پوش انسان کی حقیقتِ معنوی چھپی ہوئی

ہے۔ اصل شخصیت جو مضمر ہے وہ ایک سؤر کی شخصیت ہے' جس کے اوپر شہوت بُری طرح چھائی ہوئی ہے۔ کوئی حریص بندر کی صورت میں ظاہر ہوا' کوئی بھیڑیا ہے جو کاٹنے اور چیرنے کے لیے بے تاب ہے۔ یہ انسان کا معاملہ ہے۔ قرآن مجید نے تو پھر بھی نرم الفاظ استعمال کیے ہیں: ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ﴾ ''یہ لوگ چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں''۔ اس لیے گئے گزرے ہیں کہ حیوانوں کو تو پیدا ہی اس سطح پر کیا گیا تھا' لہٰذا وہ اس سطح پر ہیں تو ان کے لیے کوئی عار اور شرم کی بات نہیں ہے' مگر انسان کا تو معاملہ یہ ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝۴﴾ (التین) ''تحقیق ہم نے انسان کو بہترین انداز پر تخلیق کیا''۔ وہ احسنِ تقویم پر پیدا ہونے والا انسان اس پستی میں مبتلا ہے۔

یہ مضمون قرآن مجید میں بارہا آیا ہے۔ اہم مضامین قرآنِ مجید میں کم از کم دو جگہ ضرور ملیں گے۔ چنانچہ نوٹ کریں کہ یہی مضمون سورۃ الحج میں بایں الفاظ آیا ہے:

﴿اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ۝۴۶﴾ (الحج)

''کیا وہ لوگ زمین میں گھومے پھرے نہیں کہ ہوتے اُن کے دل کہ وہ ان سے سوچتے' یا ہوتے ان کے کان کہ وہ ان سے سنتے؟ پس آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔''

آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں' دل اندھے ہو جاتے ہیں۔ ابوجہل کی آنکھ اندھی نہیں تھی' دل اندھا تھا۔ یہ ہے روحانی وجود کی حقیقت جس کے لیے امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ ''مَلَکیت'' اور ''بہیمیت'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ شیخ سعدیؒ کا شعر ہے ؎

آدمی زادہ طرفہ معجون است
از فرشتہ سرشتہ وز حیواں [۲۱]

---

(۲۱) ''اولادِ آدم عجب معجونِ مرکب ہے..... اس میں فرشتوں والی صفات بھی ہیں اور حیوانوں والی بھی!''

انسان کی شخصیت کے دو رُخ ہیں‘ اس میں مَلَکیت بھی ہے اور بہیمیت بھی ہے۔ اس میں حیوان بھی ہے‘ فرشتہ بھی۔ لیکن جب وہ حیوان غالب آجاتا ہے اس طور سے کہ فرشتے والی صفت دفن ہو جاتی ہے تو پھر وہ انسان وجود میں آتے ہیں جو غالب اکثریت میں نظر آرہے ہیں۔ دوسری جانب اس دلدل سے نکلنے کے لیے سورۃ التّین میں فرمایا: ﴿اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ۝۶﴾ ’’سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور عمل صالح کیے‘ پس اُن کے لیے اجر ہے بے حساب۔‘‘

سلوکِ قرآنی کے تین مراحل

اگر شعور‘ ہوش‘ توجّہ اور تنبہ ہو جائے تو اب تین مراحل ہیں جن سے گزرنا ہوگا۔

(۱) مُجاھَدہ مع النّفس: سلوکِ قرآنی کا سب سے پہلا مرحلہ مجاہدہ مع النفس کا ہے۔ ہم یہ جان چکے ہیں کہ اصل شے ہماری باطنی کشمکش اور ہمارے نفس کی امّارۃ بالسُّوء ہونے کی کیفیت ہے۔ یہی ہے جو لوگوں کی اس ہلاکت کا باعث ہے کہ وہ زندہ ہوتے ہوئے حقیقت کے اعتبار سے مُردہ ہیں‘ اس لیے کہ ان کی باطنی صلاحیت سلب ہو چکی ہے اور وہ اب حیوانوں کا سا دیکھنا دیکھ رہے ہیں اور حیوانوں کا سا سننا سن رہے ہیں۔ انسانی دیکھنا اور سننا انہیں حاصل نہیں۔ اسی لیے اقبالؔ نے کہا ہے ؎

دم چیست؟ پیام است! شنیدی نہ شنیدی؟
در خاکِ تو یک جلوۂ عام است! ندیدی؟
دیدن دگر آموز! شنیدن دگر آموز!

اقبالؔ ہی نے کہا تھا ؎

ہے ذوقِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے!

چنانچہ پہلا مرحلہ ہے مجاہدہ مع النفس۔ اس کے لیے تین اصلاحات ذہن میں ٹانک لیجیے: ۱۔ ضبطِ نفس‘ ۲۔ تہذیبِ نفس‘ ۳۔ تزکیۂ نفس۔ اس روح کو اگر پروان چڑھانا ہے‘ اگر اس کی ترقی پیشِ نظر ہے‘ اگر چاہتے ہیں کہ یہ بیدار ہو‘ اسے تقویت پہنچے‘ ہمارے وجود پر

غالب آئے تو اس کو اتنا قوی اور توانا کرنا ہوگا کہ یہ نفس پر قابو یافتہ ہوجائے۔ اس کی بہترین مثال ہمارے بزرگ دیتے چلے آئے ہیں کہ جسم درحقیقت مَرکَب (سواری) ہے' جبکہ ہمارا روحانی وجود' ہماری انا' یا علّامہ اقبال کے فلسفے کے مطابق ہماری خودی راکب ہے' یہ گھوڑے کے اوپر سوار ہے اور یہ گھوڑا بہت منہ زور ہے۔ اگر رَاکِب کمزور ہو تو وہ گھوڑے کے رحم وکرم پر ہے' وہ جدھر چاہے اسے لے جائے اور جس کھائی میں چاہے پٹخ دے۔ لیکن اگر راکب (سوار) تقویت پا گیا ہے' مضبوط ہے' توانا ہے' جما بیٹھا ہے تو پھر گھوڑا اس کے لیے سرمایہ (asset) ہے۔ وہ اسے استعمال کرے گا' خیرات وحسنات اسی کے ذریعے سے کمائے گا' اسی کے ذریعہ اکتسابِ اعمال کرے گا' اور یہی استعداد ہے جو اس کے بروئے کار آئے گی۔ یہ اُس گھوڑے کی مانند ہے جس پر آپ سوار ہو کر منزلِ مقصود کی طرف چلے جا رہے ہیں' بشرطیکہ اس پر آپ کا کنٹرول ہو۔ اور اگر صورت برعکس ہوجائے اور گھوڑا آپ پر قابو پالے' چونکہ آپ کمزور ہیں تو پھر آپ کا جو حشر ہوگا وہ سب کو معلوم ہے۔ یہ ضبطِ نفس' تہذیبِ نفس اور تزکیۂ نفس اسی لیے ہیں کہ روح کا جسم پر کنٹرول رہے۔ قرآن حکیم میں آتا ہے:

﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۴۱﴾﴾ (النّٰزعٰت)

''اور جو کوئی ڈرتا رہا اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے اور روکتا رہا اپنے نفس کو خواہشات سے' تو جنّت ہی اُس کا ٹھکانہ ہے۔''

اور حدیثِ رسول ﷺ میں وضاحت ہے کہ:

((اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ))(۲۲)

''اصل ہوش مند اور باشعور وہ لوگ ہیں جو اپنے نفس کو قابو میں رکھیں (اسے اپنا محکوم اور مطیع بنائیں) اور عمل کریں موت کے بعد والی زندگی کے لیے۔''

---

(۲۲) جامع الترمذی' کتاب صفة القيامة والرقائق والورع ... باب ماجاء فی صفة اوانی الحوض... وکتاب الزهد لاحمد بن حنبل۔

اس حوالے سے عبادات کی پابندی بہت ضروری ہے۔ پہلی عبادت نماز ہے جو اسلام کا رکن ہے اور ایمان کی تجدید وآبیاری کا اور غفلت سے بچانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ پانچ وقت ماحول سے نکل کر عہد کو تازہ کرو۔ اپنے پروردگار کے حضور سجدے میں گرو‘ لوحِ جبیں تازہ کرو‘ اپنا عہدِ بندگی استوار کرو: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ (الفاتحۃ) ’’ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے۔‘‘

تزکیۂ نفس کے حوالے سے دوسری اہم عبادت روزہ کی ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ باقی تمام نیکیوں کا بدلہ تو دس سے ستّر گنا تک ملے گا‘ لیکن ((اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ)) (۲۳) ’’روزہ میرے لیے ہے اور مَیں ہی اس کی جزا دوں گا‘‘۔ عبادات میں اس کی امتیازی شان یہ ہے کہ یہ نفس کو لگام دینے کا سب سے مؤثّر ذریعہ ہے۔ یہ ضبطِ نفس اور تہذیبِ نفس کا بہترین طریقہ ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا: ((اَلصَّوْمُ جُنَّۃٌ)) ’’روزہ ڈھال ہے‘‘۔ نفس کے حملوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا ہے تو روزے کی ڈھال اپنے ہاتھ میں لو۔

مزید برآں تزکیۂ نفس کے لیے مؤثّر ترین شے انفاقِ مال ہے۔ مَیں اس بارے میں اپنا احساس آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص دوسری عبادات کے ڈھیر کے ڈھیر لگا دے لیکن بخل اس کے اندر رہ گیا‘ مال کی محبت رہ گئی تو یہ بات قرآن وسنّت کے واضح نصوص سے معلوم ہوتی ہے کہ تزکیہ نہیں ہوا۔ محض دھوکا اور فریب ہے جسے تزکیہ سمجھا جا رہا ہے۔ کسی کو مشکل میں دیکھ کر اگر دل سے مدد کرنے کا جذبہ نہیں اُبھرتا تو ابھی تزکیۂ نفس کی منزل بہت دُور ہے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((مَنْ یُحْرَمُ الرِّفْقَ یُحْرَمُ الْخَیْرَ کُلَّہٗ)) (۲۴) ’’جو شخص دل کی نرمی سے محروم کر دیا گیا وہ کُل کے کُل خیر سے محروم کر دیا گیا‘‘۔ اس لیے کہ نفس کی اصل بیماری ’’حُبِّ دُنیا‘‘ اور اس کی علامت ’’حُبِّ

---

(۲۳) صحیح البخاری وصحیح مسلم ۔ وجامع الترمذی‘ کتاب الصوم‘ باب ما جاء فی فصل الصوم۔

(۲۴) سنن ابی داؤد‘ کتاب الادب‘ باب فی الرفق۔

مال'' ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَاَمَّا مَنۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝﴾ (الیل) ''اور جس نے بخل کیا اور بے پروا رہا' اور جھوٹ جانا اور جھٹلایا نیکی کو' سو اُس کو ہم سہج سہج پہنچا دیں گے سختی میں''۔ قرآن نے یونہی نہیں کہہ دیا: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝﴾ (آل عمران) ''تم نیکی کی حقیقت کو اُس وقت تک نہیں پہنچ سکتے جب تک خرچ نہ کرو اُس میں سے جسے محبوب رکھتے ہو' اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اللہ تبارک وتعالیٰ اُسے جاننے والا ہے''۔ علاوہ ازیں آیت البِرّ میں فرمایا گیا:

﴿... وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰي حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّاۗىِٕلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝﴾ (البقرۃ)

''..... بلکہ اصل نیکی اُس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر' یومِ آخر پر' فرشتوں پر کتابوں پر اور انبیاء پر۔ اور دیا اُس نے مال اس کی محبّت کے علی الرغم رشتے داروں کو' یتیموں کو' محتاجوں کو' مسافروں کو' سائلوں کو اور گردنوں کے چھڑانے میں۔ اور قائم کی اس نے نماز اور ادا کی زکوٰۃ۔ اور پورا کرنے والے اپنے عہد کے جبکہ کوئی باہم معاہدہ کرلیں۔ اور بالخصوص صبر کرنے والے فقر وفاقہ میں' تکالیف ومصائب پر اور جنگ کے وقت۔ یہی ہیں وہ لوگ کہ جو واقعۃً راست باز ہیں' اور یہی ہیں وہ لوگ جو حقیقۃً متقی ہیں۔''

یہاں نماز اور زکوٰۃ کو علیحدہ اور ایتائے مال کو علیحدہ ذکر کیا گیا۔ ''خرچ کرو اللہ کی راہ میں!'' یہ ہے اصل میں تزکیۂ نفس کا مؤثر ترین ذریعہ' اور اگر خدانخواستہ اس سے صَرفِ نظر کیا گیا تو مطلوب حاصل نہیں ہوگا۔ ہر عبادت کی اپنی تاثیر ہے۔ ان عبادات میں اپنی اپنی نورانیت ہے' ہر ایک کی اپنی افادیت ہے۔ لہٰذا اگر ایتائے مال کو by pass کر دیا گیا' اگر حُبِّ مال کی کیفیت جوں کی توں رہی' اگر بخل باقی رہا' ﴿الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا

وَّعَدَّدَهٗ ﴿۲﴾ (الھمزۃ) ''جس نے سمیٹا مال اور گن گن کر رکھا'' کی کیفیت برقرار رہی تو یہ وہ bottle neck ہے جو انسانی شخصیت کے ارتقاء میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس رکاوٹ کو قرآن مشکل گھاٹی سے تعبیر کرتا ہے:

﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴿۱۱﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ﴿۱۲﴾ فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿۱۳﴾ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ﴿۱۴﴾ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿۱۵﴾ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿۱۶﴾﴾ (البلد)

''پھر بھی وہ اس گھاٹی کو عبور نہ کر سکا' اور تمہیں کیا پتا کہ وہ گھاٹی کیا ہے۔ کسی کی گردن چھڑا دینا' یا پھر کسی بھوک والے دن میں کھانا کھلا دینا' کسی رشتہ دار یتیم کو یا کسی مسکین کو جو مٹّی میں رُل رہا ہو۔''

اگر یہ کام نہیں کر سکے تو دوسری عبادات کے ڈھیر کے ڈھیر بھی تلافی نہیں کر سکتے۔ ہر عبادت کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ جیسے آپ کو معلوم ہے' نمازیں آپ لاکھوں کروڑوں پڑھ لیں' فرض روزے کا قائم مقام کوئی نماز نہیں بن سکتی۔ اسی طرح نماز اور روزہ آپ کتنا ہی کر لیں زکوٰۃ کے وہ قائم مقام نہیں بن سکتے۔ زکوٰۃ فرض ہے اور زکوٰۃ ہی دی جائے گی تو فرض ادا ہوگا۔ ہر شے کا اپنا مقام ہے۔ جہاں تک نماز کا تعلق ہے' وہ اصل میں تجدیدِ ایمان کا مؤثر ترین ذریعہ ہے' ذکر اور یاددہانی ہے۔ اس کے بعد روزہ نفس کے تقاضوں کو لگام دینے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ ساتھ ہی نفس کا سب سے بڑا رذیلہ مال کی محبّت ہے اور اس کا علاج ''انفاق فی سبیل اللہ'' ہے۔ یہ ہے وہ جامع پروگرام جس سے یہ مجاہدہ مع النّفس ہوگا۔ اس سے آپ نفس کے مُنہ زور گھوڑے کو لگام دیں گے۔ اس سے گویا آپ کا پہلا مرحلہ طے ہو گیا۔

(۲) حُبِّ ربّ: دوسرا مرحلہ ''حُبِّ ربّ'' یعنی پروردگار کی محبّت ہے۔ جب آپ نے اپنے نفسِ امّارہ کو لگام دے دی' اس کے جو رذائل ہیں ان سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا تو اب آپ کے روحانی وجود کو جو ریلیف (relief) میسّر آیا ہے تو وہ اپنے رب کی جانب متوجّہ ہوگا۔ چنانچہ غور کیجیے سورۃ البقرۃ کے تیئیسویں رکوع میں احکامِ صوم والی آیات کے فوراً بعد یہ آیت آ رہی ہے:

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾﴾

''(اے نبی ﷺ!) اور جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو آپ کہہ دیجئے کہ مَیں تو قریب ہی ہوں۔ جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے مَیں اُس کی پکار کو سنتا ہوں' تو چاہیے کہ وہ میرا کہا مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں' تاکہ وہ راہِ راست پر آجائیں۔''

اب یہ روح کو ریلیف ملا ہے' نفس کا بوجھ اس پر سے کم ہوا ہے' وہ دباؤ جس کے نیچے وہ سسک رہی تھی اس سے رستگاری ملی ہے تو وہ اپنے ربّ کی طرف متوجّہ ہوگی۔ اب وہ جذبہ جو اس کے اندر متوارث (inherent) موجود ہے' وہ بروئے کار آئے گا۔ یعنی ع ''اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن'' اور جو کہا گیا ہے: كُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِهٖ (ہر شے اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے)۔ اس روح کا اصل تعلق ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ ہے(۲۵)۔ اس کے اندر ایک شوقِ لقاء بھی ہے' ایک محبّت کا جذبہ بھی ہے' لیکن نفس کے تقاضوں کے تحت دبا ہوا ہے' جو اب تک ظاہر نہیں ہوا' اب وہ اُبھر کر سامنے آئے گا۔ اس کو قرآن مجید کہتا ہے: ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۶۵) ''اور اہلِ ایمان اللہ کی محبّت میں سب سے بڑھ کر ہیں۔''

واضح رہے کہ قرآن مجید میں جہاں بھی اللہ کی محبّت کا ذکر آئے تو سمجھ لیجیے کہ اس کے اندر رسول ﷺ کی محبّت کا ذکر بھی موجود ہے۔ یہ وہاں مضمر ہے' اس کو ظاہر کیا جائے یا نہ

---

(۲۵) اس موضوع پر محترم ڈاکٹر صاحبؒ علّامہ اقبال کی یہ رُباعی سنایا کرتے تھے:

مرا دل سوخت بر تنہائی او — ''میرا دل جلتا ہے اُس کی تنہائی پر
کنم سامانِ بزم آرائی او — اُس کی بزم آرائی کے لیے سامان کر رہا ہوں
مثالِ دانہ می کارم خودی را — بیج کی طرح خودی کو پال رہا ہوں
برائے اُو نگہدارم خودی را — اُس کے لیے خودی کی نگہبانی کر رہا ہوں''۔

اور Plotinus کا قول ہے: ''Flight of alone to the alone''۔ تفصیل کے لیے دیکھئے محترم ڈاکٹر صاحبؒ کی سورۃ الحدید کی تفسیر پر مبنی کتاب ''اُمّ الْمُسَبِّحَات'' (مرتّب)

کیا جائے۔ دو اعتبارات سے اللہ اور اس کا رسول ﷺ ایک وحدت بن جاتے ہیں' اطاعت کے اعتبار سے اور محبّت کے اعتبار سے۔ چنانچہ سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٣٢﴾﴾

''کہہ دیجئے اطاعت کرو اللہ کی اور رسول (ﷺ) کی' پس اگر تم رُوگردانی کروگے تو اللہ ایسے کافروں کو پسند نہیں کرتا۔''

جبکہ سورۃ التوبۃ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٤﴾﴾

''کہہ دیجئے (اے نبی ﷺ!) اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور خاندان' اور وہ مال جو تم نے بڑی محنت سے کمائے ہیں' اور وہ تجارت جس میں تمہیں مندے کا خدشہ رہتا ہے' اور وہ گھر جو تمہیں بڑے پسند ہیں' تم کو زیادہ محبوب ہیں اللہ سے' اُس کے رسول سے اور اُس کے راستے میں جہاد کرنے سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ لے آئے۔ اور اللہ ہدایت نہیں دیتا نافرمانوں کو۔''

معلوم ہوا کہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے شدید ترین محبّت اور اللہ سے ملاقات کا شوق واشتیاق مطالباتِ دین میں سے ہے۔ اس کے لیے نبی اکرم ﷺ کے انتقال کے وقت کی کیفیت ذہن میں رکھیے۔

آپ کو معلوم ہے کہ انبیاء ورسل علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیار ملتا ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اپنے انتقال سے متصل قبل فرمایا:

((لَنْ يُقْبَضَ نَبِيٌّ قَطُّ حَتّٰى يَرٰى مَقْعَدَهُ مِنَ الْجَنَّةِ ثُمَّ يُخَيَّرُ))(٢٦)

''کوئی پیغمبر اُس وقت تک وفات نہیں پاتا جب تک بہشت میں اپنا ٹھکانا نہیں دیکھ لیتا' پھر اس کو اختیار دیا جاتا ہے (اگر چاہے تو دُنیا میں مزید رہے یا

---

(٢٦) صحيح البخاري' كتاب الدعوات' باب دعاءِ النبي ﷺ۔

مراجعت اختیار کرے۔)''

حضرت ابو بکر صدّیق رضی اللہ عنہ اس پر رو پڑے ۔ صحابہ رضی اللہ عنہم حیران ہو گئے تھے کہ کیا معاملہ ہے؟ دراصل بندۂ مؤمن کے لیے یہ ایک بڑی لطیف حقیقت ہے کہ وہ اس دنیا کی زندگی میں رہنے پر کبھی راضی نہیں ہوتا۔ یہ ''سِجْنُ الْمُؤْمِن'' ہے۔ یہ اس کے لیے liability ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے کسی CSP آفیسر کو بلوچستان کے دور دراز کونے میں کہیں پر لگا دیا جائے۔ چلا تو وہ جائے گا کہ ملازمت کا تقاضا ہے مگر مستقلاً رہنے پر راضی نہیں ہوگا۔ دنیا میں رہنا اللہ کے حکم سے ہے۔ یہ ہمارے لیے place of duty ہے۔ جب تک بھی اللہ ہمیں یہاں رکھے یہاں رہنے پر راضی رہنا ہے' مگر یہاں زندگی کی طوالت کی آرزو یا تمنّا نہیں ہونی چاہیے۔ قرآن میں یہودیوں کا وصف بیان ہوا ہے: ﴿يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ (البقرہ:۹۶) ''اُن میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ کاش اُسے ہزار سال کی عمر دے دی جائے''۔ اس کے برعکس بندۂ مؤمن کی شان تو وہ ہے جو اقبال نے بیان کی کہ ؎

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسّم بر لبِ اوست (۲۷)

آخری کلمات جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ مبارک سے ادا ہوئے وہ یہ تھے: ((اَللّٰهُمَّ الرَّفِيْقَ الْاَعْلٰى)) (۲۸) ''اے اللہ! اے بلند ترین رفیق!''

گویا جو وقت بھی یہاں گزرا ہے وہ ایک فرضِ منصبی کی ادائیگی کے لیے تھا۔ ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جو روحانی اور قلبی تعلق ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ تھا' ہمارے لیے تو وہ تصوّر سے ماورا ہے۔ لیکن دنیا میں رہتے ہوئے کوئی لطیف حجاب تو تھا' کوئی پردہ تو تھا نا۔ وہ بھی اتنا شاق گزر رہا ہے! یہ ہے محبّت' یہ ہے شوقِ لقاء! اللہ سے ملاقات' اس کے حضور حاضری کا شوق و اشتیاق۔ اگر یہ نہیں ہے تو ایمان کی اصل لذّت اور روح کی حیاتِ باطنی کا ابھی

---

(۲۷) ''مردِ مؤمن کی نشانی مَیں تمہیں بتاؤں؟..... جب موت آتی ہے تو اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔''

(۲۸) صحیح البخاری' کتاب الدعوات' باب دعاء النبی ﷺ اَللّٰهُمَّ الرَّفِيْقَ الْاَعْلٰى۔

کوئی احساس تک نہیں ہے۔ ان روحانی کیفیات کا تو مزا ابھی چکھا ہی نہیں اُس شخص نے جس میں یہ محبّتِ خداوندی ایک زندہ حقیقت قرار نہیں پائی۔ یہ حرارت اگر اس کے باطن کے اندر نہیں ہے تو وہ باطنی کیفیات سے عاری ہے۔

لا الٰہ اِلّا اللہ کا مفہوم: صوفیاء کرام نے ''لا الٰہ اِلّا اللہ'' کا جو مفہوم بیان کیا ہے صد فیصد درست ہے۔ توحید کی ایک سطح وہ ہے جس پر عوام ہوتے ہیں' وہ اس سے اُوپر نہیں جا سکتے۔ ان کے لیے ''لا الٰہ اِلّا اللہ'' کا مفہوم یہ ہے کہ ''لا معبود اِلّا اللہ..... لا رازق اِلّا اللہ''..... یعنی کوئی معبود نہیں' کوئی رازق نہیں' کوئی مشکل کشا نہیں' کوئی حاجت روا نہیں سوائے اللہ کے۔ یہ توحید کا پہلا درجہ ہے۔ لیکن اس سے اگلی منزل جہاں سے روح کی حیاتِ باطنی کا آغاز ہوتا ہے وہ ہے ''لا محبوب اِلّا اللہ..... لا مطلوب اِلّا اللہ..... لا مقصود اِلّا اللہ''..... یعنی مقصود' مطلوب اور محبوبِ حقیقی کے درجے میں اللہ کے سوا کوئی نہ رہے۔ کوئی بھی اس مقام پر موجود ہے تو یہ شرک کی ایک قسم ہے۔ اگر کوئی بھی محبّت اس محبّت کے برابر براجمان ہو گئی تو یہی تو ہے جو اقبال نے کہا ہے ؎

بُتوں سے تجھ کو اُمیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

یہ ہیں درجۂ احسان کے ثمرات۔ یہی وہ ثمرات ہیں جن کو ہمارے دین کی اصطلاح میں ''ولایت باہمی'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ اللہ اور اُس کے بندے کی باہمی دوستی ہے۔ اللہ بھی ولی ہے اہلِ ایمان کا' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۵۷) ''اللہ دوست ہے اہلِ ایمان کا' نکالتا ہے اُنہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف''۔ اور یہ جو واقعی حقیقی ایمان رکھنے والے ہیں' جن کے قلوب میں اور جن کی شخصیتوں میں ایمان رچ بس گیا ہے تو وہ اللہ کے دوست ہیں۔ ﴿اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾﴾ (یونس) ''آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے دوستوں کو نہ کوئی خوف لاحق ہوتا ہے نہ حزن۔ وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے تقویٰ اختیار کیا''۔ انہیں خوف

وحزن اس لیے نہیں ہے کہ وہ راضی برضائے رب ہیں ع ''ہر چہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است'' (جو کچھ میرے ساقی نے میرے پیالے میں ڈال دیا وہی عین لطف وکرم ہے۔) وہ اس کشمکش اور پیچ وتاب میں مبتلا نہیں ہوتے کہ یوں ہونا چاہیے تھا' یوں کیوں ہوگیا؟ یہ کس نے کردیا اور یہ مجھ پر کس نے ظلم ڈھادیا؟ بلکہ ''ماشاء اللّٰہُ کان ومالم یشأ لم یکن'' (جو اللہ نے چاہا وہ ہوگیا اور جو نہ چاہا وہ نہیں ہوا۔) حدیث میں آیا ہے کہ تمام انسان مل کر اگر تمہیں کوئی نفع پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے جب تک کہ اللہ کا اذن نہ ہو' اور تمام انسان مل کر تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے جب تک کہ اللہ کا اذن نہ ہو۔ تو کس کا خوف' کس سے امید' کس کا ڈر' کس بات کا حزن؟ جو ہوا اللہ کا فیصلہ اسی میں تھا: ؎

بروں کشید زپیچاکِ ہست وبود مرا
چہ عقدہ ہا کہ مقامِ رضا کشود مرا (۲۹)

یہ مقامِ رضا ہے۔ یعنی دوست کی رضا پر راضی رہنا ہے' جو اُس کا فیصلہ ہو قابلِ قبول ہے۔ اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے تن من دھن لگا دینا اپنی جگہ ضروری ہے' لیکن اس میں بھی توکّل صرف اللہ پر ہو کہ ہمارے کیے کچھ نہیں ہوگا' محنت کرنا ہماری ذمہ داری ہے' نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ علاج کرنا سُنّت ہے' کریں گے' لیکن شفاء دوا میں نہیں' اللہ کے اذن میں ہے۔ ہماری بھوک غذا سے نہیں مٹتی' اللہ کے اذن سے مٹتی ہے۔ پیاس پانی سے نہیں بجھتی' اللہ کے حکم سے بجھتی ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ''لَا فَاعِلَ فِی الْحَقِیْقَۃِ وَلَا مُؤَثِّرَ اِلَّا اللّٰہُ'' (اللہ کے سوا کوئی فاعلِ حقیقی اور کوئی مؤثّر حقیقی نہیں!) تو یہ حقیقت جان لینی چاہیے کہ ہر فعل کے اندر دو اجزاء (components) ہیں۔ انسان ''کاسبِ اعمال'' ہے' جبکہ ''خالقِ اعمال'' اللہ ہے۔ چنانچہ انسان کے لیے ہر فعل پر اپنی نیت کے اعتبار سے اجر وثواب یا عذاب وسزا ہے۔ لیکن ہوگا وہی جس میں اذنِ رب ہوگا۔

---

(۲۹) ''ہست و بود کی الجھنوں سے مجھے باہر نکال دیا..... کتنے ہی عقدے تھے جو مقامِ رضا کے حاصل ہوجانے سے حل ہوگئے۔''

اسی طرح ''باہمی مذاکرہ'' ہے' تم اللہ کو یاد رکھو' اللہ تمہیں یاد رکھے گا: ﴿فَاذْكُرُونِيٓ أَذْكُرْكُمْ﴾ (البقرۃ:۱۵۲) ''تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا''۔ حدیثِ قدسی ہے کہ میرا بندہ اگر مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں۔ اور میرا بندہ اگر مجھے محفل میں یاد کرتا ہے تو میں اُس کا اس سے اعلیٰ محفل میں ذکر کرتا ہوں' یعنی ملائکہ مقرّبین کی محفل میں۔ میرا بندہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ میرا بندہ میری طرف بالشت بھر آتا ہے تو میں اُس کی طرف ہاتھ بھر آتا ہوں۔ یہ ہے باہمی تعلق۔ اسی طرح نصرتِ باہمی کا معاملہ ہے: ﴿إِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ (محمد:۷) ''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا''۔ تم اس کے دین کا جھنڈا اٹھا ؤ' اقامتِ دین کی جدّ و جُہد میں تَن مَن دھن لگاؤ' اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ تو یہ ہے درحقیقت محبّت باہمی اور ولایت باہمی کا ایک ایسا تعلق جو ایمان کا لُبِّ لُباب اور حاصل ہے۔ ایمان جب اس درجے کو پہنچ جائے کہ آپ کے احساسات میں' آپ کے نقطۂ نظر میں' آپ کی باطنی کیفیات میں یہ تبدیلی واقع ہو جائے تو یہ ہے ایمان کا حاصل!

نصبُ العین

اسی بات کو ایک بہت عظیم' مضبوط اور مدلّل فلسفے کی حیثیت سے ڈاکٹر رفیع الدّین مرحوم نے اپنی کتاب ''Manifesto of Islam'' میں پیش کیا ہے[۳۰]۔ ڈاکٹر رفیع الدّین مرحوم نے علّامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کی نصوصِ قرآنی کی روشنی میں تشریح و توضیح کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اندر سب سے بڑا جذبہ محبّت کا جذبہ ہے۔ وہ کسی شے سے' کسی ہستی سے یا کسی نظریے اور خیال سے محبّت کرتا ہے اور اس کے لیے بھوکا رہنا گوارا کرتا ہے۔ اس کی جبلت میں تو یہ ہے کہ وہ اپنے پیٹ کو بھرے' اپنی ذات کی بقاء (preservation of the self) کے تقاضے پورے کرے۔ لیکن اگر مقصدِ زندگی کی لگن چھا جائے تو انسان فاقے برداشت کرتا ہے۔ یہ جذبہ کسی بھی مقصد کے لیے بروئے کار

(۳۰) اس کا ترجمہ ڈاکٹر ابصار احمد صاحب نے ''منشورِ اسلام'' کے نام سے کیا ہے' جو ''حکمتِ قرآن'' میں بالاقساط شائع ہوتا رہا ہے اور اب کتابی صورت میں دستیاب ہے۔ (مرتّب)

آ سکتا ہے' وطن کے لیے' قوم کے لیے' کسی نظریے کے لیے' جیسے ماضی میں کمیونزم وغیرہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔

حیوانی جبلت (animal instinct) تو یہ ہے کہ اپنی جان کو بچایا جائے' لیکن انسان کو ہم دیکھتے ہیں کہ کسی محبوب شے کے لیے جان قربان کر دیا کرتا ہے۔ اس کی کئی مثالیں موجود ہیں' جیسے جاپانیوں نے جنگ عظیم میں کیا کہ چھاتہ بردار بم باندھ کر ہوائی جہاز سے کودے اور بحری جہاز کی چمنی میں اتر گئے۔ انہیں معلوم ہے کہ خود ان کے پرخچے اُڑ جانے ہیں مگر ان پر وطن کی محبّت چھائی ہوئی ہے۔ انسان کا کوئی نہ کوئی مطلوب ہو' کوئی آدرش ہو' کوئی نصب العین ہو' کوئی آئیڈیل ہو' کوئی اس کا محبوب ہو' کوئی اس کا مقصود ہو' اس کے لیے وہ محنت کرے' ایثار کرے' اس کے لیے وہ بھوکا رہے' اس کے لیے وہ راتوں کو جاگے' اس کے لیے وہ جان کا رسک لے' جان قربان کر دے' اس کے لیے وہ پھانسی کے پھندے کو چوم کر گلے میں ڈالے' یہ انسان کا بلند ترین اور سب سے زیادہ قوی جذبہ ہے۔ یہ جذبہ اصل میں اللہ کی محبّت کے لیے پیدا کیا گیا ہے' لیکن فکری پستی کی وجہ سے انسان معرفتِ رب تک نہیں پہنچ پاتا۔ تو جیسے شدید بھوک میں آپ کسی گھٹیا غذا کو بھی قبول کر لیں گے جسے عام حالات میں دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے' آپ اس کو اضطرار کی حالت میں کھا لیں گے' اسی طرح جب انسان کی نگاہ اُس بلند ترین مطلوب و مقصود تک' اُس highest ideal تک' اُس اصل محبوبِ حقیقی تک نہیں پہنچ سکتی تو وہ کسی اور شے کو اُس کی جگہ رکھ کر اس سے وہی محبّت کرنے لگتا ہے جو دراصل اللہ سے ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ اندر کے جذبہ کو تسکین (satisfaction) درکار ہے۔ اُسے تو کوئی نہ کوئی محبوب چاہیے۔ اگر خدا تک نہیں پہنچے گا تو کسی اور شے کو پوجے گا' وطن کو پوجے گا' قوم کو پوجے گا' اپنے ہی نفس کو پوجے گا' اپنے ہی ''حریم ذات'' کے گرد طواف کرتا رہے گا۔ ؎

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر
رُست از یک بندتا افتاد در بندے دگر (۳۱)

(۳۱) ''ہمارا فکر ہر دم نیا خدا تراشتا رہتا ہے۔ ایک اُلجھن سے نکلتا ہے تو دوسری اُلجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔''

اور ؎

اِک تصوّر کے حسنِ مبہم پر ساری ہستی لٹائی جاتی ہے
زندگی ترکِ آرزو کے بعد کیسے سانسوں میں ڈھالی جاتی ہے!

اگر وہ آرزو نہیں رہی' وہ امنگ نہیں رہی' کوئی نصب العین نہیں' کوئی آدرش نہیں' کوئی مطلوب و مقصود نہیں تو پھر یہ انسان محض ایک ''human vegetable'' ہے۔ یہ اصطلاح (human vegetable) آج کل بہت استعمال ہوتی ہے۔ یعنی وہ لوگ جو طبعی طور پر مر چکے ہوں لیکن ان کو مشینوں سے زندہ رکھا گیا ہو کہ دل بھی چل رہا ہے' خون بھی گردش میں ہے اور گردوں کے لیے بھی مشین کام کر رہی ہے' وغیرہ۔ یہ لوگ سالہا سال تک اسی طرح پڑے رہتے ہیں۔

الغرض یہ ہے وہ فلسفہ جو قرآن مجید میں سورۃ الحج کے آخری رکوع میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾﴾ ''بہت ہی کمزور ہے طالب بھی اور مطلوب بھی!'' طالب و مطلوب کا ایک باہمی تعلق (relation) ہوتا ہے۔ انسان کسی بلند شے کو مطلوب و مقصود بناتا ہے تو اُس کی اپنی شخصیت بھی بلند ہوتی ہے' لیکن جب اس کی نگاہ پستی پر اٹک جاتی ہے تو پھر اس کی اپنی شخصیت بھی انتہائی پست رہ جاتی ہے۔ بلند آئیڈیل ہوگا تو اس کی شخصیت کو ترفع حاصل ہوگا۔ مَیں اس کی مثال دیا کرتا ہوں کہ اگر آپ کو ایک اونچی دیوار پر چڑھنا ہے' کمند آپ کے پاس ہے تو آپ کو اپنے زورِ بازو کے ذریعے پہلے کمند کو اونچا پھینکنا ہوگا۔ جتنی اونچی کمند اٹک جائے گی' اتنا ہی اونچا آپ جا سکیں گے۔ جتنا آپ کا آئیڈیل بلند ہوگا' اتنی ہی آپ کی شخصیت میں بلندی ہوگی۔ قرآن مجید میں جہاں فرمایا گیا کہ اہلِ ایمان کی شان تو یہ ہے کہ شدید ترین محبّت اللہ سے کرتے ہیں' وہاں انسان کی مجبوری اور پستی کے اندر مبتلا ہونے کا ذکر بھی کیا گیا ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۶۵)

''انسانوں میں ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا کسی اور کو مدِ مقابل بنا لیتے ہیں' پھر اس

سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ سے کرنی چاہیے' اور وہ لوگ جو اہلِ ایمان ہیں وہ شدید ترین ہیں اللہ کی محبت میں۔''

محبوبِ حقیقی اللہ کو ہونا چاہیے تھا' لیکن وہاں تک رسائی نہیں ہوئی تو اس مقام پر کسی اور کو رکھ کر اس کو پوجنا شروع کر دیا' اس سے محبت شروع کر دی۔ یہ انسان کا فطری تقاضا ہے' جس کو وہ ہر صورت پورا کرتا ہے' کسی نہ کسی شے کو اپنا مطلوب و مقصود بنا کر۔ اقبالؔ نے کیا خوب کہا ہے ع ''یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ!'' (کمند کی تشبیہہ میں نے یہیں سے لی ہے۔) تمہاری کمند نیچے نہ کہیں اٹک کر رہ جائے' اپنی کمندِ آرزو' اپنی کمندِ طلب کو اتنا اونچا پھینکو کہ وہ ذاتِ باری تعالیٰ تک تمہیں پہنچا سکے۔ ع ''منزلِ ما کبریا است!'' ہمارا مطلوب

ایک غلطی کی اصلاح: یہاں ایک چھوٹا سا نکتہ مزید واضح کر دوں۔ بعض دینی جماعتوں کے ہاں لفظ ''نصب العین'' غلط طور پر استعمال ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ اقامتِ دین کی جدّوجُہد اور اللہ کے دین کی سربلندی کی کوشش ہمارا نصب العین نہیں ہے۔ دراصل نصب العین صرف اور صرف اللہ اور اُس کی رضا ہے۔ البتہ اللہ نے جو حکم دیا ہے اس کو بجالانا ہے۔ نماز پڑھنا فرض ہے' پڑھنی ہے۔ روزہ رکھنا فرض ہے' اس کو رکھنا ہے۔ نماز یا روزہ نصب العین نہیں ہے' نصب العین اللہ کی رضا ہے۔ سوائے اللہ کی رضا کے کسی شے کو نصب العین کے درجے میں لانا درست نہیں۔ اگر کسی درجے میں لانا بھی چاہیں تو ''فلاحِ اُخروی'' کا لفظ استعمال کر لیں۔ لیکن کسی شے کو فرائض کی فہرست میں سے بلند کر کے نصب العین بنا دینا فکری غلطی ہے' اور پھر اس فکر کے نتائج بہت دور رس نکلتے ہیں۔ اقامتِ دین کی جدّوجُہد فرض ہے' اس کی کوشش ہمارے ذمہ ہے' تمام شرائط و لوازم کے ساتھ' لیکن اقامتِ دین ہمارا نصب العین نہیں ہے۔ یہ مِن جملہ دوسرے فرائضِ دینیہ کے ایک اہم ذمہ داری ہے۔

(۳) تقرّب الی اللہ: اس سلوکِ قرآنی کا تیسرا مرحلہ تقرّب الی اللہ ہے۔ یہ تقرّب الی اللہ کوئی زمانی یا مکانی سفر نہیں ہے۔ صرف یہی ہے کہ جو حجابات طاری ہیں وہ اُٹھتے چلے جائیں اور اللہ سے قربِ معنوی حاصل ہو جائے۔ یہ فاصلہ زمین پر طے نہیں کرنا ہے'

یا خلا میں کروڑوں میل جا کر اللہ تعالیٰ سے قرب حاصل کرنا اس کا مفہوم نہیں ہے' بلکہ یہ ہے کہ انسان کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ربطِ معنوی مزید پختہ اور گہرا ہو جائے۔

تقرّب اِلی اللہ کے دو راستے

اب اس کے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ دنیا میں یہ رہا ہے کہ مجاہدہ مع النفس ہی کے اندر شدید غلو کیا جائے۔ اس کے ذریعہ انسان ضبطِ نفس (self control) تک نہیں بلکہ نفس کُشی (self annihilation) تک پہنچ جاتا ہے۔ اسے رہبانیت کہتے ہیں' جس میں تجرد کی زندگی ہے' دنیا سے انقطاع ہے' ترکِ دنیا ہے۔ اس میں ذکر کی انتہائی کثرت کے ساتھ مسلسل روزے اور شدید سے شدید تر چلّے ہیں۔ کئی کئی دن کے روزے چل رہے ہیں۔ روزہ نہ بھی ہو تو پابندی ہے کہ نہ کچھ کھانا ہے اور نہ کچھ پینا ہے۔ یہ دنیا کی تاریخ میں ایک بڑا طویل باب ہے جو آپ کو ہر دور میں ہر جگہ روحانیت کے نام پر نظر آ جائے گا' جس کا جامع عنوان ہے ''رہبانیت''۔ جان لیجیے یہ راستہ اسلام کا نہیں ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں بھی اس کا ایک عکس در آیا ہے۔ الحمدللہ! ہمارے ہاں خانقاہی نظام میں بالکلیہ وہ نظام تو نہیں آیا لیکن اس کا ایک عکس ضرور پیدا ہوا ہے۔ قرآن نے تو رہبانیت کی پُرزور نفی کی ہے۔ سورۃ الحدید میں فرمایا:

﴿وَرَهْبَانِيَّةَ ِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ﴾ (آیت ۲۷)

''اور انہوں (عیسائیوں) نے رہبانیت کا طریقہ خود ایجاد کر لیا تھا' ہم نے تو اُن پر یہ بات لازم نہ کی تھی' مگر وہ اس سے اللہ کی رضا چاہتے تھے' پھر نہ نبھایا اُس کو جیسا کہ اُس کا حق تھا۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوٹوک انداز میں فرمایا: ((لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ))(۳۲) ''اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں ہے''۔ نیز فرمایا: ((اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ))(۳۳) ''نکاح میری سُنّت

---

(۳۲) فتح الباری لابن حجر ۱۳/۹' وفتح الباری لابن رجب ۱۰۲/۱۔

(۳۳) سنن ابن ماجه' کتاب النکاح' باب ما جاء فی فضل النکاح۔

میں سے ہے''۔ آپؐ نے ان رجحانات کی اوّل روز ہی سے اصلاح فرمائی ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر دی گئی کہ ساری رات نماز میں کھڑے رہتے ہیں' کمر بستر سے لگاتے ہی نہیں' بیوی سے کوئی سروکار نہیں' تمام دن روزہ رکھتے ہیں۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں بلا کر استفسار فرمایا:

((اَلَمْ اُخْبَرْ اَنَّکَ تَقُوْمُ اللَّیْلَ وَتَصُوْمُ النَّهَارَ؟)) قُلْتُ: اِنِّیْ اَفْعَلُ ذٰلِکَ' قال: ((فَاِنَّکَ اِذَا فَعَلْتَ ذٰلِکَ هَجَمَتْ عَیْنُکَ' وَنَفِهَتْ نَفْسُکَ' وَاِنَّ لِنَفْسِکَ حَقًّا' وَلِاَهْلِکَ حَقًّا ' فَصُمْ وَاَفْطِرْ ' وَقُمْ وَنَمْ)) (۳۴)

''(اے عبداللہ!) یہ مَیں کیا سنتا ہوں' تم رات بھر قیام کرتے ہو اور دن بھر روزہ رکھتے ہو؟ (حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں) مَیں نے عرض کیا: جی ہاں' ایسا ہی کرتا ہوں۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''(ایسا مت کرو! اس لیے کہ) جب تم یہ طرزِ عمل اختیار کرو گے تو تمہاری آنکھیں بوجھل ہو جائیں گی اور تم تھک جاؤ گے۔ یقیناً تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے گھر والوں کا بھی حق ہے' چنانچہ روزہ رکھو بھی اور نہ بھی رکھو' اور رات کو قیام بھی کرو اور سوؤ بھی۔''

یہ تشدّد' یہ غلو' اس کے اندر ریاضت کی شدّت' جو دنیا میں رہبانی نظام کا جزو رہا ہے' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سختی کے ساتھ اس رجحان (tendency) کو کم کیا ہے۔

اسی طرح مشہور واقعہ ہے کہ تین صحابہؓ میں یہی جذبہ اُبھرا' انہوں نے آ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے آپؐ کی نفلی عبادات سے متعلق معلوم کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر مہینے کتنے روزے رکھتے ہیں؟ رات کو کتنی عبادت کرتے ہیں؟ اب جو خبر دی گئی تو انہوں نے اسے اپنے اندازے سے کم پایا۔ خیر دل کو تسلی دی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو معصوم ہیں' آپؐ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی اور اگر بالفرضِ محال کوئی غلطی ہو بھی گئی ہو تو اللہ تعالیٰ معاف فرما چکا ہے: ﴿لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ﴾ (الفتح:۲) ''تاکہ اللہ بخش دے آپ کی کوئی کوتاہیاں جو پیچھے ہوئیں اور جو بعد میں

---

(۳۴) صحیح البخاری' کتاب الجمعة' باب ما یکره من ترک قیام اللیل لمن کان یقومه۔ وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب النهی عن صوم الدهر۔

ہوئیں۔'' ہمارے لیے یہ کافی نہیں ہے۔ چنانچہ ایک نے طے کیا کہ مَیں ساری رات قیام کیا کروں گا اور کمر بستر سے نہیں لگاؤں گا۔ دوسرے نے کہا مَیں تو ہر روز روزہ رکھوں گا اور کبھی ناغہ نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا مَیں کبھی شادی نہیں کروں گا' تجرد کی زندگی بسر کروں گا' شادی بیاہ کا کھکھیڑ مول نہیں لوں گا۔ حضور ﷺ تشریف لائے تو آپؐ کو اس کی خبر دی گئی۔ آپ ﷺ نے ان تینوں حضرات کو بلا کر دریافت فرمایا: کیا تم وہ لوگ ہو جنہوں نے ایسی ایسی باتیں کی ہیں؟ اس کے بعد حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے غیر معمولی الفاظ ادا ہوئے: ''اللہ کی قسم! مَیں تم سب سے بڑھ کر متقی ہوں' سب سے بڑھ کر اللہ کی خشیت رکھنے والا ہوں' لیکن میرا طریقہ یہ ہے کہ مَیں رات کو سوتا بھی ہوں اور عبادت بھی کرتا ہوں' مَیں روزے بھی رکھتا ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں' اور مَیں نے عورتوں سے شادیاں بھی کی ہیں۔ پھر فرمایا: ((فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ))(۳۵) ''پس (کان کھول کر سن لو) جس کو میری سُنّت پسند نہیں ہے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے''۔ دراصل یہ طریقہ تو بدھ مت کے بھکشوؤں' جین مت کے سادھوؤں اور عیسائی راہبوں کا ہے اور حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے بطورِ ادارہ (institution) اس راستے کو بند کر دیا ہے۔

دوسرا راستہ کیا ہے؟ اس تعبیر پر توجّہ کی ضرورت ہے۔ یہ ہے فرائض کا التزام اور نوافل میں اعتدال۔ مجاہدہ مع النّفس کے لیے یہ دونوں کام ضروری ہیں۔ اسلام میں اس مجاہدے کی کیفیت' بھوک اور محنت برداشت کرنے' مشقتیں جھیلنے' لذائذِ دنیا سے کنارہ کشی کرنے اور مصائب برداشت کرنے کو جِدّ و جُہد اور کوشش یعنی جہاد فی سبیل اللہ کی طرف منتقل کیا گیا ہے' تاکہ اس پوری قوت اور پوری توانائی (energy) کو کام میں لایا جائے۔ اسے معاشرے کی اصلاح' استحصال (exploitation) کے خاتمے' ظلم کے استیصال' عدل کے قیام' حق کا بول بالا کرنے اور نظامِ عدل وقسط کے قائم کرنے میں استعمال کیا جائے' تاکہ بہت سارے انسانوں کو اس بات کا موقع ملے کہ وہ اپنے ربّ سے لو لگا سکیں۔ جیسا کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فرمایا ہے کہ جس معاشرے میں تقسیمِ دولت کا نظام غلط ہو جاتا ہے وہاں

(۳۵) صحیح البخاری' کتاب النکاح' باب الترغیب فی النکاح۔ وصحیح مسلم' کتاب النکاح۔

خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جہاں دولت کا ارتکاز ہوگا' وہاں عیاشیاں ہوں گی' وہاں گلچھرے اڑائے جائیں گے' اور جہاں فقر و احتیاج ہوگا وہاں انسان حیوان بن کر رہ جائے گا۔ اعلیٰ خیالات' اللہ کی طرف توجّہ و انابت اور اللہ کے ساتھ لو لگانے کا تصوّر' اس کے حاشیۂ خیال ہی سے باہر نکل جائیں گے اور انسان حیوان بن کر رہ جائے گا' لدو اونٹ یا کولہو کا بیل بن کر رہ جائے گا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: ((كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا)) (۳۶) ''قریب ہے کہ فقر کفر تک لے جائے''۔ عہدِ حاضر کے شاعر نے اس کی خوب ترجمانی کی ہے ؎

دُنیا نے تیری یاد سے بے گانہ کر دیا
تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے!

بہرکیف قرآن مجید اس قوت کو جو مجاہدہ مع النّفس سے حاصل ہوتی ہے' ظلم کے استیصال کے لیے استعمال میں لاتا ہے۔ قرآن کا فلسفہ جو میری سمجھ میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ فرض عبادات کا التزام اور نوافل کے اندر اعتدال — اور اس توازن کے ساتھ اصل قوت جو اس سے پیدا (generate) ہوتی ہے اس کا رُخ ظلم کے استیصال کے لیے موڑ دیا جائے۔ لیکن لفظ ظلم کو سمجھ لیں کہ اس کا مفہوم کیا ہے۔ ظلم کے معنی حق تلفی کے ہیں اور سب سے بڑا ظلم شرک ہے' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۳﴾﴾ (لقمٰن) ''بے شک شرک ظلم عظیم ہے''۔ اور پھر دوسرا ظلم ہے جو معاشرے میں تین سطحوں پر ہو رہا ہے۔ یعنی سماجی سطح پر یہ اعلیٰ ہے' یہ ادنیٰ ہے' یہ گھٹیا ہے' یہ بڑھیا ہے' کوئی بے چارا پیدائشی نیچ پیدا ہوا ہے اور کوئی اونچا پیدا ہوا ہے۔ یہ تفریق (discrimination) ظلم ہے۔ پھر معاشی سطح پر کچھ لوگ استحصال کرنے والے (exploiters) ہیں اور کچھ لوگ وہ ہیں جو استحصال زدہ (exploited) ہیں۔ کہیں دولت کے انبار لگ رہے ہیں اور دولت مندوں کے کُتّوں کے لیے جو کچھ ہے وہ غریب کی اولاد کے لیے نہیں ہے۔ اسی طرح سیاسی سطح پر جبر ہے' حاکم اور محکوم کی تقسیم ہوگئی ہے' کچھ حکومت کر رہے ہیں اور کچھ

---

(۳۶) رواه البيهقى فى شعب الايمان۔ بحواله مشكاة المصابيح' كتاب الآداب۔ وضعيف الجامع الصغير وزيادته للالبانى' ح:۴۱۴۸۔

محکوم بن کر رہ گئے ہیں۔ علّامہ اقبال نے کہا تھا ع ''تمیز بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے!'' بندہ و آقا کی یہ تقسیم درحقیقت بہت بڑا ظلم ہے۔

جان لیجیے، ظلم چاہے اللہ کے ساتھ ہو رہا ہو بشکل شرک' یا ظلم سیاسی سطح پر' سماجی سطح پر یا معاشی سطح پر ہو رہا ہو' قرآن چاہتا ہے کہ اہلِ ایمان میں وہ روحانی قوت پیدا ہو جو اس کی اصلاح کر سکے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ (النساء:۱۳۵)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ عدل کو قائم کرنے کے لیے اللہ کے گواہ بن کر۔''

اور

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ﴾ (المائدۃ:۸)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' کھڑے ہو جاؤ اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بن جاؤ!''

اسی طرح سورۃ الحدید میں ارسالِ رُسل اور ان کے ساتھ انزالِ کتاب و میزان کا مقصد یہ بیان فرمایا گیا: ﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾ (آیت ۲۵) ''تاکہ لوگ عدل و قسط پر قائم ہو جائیں''۔ ہاں! اگر نظامِ عدل و قسط قائم ہو گیا ہے تو اب موقع ہے' اب آپ تقرّب بالنوافل کے اندر جتنی کثرت چاہے کر لیں۔ اس لیے کہ عدل کا ماحول قائم ہو چکا ہے' حق دار کو حق مل رہا ہے۔ ہمارے ہاں بھی جن حضرات کا ابتداءً اس بات کی طرف رجحان ہوا' وہ اسی لیے تھا کہ انہوں نے دیکھا کہ سیاسی نظام میں جو بگاڑ آ گیا ہے اس کی اصلاح اب ناممکن ہے۔ بار بار کوشش کی گئی' حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا اقدام' پھر حضرت نفس زکیہؒ کی کوشش' اس طرح کی مختلف کوششیں کی گئیں' لیکن پھر تو اس کے ساتھ ایک طرح سے مصالحت و مفاہمت کر لی گئی اور توجّہ کو دوسرے کاموں کی طرف مرتکز کیا گیا۔ اس طرح سے ہمارے ہاں خانقاہی نظام وجود میں آیا' لیکن اس میں اصلاح ہوتی رہی۔ انیسویں صدی میں سیّد احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید رحمہما اللہ نے ایک عظیم الشان تحریک اٹھائی جو ''تحریک شہیدین'' کے نام سے معروف ہے۔ آپ کے علم میں ہو گا

کہ سیّد صاحبؒ سلوک کے تمام سلاسل یعنی نقشبندیہ، سہروردیہ، چشتیہ اور قادریہ میں بیعت کرنے کے بعد اپنے مسترشدین سے ''سلسلہ محمدیہ ﷺ'' میں بیعت لیتے تھے۔ سلسلہ محمدیہ جہاد وقتال والا سلسلہ ہے۔ اس میں اعلاء کلمۃ اللہ کی جدّوجُہد کے دوران فقر بھی آئے گا، فاقہ بھی آئے گا، تکلیفیں بھی آئیں گی، یہاں روزے کی سی کیفیات بھی آئیں گی، یہاں نفس کے مرغوبات سے محروم ہونا پڑے گا، اور جو نفس کے لیے ناگوار چیزیں ہے انہیں جھیلنا پڑے گا۔

یہ مجاہدہ مع النّفس کا اصل طریقہ ہے۔ ابتدا کی حد تک اس میں وہی عبادات، صلوٰۃ و صوم وزکوٰۃ کا اہتمام ہے، لیکن اس کے بعد اس کے رخ کو تبدیل کیا گیا ہے۔ میرے نزدیک یہی سلوکِ محمدیؐ کی امتیازی شان ہے۔ ہمیں رجوع کرنا چاہیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف۔ ہم ان کو اپنا آئیڈیل سمجھیں گے، وہ سلوکِ محمدی ﷺ کا اصل مرقع تھے۔ نبی اکرم ﷺ کی تربیت وتزکیہ کا اصل product اور نتیجہ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شخصیات ہیں۔

تقرّب بالفرائض اور تقرّب بالنوافل حدیث کی روشنی میں

بخاری ومسلم کی متفق علیہ روایت میں یہ نسبت وتناسب بڑی عمدگی سے بیان ہوا ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَالَ : مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ، وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ، وَمَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ، فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ، وَبَصَرَهُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِهٖ، وَیَدَهُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِهَا، وَلَئِنْ سَاَلَنِیْ لَاُعْطِیَنَّهٗ، وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَاُعِیْذَنَّهٗ)) (۳۷)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: جس کسی نے میرے کسی ولی سے دشمنی رکھی تو اُس کے خلاف میری جانب سے اعلانِ جنگ ہے۔ اور جن اعمال سے میرا بندہ میرا قرب اختیار کرتا ہے اُن میں سے مجھے سب سے زیادہ محبوب وہ اعمال ہیں جو

(۳۷) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع۔

مَیں نے اُس پر فرض ٹھہرائے ہیں۔ اور بندہ نوافل کے ذریعے سے میرے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ مَیں اُس سے محبّت کرنے لگتا ہوں۔ پس جب مَیں اُس سے محبّت کرنے لگتا ہوں تو اُس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اُس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اُس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اُس کا پیر بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ اور اگر وہ مجھ سے کوئی سوال کرتا ہے تو ضرور اُسے عطا کرتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ طلب کرتا ہے تو ضرور پناہ دیتا ہوں۔''

یہ جو مَیں نے عرض کیا تھا کہ التزامِ فرائض ضروری ہے' اس ضمن میں یہ واضح رہے کہ فرائض میں عبادات یعنی نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج بھی ہیں' فریضۂ اقامتِ دین بھی ہے اور فریضۂ دعوت و تبلیغ بھی ہے۔ اجتماعی فرائض میں اپنی امکانی حد تک ہر شخص مکلّف ہے کہ اس میں حصّہ لے۔ اس کے بعد تقرّب بالنوافل کا مقام ہے۔ اس حدیث کے مطابق اللہ تعالیٰ کے نزدیک قرب کا مقدّم درجہ تقرّب بالفرائض ہے اور محبوب تر تقرّب بالنوافل ہے۔ اگر عدل و انصاف کا ماحول قائم ہو چکا ہو' دین کا بول بالا ہو چکا ہو' ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾﴾ (الاسراء) ''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا' بے شک باطل تو ہے ہی مٹ جانے کے لیے'' کی شان ظاہر ہو چکی ہو تو پھر تو پوری قوت کا ارتکاز تقرّب بالنوافل ہی پر ہو گا۔ اس طرح کا قرب احادیثِ نبوی ﷺ سے ثابت ہے' ان الفاظ کے اندر کوئی ابہام نہیں۔ اس حدیث کی شرح میں ابن عربیؒ جو بعض حضرات کے نزدیک بہت ہی مبغوض ہیں' نے بہت ہی عجیب بات کہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تقرّب بالنوافل کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اللہ انسان کا ہاتھ بن جائے' اللہ انسان کا کان بن جائے' اللہ انسان کی آنکھ بن جائے۔ لیکن تقرّب بالفرائض کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے' کیونکہ اب وہ انسان دینِ حق کا بول بالا کرنے میں لگا ہوا ہے' یہ اللہ کا مددگار' اُس کا ناصر بن گیا ہے۔ اس لیے کہ اللہ کی شان یہ ہے:

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ﴾

(آلِ عمران:۱۸) ''اللہ نے گواہی دی ہے کہ کوئی معبود نہیں اُس کے سوا' اور فرشتوں نے' اور علم والوں نے بھی' وہی عدل کا قائم کرنے والا ہے''۔ تو جو بھی اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے جِدّوجُہد کر رہا ہے' محنت و کوشش کر رہا ہے' گویا وہ اللہ کا ہاتھ بن گیا ہے' اس کا دست و بازو بن گیا ہے۔ وہ اُس کام میں لگا ہوا ہے جو اللہ کو پسند اور محبوب ہے۔ اس کی بہترین تعبیر علّامہ اقبال نے فرمائی ہے ع ''ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مؤمن کا ہاتھ!'' یعنی دینِ حق کی اقامت و اشاعت کی جِدّوجُہد کرنے والا ایک گروہ جو ''حزبُ اللہ'' کی شکل اختیار کر لے' یہ لوگ اللہ کے محبوب اور پسندیدہ بندے ہیں۔ اقبال ہی نے ایسے افراد کے بارے میں کہا ہے ع ''صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم!'' سورۃ الانبیاء کے الفاظ یاد آ رہے ہیں' فرمایا: ﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ﴾ (الانبیاء:۱۸) ''ہم ضرب لگاتے ہیں باطل پر حق کے ساتھ''۔ یہ اللہ کی سُنّت ہے۔ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی!

یہ قوت بنیادی حقیقت سلوکِ اسلامی اور سلوکِ روحانی کی معراج ہے۔ اگر کتاب و سُنّت اور سیرتِ صحابہؓ سے سلوک کی منازل کو سمجھا جائے تو یہی ہے جو کچھ سامنے آتا ہے۔ چنانچہ تقرّب الی اللہ کے لیے دو کام کرنے ہوں گے۔ ایمان میں گہرائی' پختگی اور یقین پیدا کرنا ہوگا' معرفتِ ربّ پیدا کرنا ہوگی۔ پھر فرائض کے ذریعے اللہ کے قرب کا راستہ طے کریں' اُس وقت تک جب تک کہ حق کا بول بالا نہیں ہو جاتا' ظلم کا استیصال نہیں ہو جاتا۔ اگر وہ وقت آ جائے تو تقرّب بالنوافل کا راستہ کھلا ہوگا۔

آخری بات یہ کہ اس سلوک میں قوتِ ارادی درکار ہے۔ جس شخص کے اندر یہ عزم اور ارادہ پیدا ہو جائے' اگر وہ خود قویٔ الارادہ ہے تو ''قرآن و سُنّت'' اور ''سیرت النبیؐ و سیرتِ صحابہؓ'' ایسی دو آنکھیں ہیں جن سے وہ راستے خود طے کر لے گا۔ لیکن اگر قوتِ ارادی کمزور ہو' جیسے کہ اکثر لوگوں کی ہوتی ہے' تو کسی قویٔ الہمّت' صاحبِ عزیمت شخص کی صحبت اور اس کا قُرب درکار ہے' اس کے نزدیک رہ کر اس کی مصاحبت کے ذریعے انسان

راستہ طے کرسکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے: ﴿كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿١١٩﴾﴾ (التوبۃ) ''سچّوں کے ساتھ جڑ جاؤ!'' دراصل یہ ہے وہ سلسلۂ ارشاد جو چلا آرہا ہے کہ کسی قویٔ الہمّت' قویٔ العزم شخص کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا جائے جس پر دل ٹھک جائے کہ یہ اللہ کا بندہ ہے' بہرو پیا نہیں ہے' یہ واقفِ راہ ہے' راستے کے نشیب و فراز کو جانتا ہے' جانتا ہے کہاں کہاں غلط موڑ آتے ہیں' ایسے شخص کے ساتھ رشتہ استوار کیا جائے۔ اسی کا نام پیری مریدی ہے۔ مرید کہتے ہیں ارادہ کرنے والے کو۔ اگر اللہ تعالیٰ اِسے کسی ایسے شخص تک پہنچا دے جس پر انشراح ہو جائے' دل گواہی دے کہ یہ اللہ کا بندہ ہے' اس کے اندر خلوص و اخلاص ہے' یہ مجھے واقعتاً صحیح راہ پر چلائے گا' واقفِ راہ ہے' دین کا جاننے والا ہے' پھر یہ کہ اس دور کے تقاضوں کو بھی جانتا ہے' اس دور کی مشکلات سے بھی واقف ہے تو ایسے شخص کے ساتھ تعلق قائم کر لینا یقیناً بہت مفید اور بہت مدد ہے۔ اور مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارے عام مشاہدے کے مطابق ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ اسی طرح صحبت اور معیت سے بھی شخصیت پر اثر پڑتا ہے' اگرچہ اس کی شرائط کڑی ہیں۔ محض رسماً تعلق قائم کرنا یا خانہ پُری کرنا میرے نزدیک کسی درجے میں مفید نہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں اپنی سچی معرفت اور تعلق عطا فرمائے۔ آمین!

اقول قولی ھٰذا واستغفر اللّٰہَ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات○○

خطاب ③

اسلام کا سماجی اور معاشرتی نظام

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللہ من الشّیطٰن الرّجیم ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ﴿۱۳﴾﴾ (الحجرات)

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا ﴿۱﴾﴾ (النساء)

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱﴾ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ﴿۲﴾ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ﴿۳﴾ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ﴿۴﴾ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ﴿۵﴾ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ﴿۶﴾ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿۷﴾ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴿۸﴾ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ﴿۹﴾ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۱۰﴾ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱﴾﴾ (المؤمنون)

وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلّی اللہ علیہ وسلّم:

((اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی اَعْجَمِیٍّ وَلَا لِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰی اَسْوَدَ وَلَا اَسْوَدَ عَلٰی اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰی)) (رواہ احمد)

خطاب کا پس منظر

''اسلام کا نظامِ حیات'' کے موضوع پر سلسلہ وار خطابات کے ضمن میں آج تیسرا خطاب ہے' جس کا عنوان ہے: ''اسلام کا سماجی اور معاشرتی نظام''۔ اس سے پہلے اس سلسلہ کے دو خطابات ہو چکے ہیں —— ''اسلامی نظام کی نظریاتی اساس: ایمان'' اور ''اسلام کا اخلاقی اور روحانی نظام''۔ آج کے موضوع پر گفتگو سے پہلے یاددہانی کے طور پر ان دو خطابات پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہیں۔ ان خطابات میں سے پہلا خطاب ''اسلامی نظامِ حیات کی نظریاتی اساس: ایمان'' خالص تمہیدی تھا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ ہر فرد کی شخصیت کے دو پہلو ہیں' یعنی اس کا فکر اور اس کا عمل۔ ایک نارمل انسان میں ان دونوں کے مابین بڑا گہرا ربط ہوتا ہے اور یہ دونوں چیزیں آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ جس طرح فرد کا معاملہ ہے اسی طرح ہر اجتماعی نظام کی اساس بھی ایک نظامِ فکر پر قائم ہوتی ہے اور کسی بھی نظامِ حیات کا صحیح فہم اس وقت تک حاصل نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ اس کی نظریاتی اساس کو نہ سمجھ لیا جائے۔ چنانچہ ہم نے ایک مکمل نشست اسی کے لیے وقف کی اور یہ ثابت کیا کہ اسلامی نظامِ حیات کی بھی ایک نظریاتی اساس ہے جو ایمان ہے۔

اس سلسلہ کا دوسرا خطاب ''اسلام کا اخلاقی اور روحانی نظام'' کے موضوع پر تھا' جو عملاً انسان کی انفرادی شخصیت میں اُس ''ایمان'' کا ظہور ہے۔ گویا ہمارے دوسرے خطاب کا موضوع اجتماعی نظام نہیں بلکہ انفرادی شخصیت سے متعلق تھا۔ اس لیے کہ ایمان جب کسی انسان کے دل میں گھر کر جائے' راسخ ہو جائے' جم جائے تو وہ اس کے پورے وجود میں سرایت کر جاتا ہے' جیسا کہ سورۃ الحجرات میں اشارہ کیا گیا: ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ (آیت ۷) ''اللہ نے ایمان کو تمہارے نزدیک نہایت محبوب بنا دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں مزیّن کر دیا ہے''۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہی امتیازی شان تھی کہ ایمان صرف ان کا قول نہیں تھا بلکہ ان کا عمل بن گیا تھا۔ ایمان پہلے ان کے دل میں راسخ ہوا' پھر ان کے پورے وجود میں سرایت کر گیا اور پھر اس کا جو ظہور ہوا تو ان کے اخلاقِ حسنہ اعلیٰ درجوں تک پہنچ گئے اور ان کا فکر ہی ان کا عمل بن گیا۔

اس کے ضمن میں دو مثالوں کے حوالے سے مَیں عرض کر چکا ہوں کہ عمارت اگر بلند ہے تو اس کی بنیاد بھی اسی قدر گہری ہونی چاہیے اور درخت اگر بلند ہوتا جا رہا ہو تو اسے اپنی جڑیں بھی زمین میں نہایت گہرائی میں اتارنی پڑیں گی' ورنہ وہ قائم نہیں رہ سکے گا۔ یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ اسی طرح ایمان کی گہرائی اور عمل کی درستی' پھر اس کے نتیجہ میں اس کے اندر رفعت و بلندی اور اس کی ارتقائی شان' یہ دونوں آپس میں نسبت و تناسب کے حامل ہیں۔ ایمان اگر سطحی سا ہے تو جو مذہبی رویہ وجود میں آئے گا وہ بھی سطحی سا ہوگا۔ مثلاً ایک شخص زیادہ تر امتثالِ امر کے درجے میں نماز پڑھتا ہے کہ اللہ کا حکم ہے اس لیے نماز پڑھ رہا ہوں' تو اس کی نماز میں خشوع و خضوع اور حضوریٔ قلب کی وہ کیفیت پیدا نہیں ہوگی جس کا ذکر حدیثِ جبریل میں بایں الفاظ ملتا ہے: ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ)) (۱)۔ اب جیسے جیسے ایمان کی جڑیں گہری ہوں گی ویسے ہی اس کے عمل میں بھی نکھار آئے گا' اس میں بہار آئے گی اور ''صبغت اللہ'' گہرا ہوتا چلا جائے گا۔ اب نماز صرف امتثالِ امر اور فرض کی ادائیگی سمجھ کر نہیں ادا کی جائے گی بلکہ اس میں ذوق و شوق اور حضوریٔ قلب کی کیفیت موجود ہوگی۔

ایمان کی گہرائی سے انسان کے جملہ اخلاق' اخلاقِ حسنہ کا مرقع بن جائیں گے' اس کی شخصیت میں دلآویزی پیدا ہوگی اور ایک خوبصورت انسانی کردار وجود میں آئے گا۔ اس پر مَیں تفصیل سے عرض کر چکا ہوں۔ حضور ﷺ سے پوچھا گیا: اَیُّ الْاِیْمَانِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ جواباً ارشاد فرمایا: ((خُلُقٌ حَسَنٌ)) (۲) یعنی وہ ایمان جس کے ساتھ اخلاقِ حسنہ موجود ہوں۔ دوسری حدیث میں یہ قول مبارک سامنے آتا ہے: ((اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا)) (۳) یعنی اہلِ ایمان میں سب سے زیادہ کامل ایمان والا وہی ہوگا جو سب سے زیادہ اعلیٰ' عمدہ' دلآویز شخصیت اور سیرت و کردار کا حامل ہوگا۔ جب اور گہرائی میں اتریں گے تو ایمان کی شدّت میں اور اضافہ ہوگا' اس کی intensity

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب سؤال جبریل النبی ﷺ۔
(۲) مسند احمد بن حنبل' مسند العشرة المبشرین بالجنة' حدیث عمرو بن عبسة۔
(۳) سنن الترمذی' کتاب الرضاع' باب ما جاء فی حق المرأة علی زوجها۔

اور بڑھے گی تو اب اس کے دو نتیجے نکلیں گے: (۱) اللہ تعالیٰ کی والہانہ محبّت: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۶۵) وہ کیفیت جسے صوفیاء ان الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں: لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰہ، لَا مَطْلُوْبَ اِلَّا اللّٰہ، لَا مَحْبُوْبَ اِلَّا اللّٰہ (۲) اور پھر یہ کہ اس سے اللہ کا قرب حاصل کرنے یعنی تقرّب الی اللہ کی انتہائی تمنّا اور آرزو پیدا ہوگی۔

اسلام کے روحانی نظام کے ضمن میں جو آخری بات عرض کی گئی تھی اس کا تعلق میری آج کی گفتگو کے ساتھ ہے کہ روحانی ارتقاء یعنی ایک فرد کی ترقی، ارتقاء اور اس کے عروج کا آخری اور بلند ترین مقام تقرّب الی اللہ ہے۔ اس کے بارے میں حدیث قدسی کے حوالے سے عرض کیا گیا تھا کہ ابتدائی مراحل اخلاقِ حسنہ، ضبطِ نفس، تزکیۂ نفس، تہذیبِ نفس، پھر محبّتِ ربّ، اللہ ہی کا مقصود و مطلوب بن جانا، اللہ ہی کا محبوبِ حقیقی بن جانا ہیں اور پھر اس سے آگے بڑھ کر تقرّب الی اللہ کے مراحل آتے ہیں۔ دنیا میں ایک خانقاہی نظام جو رائج رہا ہے اس میں زیادہ زور انفرادیت پر دیا گیا ہے کہ اللہ کے ساتھ لو لگا کر بیٹھے رہیں، اسی میں انسان کو سب سے زیادہ لذّت حاصل ہوتی ہے۔ وہ جو غالبؔ کا ایک شعر ہے ؎

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت، کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوئے!

لیکن اسلام نے تقرّب الی اللہ کے اس process کو divert کیا ہے، اسے دوسری سمت عطا کی ہے کہ اس جذبے کو معاشرے کی اصلاح، معاشرے میں نیکی و بھلائی کے پرچار، بدی کے استیصال، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور دعوت الی الخیر کے لیے بروئے کار لایا جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ﴾ (آلِ عمران: ۱۰۴) ''اور چاہیے کہ تم میں سے ایک گروہ ایسا ہو جو بھلائی کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے اور بُرائی سے منع کرے۔''

شعورِ نبوت اور شعورِ ولایت

علّامہ اقبال نے اپنے ایک خطبے میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ایک ہے شعورِ نبوت اور ایک ہے شعورِ ولایت۔ اور پھر حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے واقعہ سے اس کا ایک ربط

قائم کیا ہے کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک خاص کیفیت میں تھے اور اللہ کے ساتھ لو لگی ہوئی تھی کہ اچانک اقامت کی آواز کان میں آئی تو وہ کچھ جھنجھلا کر کھڑے ہوئے کہ نماز فرض ہے' ادا تو کرنی ہے' لیکن الفاظ یہ نکلے کہ ''حضوری سے نکال کر دربانی میں کھڑا کر دیا!'' انہی کا ایک جملہ یہ بھی ہے: ''محمدِ عربی بر فلک الافلاک رفت و باز آمد' واللہ اگر من رفتمے ہرگز باز نیامدے!'' کہ محمدِ عربی ﷺ آخری آسمان تک گئے اور پھر واپس آ گئے' خدا کی قسم اگر مَیں وہاں تک پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔ یہ ہے شعورِ ولایت۔ لیکن شعورِ نبوت و رسالت یہ ہے کہ اس بلندی پر پہنچنے کے بعد حکم ہوتا ہے: ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۲۴﴾﴾ (طٰہٰ) ''فرعون کی طرف جاؤ' وہ سرکشی پر اُتر آیا ہے''۔ اب جایئے' اس بلندی سے نیچے اتریئے' اپنا فرضِ منصبی ادا کیجیے۔ وہ بلندی چاہے کوہِ طور کی تھی یا جبلِ نور کی۔ غارِ حرا کی تنہائیاں' وہاں کے مراقبے' تفکّر و اعتبار اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ربط و تعلق اور تقرّب اپنی جگہ' لیکن جب حکم الٰہی آ گیا کہ ان لذّتوں کو چھوڑیے اور جا کر دعوت الی اللہ' دعوت الی الخیر دیجیے' معاشرے کی اصلاح اور ظلم کے استحصال کے لیے کھڑے ہو جایئے تو یہ شعورِ نبوت تھا کہ آپؐ یہ حکم بجالائے۔

ظلم اور اعتدال کی کشمکش

پچھلے خطاب میں عرض کیا گیا تھا کہ ظلم دو ہی ہیں' ایک اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا جو سب سے بڑا ظلم ہے: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۳﴾﴾ (لقمان) اور دوسرا انسانوں پر ظلم۔

اجتماعی نظام میں انسانوں پر ظلم خاص طور پر تین جہتوں سے آتا ہے:

(۱) سماجی سطح پر' یعنی اونچ نیچ کا فرق' اعلیٰ اور ادنیٰ کی تقسیم' پیدائشی طور پر کسی کا اعلیٰ و ارفع اور باعزّت ہونا' اور کسی کا ادنیٰ' نیچ اور گھٹیا ہونا۔ یہ تفریق (discrimination) ظلم ہے۔

(۲) پھر اسی کی ایک صورت معاشی میدان میں استحصال کے طور پر آتی ہے۔ یعنی دولت کی تقسیم کا ایک غیر منصفانہ نظام کہ جس میں کچھ لوگ محروم ہوتے چلے جائیں اور کچھ

کے پاس ارتکازِ دولت کی شدّت بڑھتی چلی جائے۔

(۳) پھر سیاسی سطح پر ظلم کی صورت تمیز بندہ و آقا اور حاکم و محکوم کی نسبت ہوتی ہے۔ یعنی لوگوں کی حریت اور آزادی کو سلب کر کے ان کے حقوق پر ڈاکہ ڈال کر اپنے اقتدار کی مسندیں سجانا۔ اسی کے بارے میں علّامہ اقبال نے کہا تھا ع ''تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے۔''

یہ وہ تین مسائل ہیں جن کے ضمن میں بڑی بڑی فکری و عملی پیچیدگیاں ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان محتاج ہے' اسے اپنے خالق و مالک کے سامنے نقطۂ عدل و اعتدال کے لیے گھٹنے ٹیک کر استدعا کرنی پڑتی ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ (الفاتحۃ)

واضح رہے کہ انفرادی اخلاقیات میں بھی عدل و اعتدال کوئی آسان بات نہیں ہے۔ وہاں بھی ایک ''پُل صراط'' موجود ہے' ذرا اِدھر ہو گئے تو افراط اور ذرا اُدھر ہو گئے تو تفریط ہے۔ مختلف اخلاقی اَقدار کے مابین توازن اور اعتدال بھی بہت مشکل کام ہے۔ اسی کی مثال مَیں نے پچھلے خطاب میں دی تھی کہ رہبانیت کے متعلق قرآن بھی کہتا ہے کہ یہ کسی بدنیتی کے تحت ایجاد نہیں کی گئی: ﴿وَرَهْبَانِيَّةَ ِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ﴾ (الحدید:۲۷) ''اور انہوں نے رہبانیت کا طریقہ خود ایجاد کر لیا تھا' ہم نے تو ان پر یہ بات لازم نہیں کی تھی' مگر وہ اس سے اللہ کی رضا چاہتے تھے' پھر نہ نبھایا اس کو جیسا کہ اس کا حق تھا''۔ ظاہر بات ہے جنہوں نے بھی رہبانیت کا نظام ایجاد کیا تھا ان کے پیشِ نظر نیکی ہی کا جذبہ تھا' اللہ سے لو لگانا مقصود تھا' لیکن ایک شدّت تھی جو حدِّ اعتدال سے تجاوز کر گئی تھی۔

اس حوالے سے مَیں دو مثالیں پیش کر چکا ہوں کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر دی گئی کہ وہ ساری رات نماز میں کھڑے رہتے ہیں اور تمام دن روزہ رکھتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو اس سے روک رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں عبادت' زہد' تدیّن اور اتقاء کا ایک ایسا مُنہ زور جذبہ ہے جسے روکا جا رہا ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ کسی کے اندر دنیا پرستی اور لذّات پرستی کا معاملہ ہو' اس سے روکا

جائے' جبکہ یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے' لیکن یہاں بھی روکنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ یہاں بھی اگر حدِ اعتدال سے تجاوز ہو جائے تو نظام غلط ہو جائے گا اور خیر سے شر وجود میں آ جائے گا۔ اسی طرح ان تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معاملہ ہے جن کا واقعہ صحیح بخاری میں آتا ہے۔ ایک نے کہا: مَیں ساری رات نماز پڑھا کروں گا' اپنی کمر بستر سے نہیں لگاؤں گا۔ دوسرے نے کہا: مَیں شادی بیاہ کا کھکیڑ مول نہیں لوں گا۔ تیسرے نے کہا: مَیں کبھی ناغہ نہیں کروں گا' ہر روز روزہ رکھوں گا۔ لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو آپؐ نے ان کو بلا کر بڑی سختی کے ساتھ منع کیا۔ اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرزِ عمل سامنے آتا ہے کہ آپؐ نہایت غضب ناک ہوئے' یہاں تک کہ یہ غیر معمولی الفاظ ارشاد فرمائے: ''خدا کی قسم! مَیں تم میں سب سے بڑھ کر متقی ہوں' تم میں سب سے بڑھ کر اللہ کی خشیت رکھنے والا ہوں' لیکن میرا طریقہ یہ ہے کہ مَیں رات کو سوتا بھی ہوں اور عبادت بھی کرتا ہوں' مَیں روزے بھی رکھتا ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں' اور مَیں نے عورتوں سے شادیاں بھی کی ہیں۔''

اس کی ایک مثال مَیں اور دوں گا جس کا تعلق ہمارے معاشی نظام کے ساتھ ہے۔ ہماری دو اخلاقی قدریں ہیں' ایک ہے عفو اور ایک ہے قصاص۔ عفو کی اپنی اہمیت ہے کہ کسی نے آپ پر زیادتی کی ہے تو آپ اس کو معاف کر دیں۔ انفرادی ترفّع اور روحانی ترقّی اسی میں ہے' بشرطیکہ آپ قصاص یا انتقام لینے پر قادر ہوں۔ اگر آپ میں طاقت ہی نہیں ہے تو ''قہر درویش بر جانِ درویش'' کے مصداق ایک مجبوری کی کیفیت ہے' لیکن اگر آپ قصاص اور انتقام لینے پر قادر ہوں اور پھر بھی نہ لیں تو اس سے جو ترفع ہو گا' روحانی ترقی ہو گی اور آپ کا انفرادی ارتقاء ہو گا وہ نہایت قیمتی ہے: ﴿وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٤﴾﴾ (التغابن) ''اور اگر تم معاف کر دیا کرو' چشم پوشی سے کام لیا کرو اور بخش دیا کرو تو اللہ غفورٌ رحیم ہے''۔ کس قدر زوردار ترغیب و تشویق ہے عفو کی۔ دوسری طرف قصاص کے متعلق فرمایا: ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ (البقرۃ: ۱۷۹) ''اے ہوش مندو! تمہارے

لیے قصاص میں زندگی ہے''۔ اگر آپ نے قصاص کو اپنے نظام سے خارج کر دیا تو معاشرہ بگڑ جائے گا' شریروں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ اس نے آج آپ پر زیادتی کی' لیکن کوئی پکڑ نہیں ہوئی' کسی طرح کی سزا نہیں ملی تو اس کا حوصلہ اور بڑھے گا اور وہ کسی اور پر بھی زیادتی کرے گا: ﴿كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝﴾ (العلق) ''یقیناً انسان اس بنا پر سرکشی کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے''۔ آج اس نے آپ کو ایک تھپڑ رسید کیا تھا کل کسی اور کو لگائے گا' لیکن اگر اسے اس کا بدلہ مل جائے تو اس کے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے اور معاشرے کے اندر اصلاح کی شکل پیدا ہوگی۔

اب یہ دو متضاد چیزیں ہیں' ان میں توازن کیسے آئے؟ واقعہ یہ ہے کہ انفرادی اخلاقیات میں بھی نبی اکرم ﷺ کا جو اصل حصہ (contribution) اور آپؐ کا جو اصل کمال ہے وہ علیحدہ علیحدہ اخلاقی قدروں کے ضمن میں نہیں بلکہ اس میں ہے کہ آپؐ نے ان تمام اخلاقی اقدار (moral values) کو ایک حسین توازن اور بڑے اعتدال و جامعیت کے ساتھ اپنی شخصیت کے اندر سمو دیا ہے۔ یہ عدل و اعتدال اور یہ توازن درحقیقت اصل کمال ہے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا۔ چنانچہ آپ غور کریں۔ استقامت کو لیں تو حضرت نوح علیہ السلام سے آگے یہ قدر آپ کہاں تلاش کر سکیں گے؟ اللہ کا ایک بندہ ساڑھے نو سو برس تک دعوت الی اللہ پر استقامت دکھا رہا ہے۔ استہزاء ہے' تمسخر ہے' مذاق اڑایا جا رہا ہے' مخالفت ہے' لیکن پھر بھی وہ اللہ کا بندہ صدیوں تک ڈٹا ہوا ہے۔ اسی طرح تسلیم و رضا میں حضرت اسماعیل علیہ السلام سے آگے کس کا مقام ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر سرِ تسلیم خم کیے ہوئے قربان ہونے کو تیار ہو گئے: ﴿يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝﴾ (الصّٰفّٰت) ''ابا جان! آپ کر گزریے جس کا آپ کو حکم ہو رہا ہے' اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔''

ع ''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!'' زہد' ورع اور لذّاتِ دنیا سے کنارہ کشی میں حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام سے آگے کون جائے گا؟ انہوں نے تو شادی ہی نہیں کی۔ یوں سمجھیے کہ ہر اعتبار سے لذّاتِ دُنیوی سے کنارہ کشی کی انتہا آپ کو ان دونوں حضرات

میں نظر آئے گی۔ صبر میں حضرت ایوب علیہ السلام سے آگے کس کا مقام ہے کہ ''صبرِ ایوب'' ضرب المثل ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال یہ ہے کہ آپؐ نے ان تمام اقدار کو، جن میں بعض کے اندر ظاہری طور پر تضاد بھی پایا جاتا ہے، عدل و اعتدال اور توازن کے ساتھ اپنی شخصیت میں سمو دیا ہے۔

اجتماعی نظام میں عدل و اعتدال کی تلاش

اس گفتگو سے مَیں جو نتیجہ اخذ کرنا چاہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ انسان انفرادی اخلاقیات میں بھی عدل و اعتدال اور توازن کے اعتبار سے آسمانی ہدایت کا محتاج ہے، اور اس سے بھی اہم تر اس کے لیے ایک اُسوۂ کاملہ، اُسوۂ حسنہ، ایک ایسی انسانی شخصیت ہے جس میں وہ تمام اخلاقی اقدار بتمام و کمال موجود ہوں اور جن میں عدل و اعتدال بھی ہو، توازن بھی ہو، اور جامعیت بھی ہو۔ لیکن یہ معاملہ اجتماعی نظام میں اس سے کہیں زیادہ گمبھیر ہو جاتا ہے۔ یہاں کی پیچیدگیاں، یہاں کے مسائل، یہاں کے عقدہ ہائے لاینحل ایسے ہیں جن کو انسان کا ناخنِ تدبیر حل نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے وہ محتاج ہے گھٹنے ٹیک کر اپنے رب سے استدعا کرنے کا: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نوعِ انسانی کو تین بڑے عقدہ ہائے لاینحل (dilemmas) درپیش ہیں جو توازن کے متقاضی ہیں اور ان میں عدمِ توازن سے انسانی تمدن فساد اور بگاڑ کا شکار ہے۔ ان مسائل کے ضمن میں تین متضاد چیزوں کے مابین ایک کشاکش جاری ہے اور ان میں توازن کی تلاش میں ایک مسلسل جِدّ و جُہد نظر آتی ہے۔

پہلا مسئلہ: عورت بمقابلہ مَرد: پہلے مسئلے کا تعلق انسان کی سماجی اور معاشرتی زندگی سے ہے کہ عورت اور مَرد کے درمیان حقوق و فرائض کا توازن ذرا اِدھر ہو گیا تو عورت ملکیت بن کر رہ گئی۔ جیسے بھیڑ بکری کسی کی ملکیت ہے ایسے ہی بیوی بھی ملکیت بن کر رہ گئی کہ اس کا کوئی قانونی تشخص نہیں، کوئی قانونی حیثیت نہیں، کوئی عزّتِ نفس نہیں، کوئی حقوق نہیں، بلکہ ہماری زبان کے محاورے کے مطابق تو وہ جوتی کی نوک کے برابر ہو گئی۔ اور اگر معاملہ ذرا اُدھر ہو گیا تو شانہ بشانہ اور ہر اعتبار سے مساواتِ مَرد و زَن قائم ہو گئی، بلکہ اس

سے بھی آگے بڑھ کر کوئی قلوپطرہ ہے جو قوموں کی قسمت کے فیصلے کرتی ہے۔ عورت اور مَرد کے مابین آپ کو یہ افراط وتفریط ملے گی۔ اس مسئلہ میں نقطہ عدل واعتدال کی تلاش انسان کے بس میں نہیں ہے۔

دوسرا مسئلہ: فرد بمقابلہ اجتماعیت: دوسرے مسئلے کا تعلق سیاسی نظام سے ہے اور وہ مسئلہ ہے: فرد بمقابلہ اجتماعیت۔ اجتماعیت کی مصلحتیں کچھ اور ہیں جبکہ فرد کی انفرادیت اور اس کی آزادی کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ فرد کی آزادی کو کہاں تک ملحوظ رکھا جائے اور اجتماعی مفادات پر فرد کی آزادی کو کہاں تک قربان کیا جائے' ان کے درمیان کیا توازن (balance) ہو' اس مسئلہ میں بھی آپ کو ایک مسلسل جِدّ وجُہد نظر آئے گی۔ اس لیے کہ ذرا اِدھر چلے جایئے تو مادر پدر آزادی اور آزادی کی وہ انتہا ہے کہ انسان جو چاہے کرے۔ وہ برہنہ ہو کر سڑک پر نکلنا چاہتا ہے تو اس کو حق حاصل ہونا چاہیے' کیونکہ وہ آزاد ہے اور اس پر یہ قدغن کیوں ہو کہ وہ کپڑے پہنے؟ جیسے حیوانات مادر پدر آزاد ہیں کہ وہ جہاں اور جیسے چاہتے ہیں اپنے جنسی جذبے کی تسکین حاصل کر لیتے ہیں' ایسے ہی انسان کو بھی آزادی ہونی چاہیے کہ وہ اپنے جذبات کی تسکین جہاں اور جس سے چاہے حاصل کر سکے۔ یہ خواہ مخواہ کی قدغنیں اور بندشیں سماج نے لگا دی ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر انسان کو اپنے معاملات میں قانون سازی کا مطلق اختیار حاصل ہو کہ وہ جو چاہے قانون بنائے۔ اگر کوئی سوسائٹی دو مَردوں یا دو عورتوں کی شادی کو جائز قرار دینا چاہے تو کوئی روک ٹوک نہ ہو' کیونکہ وہ اپنے معاملات میں آزاد ہے۔ ایک طرف یہ مادر پدر آزادی ہے تو دوسری طرف ہمہ گیریت (totalitarion) کہ ایک معاشرہ' ایک نظام کی حاکمیت ہو' جس میں فرد کی آزادی کو بالکلیہ ختم کر کے اس کو اجتماعی مشین کا ایک بے جان پُرزہ بنا دیا جائے جو اپنے ہر معاملے میں' حتیٰ کہ ذاتی معاملات میں بھی' معاشرے کے قانون کا پابند ہو اور اپنی مرضی سے کچھ نہ کر سکے۔ اس مسئلہ میں بھی آپ کو توازن کی ایک مسلسل کوشش نظر آئے گی۔

تیسرا مسئلہ: سرمایہ بمقابلہ محنت: تیسرا مسئلہ انتہائی پیچیدہ ہے اور اس نے درحقیقت کوئی تین سو سال سے نہایت شدّت اختیار کر لی ہے' اور وہ ہے سرمایہ بمقابلہ

محنت۔ صنعتی انقلاب نے مشین کی ایجاد سے اس مسئلے کو نہایت گمبھیر بنا دیا ہے۔ یہ مسئلہ پہلے بھی تھا مگر بڑا سادہ' اس کے اندر وہ پیچیدگیاں اور مشکلات نہ تھیں جو آج پیدا ہو گئی ہیں۔ ایک سرمایہ دار ایک کارخانہ لگا کر ہزارہا لوگوں کی محنت سے انتفاع کر رہا ہے' اب اس سے جو پیداوار حاصل ہو رہی ہے اس کے ضمن میں یہ کیسے معیّن کیا جائے کہ اس میں سرمائے کا کتنا عمل دخل ہے اور محنت کا کتنا؟ اور پھر اس میں عدل وقسط کا تقاضا کیسے پورا کیا جائے؟ اس کھینچ تان میں بظاہر تو فریقین کو آزادی ہے۔ مزدور آزاد ہے' اگر اسے اس کی مرضی کے مطابق مزدوری مل رہی ہے تو کام کرے' ورنہ نہ کرے۔ اس طرح سرمایہ دار کو بھی آزادی ہے' چاہے وہ اپنا کارخانہ چلائے' چاہے اس کو بند کر دے۔ لیکن یہ آزادی کس قدر غیر مساوی (unequal) ہے کہ ایک سرمایہ دار کارخانے دار سالہا سال بھی اپنا کارخانہ بند رکھے تب بھی اس کے بچوں کو فاقہ نہیں آئے گا' جبکہ مزدور کو اگر چند دن کام نہ ملے تو اس کے بچوں کو فاقہ آ جائے گا۔ اب اگر سرمایہ دار کو ذرا زیادہ حقوق دے دیں تو جدید اصطلاح میں یہ ''سرمایہ شاہی'' کا معاملہ ہو جاتا ہے اور ذرا سا مزدوروں کو زیادہ حق دے دیجئے تو کام رک جاتا ہے۔ اس کا تجربہ ہمارے ہاں ہو چکا ہے کہ ایک دور میں مزدور کو عزّتِ نفس ملی اور اس کے حقوق کا زیادہ خیال رکھا گیا تو اس کا پہلا منفی نتیجہ یہ نکلا کہ مزدور نے کام کرنا چھوڑ دیا۔

یہ اصل میں وہ تین عقدے اور پیچیدہ مسائل ہیں جن میں عدم توازن کا شدید احتمال پایا جاتا ہے اور اس کے لیے نوعِ انسانی کی اجتماعی جِدّوجُہد (by hit & trial) جاری ہے کہ پہلے ایک نظام کو آزمانا پھر دوسرے کو آزمانا' پھر ایک کی کوکھ سے اس کی خامی کی وجہ سے اس کے ردِّعمل کا برآمد ہونا اور اس ردِّعمل کے نتیجے میں پھر کسی اور نظام کا سامنے آنا۔ گویا افراط وتفریط کے دھکے ہیں جو نوعِ انسانی مسلسل کھا رہی ہے۔

نظاموں کی وحدت اور مختلف نظاموں کے نمائندہ الفاظ

اس ضمن میں ایک نکتہ اور سمجھ لیجیے۔ دنیا میں جو مختلف سماجی' معاشی اور سیاسی نظام موجود ہیں' ان تینوں کو اگرچہ ہم نے سمجھانے کے لیے علیحدہ علیحدہ بیان کیا ہے' لیکن یہ

درحقیقت ایک وحدت اور ایک حیاتیاتی اکائی (organic whole) بن جاتے ہیں جس کو انگریزی میں Politico-Socio-Economic System سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان کے درمیان ''-'' ڈالا جاتا ہے جو ان کو علیحدہ بھی ظاہر کرتا ہے اور جوڑتا بھی ہے۔ اس وقت دنیا میں جو دو پولٹیکو سوشیو اکنامک سسٹم بالفعل قائم ہیں' ان میں سے ہر ایک کے کچھ ''کیچ ورڈز'' ہیں جو اُس نظام کے مرکزی خیال کی نمائندگی کرتے ہیں اور وہی ان نظاموں کے اندر تقدیم و تاخیر اور اوّلیت و ثانویت کو معیّن کرتے ہیں۔ ایک نظام کا نمائندہ لفظ (catch word) ہے آزادی (freedom) اور دوسرے نظام کا مساوات (equality)۔ یہ اقدار کس حد تک حاصل کی جاسکی ہیں' اس کو چھوڑ دیجیے' لیکن یہ ان کے نظاموں کی قدریں ہیں۔ کون کہے گا آزادی اچھی قدر نہیں اور کون کہے گا مساوات بُری شے ہے؟

اسلامی نظام کا مرکزی خیال: عدل وقسط

اگر ہم اسلامی نظام کا مرکزی خیال معیّن کرنا چاہیں تو وہ ہے عدل اور قسط' انفرادی اخلاق میں بھی اور اجتماعی نظام میں بھی۔ یوں کہیے کہ اسلام آزادی اور مساوات کے درمیان بھی اعتدال اور توازن قائم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اجتماعی نظام کے لیے عدل وقسط کا لفظ بہت شدّت کے ساتھ آیا ہے۔ سورۂ آلِ عمران' آیت ۱۸ میں اللہ تعالیٰ کی شان بایں الفاظ بیان ہوئی:

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ﴾

''اللہ نے گواہی دی کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے بھی (گواہی دی)۔ وہی انصاف قائم کرنے والا ہے۔''

سورۂ آلِ عمران کے بعد سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ دونوں مقامات پر فرمایا گیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ (النساء:۱۳۵)

''اے اہلِ ایمان! کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ عدل کو قائم کرنے کے

لیے اللہ کے گواہ بن کر'' ـــــ اور:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫﴾ (المائدۃ:۸)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بن جاؤ۔''

قَامَ یَقُوْمُ بمعنی کھڑا ہونا اور اس سے قَوَّام فعال کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے بمعنی پوری طاقت اور پورے اہتمام سے کھڑا ہونے والا۔ ان آیات میں قَوّٰمِین کے ساتھ بِالْقِسْط آیا ہے تو معنی ہوگا: عدل کو قائم کرنے کے لیے پوری قوت اور پوری ہمت کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ! سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ کی مندرجہ بالا آیات میں الفاظ کی ترتیب تھوڑی مختلف ہے لیکن دونوں کا مضمون ایک ہے اور وہ ہے قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ۔ (۴)

اس موضوع کا نقطۂ عروج سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ ہے' جو اس موضوع پر قرآن مجید کی اہم ترین آیت ہے' جس میں اللہ تعالیٰ نے رسولوں کی بعثت' کتابوں کا نزول' وحی کا اجراء' شریعت کا عطا کیا جانا وغیرہم کا اصل ہدف اور ان کی غایت کو بایں الفاظ بیان کیا ہے: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ﴾ ''ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو بینات کے ساتھ''۔ یعنی واضح نشانیوں' معجزات اور واضح تعلیمات کے ساتھ۔ بینات کا لفظ سب کا احاطہ کرتا ہے۔ ﴿وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ﴾ ''اور ہم نے نازل کی ان کے ساتھ کتاب اور میزان''۔ اور یہ سب کچھ اس لیے کیا: ﴿لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾ ''تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں''۔ اگر ایسا نہیں ہو رہا' کتاب کی محض تلاوت ہو رہی ہے' اس پر علمی مباحث ہو رہے ہیں' یا اس پر تحقیقی مضامین اور تصانیف شائع کی جا رہی ہیں تو درحقیقت اس کا اصل مقصد حاصل نہیں ہو رہا۔ یہ تو سب تمہیدی مقدمات ہیں'

---

(۴) اس ترتیب کے بدلنے میں ایک اشارہ یہ بھی ہے کہ اللہ اور عدل وقسط گویا مترادف الفاظ ہیں۔ ایک جگہ حکم ہے ''گواہ بن جاؤ اللہ کے'' اور دوسری جگہ فرمایا: ''گواہ بن جاؤ قسط کے''۔ ایک جگہ فرمایا: ''کھڑے ہو جاؤ قسط (عدل وانصاف) کے لیے'' جبکہ دوسری جگہ ارشاد ہوا کہ ''کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لیے''۔ معلوم ہوا کہ اللہ اور قسط کے الفاظ جو ایک دوسرے کی جگہ آئے ہیں' آپس میں مترادف ہیں۔ (بیان القرآن' ج ۲' ص ۲۱۳) (حاشیہ از مرتّب)

درحقیقت ان چیزوں کا مقصود ہے: ﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ ''تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہو سکیں۔''

اس آیت میں دو الفاظ کتاب اور میزان آئے ہیں' جبکہ سورۃ الشوریٰ میں بھی یہی مضمون بایں الفاظ آیا ہے: ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ؕ﴾ (آیت ۱۷) ''اللہ وہ ہے جس نے کتاب اور میزان اُتاری حق کے ساتھ''۔ اس آیت سے دو آیات پہلے فرمایا: ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۵) ''اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے مابین عدل قائم کروں''۔ یہ نہ سمجھنا کہ مَیں صرف واعظ' مبلّغ' مربّی اور مزکّی بن کر آیا ہوں۔ یہ سارے کام بھی مجھے کرنے ہیں' لیکن ان سارے کاموں کی منزل اور اس کا ہدف یہ ہے کہ تمہارے مابین عدل قائم کروں۔

اسی سورۃ الشوریٰ میں ذرا اور آگے جا کر ایک مضمون آیا ہے کہ جس شخص پر ظلم کیا جائے وہ بدلہ اور انتقام لے تو اس پر کوئی ملامت نہیں' کوئی الزام نہیں: ﴿وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۱﴾﴾ ''اور جو کوئی اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد بدلہ لے لے تو ایسے لوگوں پر کوئی الزام نہیں''۔ ﴿اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾﴾ ''بے شک الزام تو اُن پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں۔ ان ہی لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے''۔ وہ حق تلفی اور ظلم چاہے سیاسی جبر کی شکل میں ہو یا معاشی استحصال کی شکل میں یا سماجی سطح پر discrimination اور اونچ نیچ کی شکل میں' وہ ملامت کے حق دار ہیں۔ باقی جن پر ظلم کیا گیا ہو اگر وہ بدلہ لیں تو ان پر کسی قسم کی کوئی ملامت نہیں ہے۔ اس بات کو سورۃ النساء میں اس طرح فرمایا گیا: ﴿لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ﴾ (آیت ۱۴۸) ''اللہ کو کسی بُری بات کا بلند آواز سے کیا جانا پسند نہیں ہے مگر اس شخص کے لیے جس پر ظلم ہوا ہو''۔ اگر مظلوم کی زبان سے جو آہ نکل رہی ہے اس میں حدِ اعتدال سے تجاوز ہو جائے تو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے گا' اس لیے کہ اس پر ظلم ہوا ہے۔

''نظام'' ایک جدید اصطلاح

''اسلام کا نظامِ حیات'' یا ''نظامِ عدل اجتماعی'' یا ''نظامِ عدل وقسط'' کے ضمن میں ایک اور بات عرض کرتا چلوں کہ یہ ''نظام'' کا تصوّر ایک جدید تصوّر ہے۔ نظام کا لفظ قرآن اور حدیث دونوں میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ہمیں دیا ہے وہ اوامر ونواہی اور احکامِ شریعت ہیں اور استقلال' دوام اور اصل اہمیت ان احکام ہی کو حاصل ہے۔ ہم ان احکام کو جوڑ کر' مربوط کر کے' ان میں ربط قائم کر کے اپنے فہم اور سمجھ کے مطابق ایک نظام پیش کرتے ہیں۔ مثلاً وہ احکام اور اوامر ونواہی جو معاشرتی زندگی سے متعلق ہیں انہیں ہم جمع کر کے کہیں گے یہ اسلام کا معاشرتی نظام ہے' حالانکہ قرآن مجید میں اسلام کے معاشرتی نظام کا کوئی الگ باب (chapter) نہیں ہے اور حدیث کے مجموعوں میں بھی معاشرتی نظام کا علیحدہ باب موجود نہیں ہے۔ اسی طرح سے مالی امور سے متعلق احکام میں کچھ چیزیں حرام کی گئی ہیں' مثلاً سود' جوا وغیرہ' جبکہ کچھ چیزوں کی ترغیب دلائی گئی ہے' مثلاً انفاق فی سبیل اللہ' اور کچھ چیزیں فرض کی گئی ہیں' مثلاً زکوٰۃ۔ فقہاء ان احکام کی درجہ بندی کرتے ہیں کہ کیا واجب ہے' کیا مستحب ہے' کیا مسنون ہے' کیا مکروہ ہے اور پھر مکروہ کی مزید تقسیم کہ کیا مکروہِ تنزیہی ہے' کیا مکروہ تحریمی ہے اور کیا حرام مطلق ہے۔ اس درجہ بندی کے لیے بڑے گہرے فہم اور تفقہ فی الدّین کی ضرورت ہے۔

درحقیقت دین میں اصل اہمیت انہی احکام کی ہے۔ ان احکام کی حیثیت گویا ان اینٹوں کی ہے جن کو جوڑ کر ہم دیوار بناتے ہیں۔ کوئی معمار اینٹوں کو کسی انداز میں رکھنا پسند کرتا ہے اور کسی کی ترتیب کوئی اور ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اسلام کا معاشرتی نظام' اسلام کا سیاسی نظام' اسلام کا معاشی نظام جو ہم ان اینٹوں کو جوڑ کر بنا رہے ہیں' تو ان میں جو ربط اور ترتیب قائم کی گئی ہے وہ ہمارے اپنے ذہن کی پیداوار ہے' اس لیے اس میں خطا کا امکان ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک اینٹ جو بنیاد کی تھی اسے ہم نے چوٹی پر لگا دیا ہو' کوئی شے جو اہم ترتھی ہم نے اسے کم اہم سمجھ لیا ہو اور کوئی چیز جو ثانوی درجے کی تھی اس کو اوّلیت دے دی ہو۔ اس لیے ہمیں یہ بات ذہن نشین کر لینی

چاہیے کہ اصل شے دین کے احکام اور شریعت کے اوامر ونواہی ہیں' جن پر ہمارے اسلاف نے بڑی محنتیں کی ہیں' پوری پوری زندگیاں کھپائی ہیں اور پھر ان کو مرتّب اور مدوّن کیا ہے۔ آج ہمارے علم میں ہے کہ وہ کون سی چیزیں ہیں جن پر سب متفق ہیں اور وہ کونسی چیزیں ہیں جن میں اختلاف ہے۔ اگر اختلاف ہے تو کس اصول اور کس بنیاد پر ہے' کن اصولِ فقہ سے یہ استنباط ہوا ہے اور یہ رائے وجود میں آئی ہے۔ یہ ہمارا بہت بڑا علمی ذخیرہ اور بہت بڑا علمی وِرثہ ہے' اور اصل شے وہی ہے۔ باقی جو ہم ربط وترتیب کے نظم میں پرو کر ایک نظام وجود میں لاتے ہیں اس کے بارے میں ہمیشہ یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہ ترتیب ہمارے ذہن کی تخلیق ہے' اس میں ہماری سوچ' ہماری ترجیحات' ہمارا ذوق وشوق اور ہمارا مزاج لازماً اثر انداز ہوا ہے۔ لہٰذا اس کے ربط وترتیب میں غلطی کا امکان ہے۔

معاشرتی نظام کی خصوصی اہمیت

ان تین (معاشرتی' معاشی اور سیاسی) نظاموں کی ترتیب کے حوالے سے مَیں ایک بات آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ اگر ہم اجتماعیت کی تین منزلیں قرار دیں تو اس کی پہلی اور بنیادی منزل عائلی اور معاشرتی نظام ہے۔ یہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود انسان قدیم ہے۔ یہ انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی وجود میں آ گیا تھا۔ قرآن حکیم میں رشتہ ازدواج کے متعلق فرمایا گیا: ﴿خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾ (النساء:۱) ''پیدا کیا اسی میں سے اس کا جوڑا''۔ یہ جو مَرد اور عورت کے حقوق وفرائض کے توازن کے حوالے سے مَیں نے مسئلہ بیان کیا وہ قدیم ترین مسئلہ ہے۔ آپ پولیٹکل سائنس میں تمدنی اور عمرانی ارتقاء کے متعلق پڑھتے ہیں' اسی طرح اس مسئلہ میں بھی ارتقاء ہوتا چلا آ رہا ہے اور قرآن کے نزول کے بعد بھی اس کا ارتقائی عمل جاری رہا ہے۔ اس کے برعکس معاشی معاملات اور ذرائع پیداوار وغیرہ جیسے مسائل بہت بعد میں وجود میں آئے ہیں۔ صنعتی انقلاب تو قرآن مجید کے نزول کے ایک ہزار برس بعد آ رہا ہے۔ لہٰذا معاشی اور سیاسی نظاموں کے بارے میں قرآن مجید نے زیادہ تر صرف اصول دیے ہیں۔

میرے ذہن میں ان نظاموں کے حوالے سے ترتیب یہ ہے کہ قرآن حکیم نے

عائلی اور سماجی و معاشرتی نظام کے لیے تفصیلی احکام دیے ہیں' بلکہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مکمل نظام دیا ہے۔ اس کو بھی اگر دو حصّوں یعنی عائلی نظام اور معاشرتی نظام میں تقسیم کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن نے عائلی نظام پر مکمل قانون دیا ہے۔ جتنی مفصّل بحثیں قرآن میں اس موضوع کے عملی معاملات سے متعلق آئی ہیں' کسی اور موضوع سے متعلق نہیں آئیں۔ عائلی قوانین مثلاً طلاق' عدّت' مہر' رضاعت' پھر طلاق کی مختلف شکلیں' یہ تمام معاملات قرآن میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ سورۃ البقرۃ میں تقریباً چار رکوع' پھر سورۃ النساء' سورۃ النّور' سورۃ الاحزاب' سورۃ المجادلہ' سورۃ الممتحنہ اور سورۃ الطلاق میں عائلی و معاشرتی قوانین سے متعلق اتنی طویل بحثیں اور تفصیلی احکامات آئے ہیں کہ زندگی کے کسی اور گوشے سے متعلق قرآن مجید میں آپ اتنی تفصیل نہیں پائیں گے۔ لہٰذا جہاں تک عائلی نظام ہے وہ تو مکمل تفصیلات کے ساتھ قرآن مجید میں موجود ہے۔ اسی طرح معاشرتی نظام کے ضمن میں بھی کافی تفصیلی احکام موجود ہیں۔ لیکن معاشی نظام کے متعلق قرآن میں زیادہ تر اصول بیان ہوئے ہیں جبکہ چند ایک احکام موجود ہیں' مثلاً زکوٰۃ کی فرضیت' سود اور جوئے کی حرمت' لین دین کے معاملات وغیرہ۔ جہاں تک سیاسی نظام کا تعلق ہے اس ضمن میں تو میرے نزدیک قرآن میں حکم کوئی بھی نہیں آیا' کوئی ڈھانچہ سرے سے دیا ہی نہیں گیا' صرف اصول دیے گئے ہیں۔

تو یہ اہمیت ہے معاشرتی نظام کی۔ اس پر گفتگو کرتے ہوئے ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریّا می رود دیوار کج!

جب بنیادی منزل یہی ہے تو اس میں اگر ٹیڑھ آ جائے گا تو اوپر کی ساری تعمیر ٹیڑھی ہو گی۔ پھر یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ نظام قدیم ترین ہے اور یہ اجتماعیت کی کوئی نئی شکل نہیں ہے۔ مرد اور عورت کا معاملہ جیسا پہلے تھا ویسا آج بھی ہے' اس میں کوئی نئی جہت (dimension) کا اضافہ نہیں ہوا۔

معاشرتی نظام کی اساسِ اوّل: مساواتِ انسانی

سماجی و معاشرتی نظام کی اہمیت کو بیان کرنے کے بعد اب ہم اس نظام کی اساسِ اوّل کی طرف بڑھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ اسی حوالے سے انسان پر ظلم ہوا ہے اور آج تک ہو رہا ہے۔ اس کی اساسِ اوّل ہے: سماجی سطح پر کامل انسانی مساوات کہ تمام انسان پیدائشی طور پر مساوی ہیں' کوئی اونچا نہیں کوئی نیچا نہیں' کوئی اعلیٰ نہیں کوئی ادنیٰ نہیں' کوئی افضل نہیں کوئی مفضول نہیں' انسانیت میں سب برابر کے شریک ہیں۔ مَیں یہ لفظ نوٹ کرا رہا ہوں پیدائشی طور پر' یعنی شکل وصورت' رنگ ونسل اور زبان کے اعتبار سے سب انسان برابری کی سطح پر ہیں۔ پیدائشی طور پر ایک اور اہم چیز ہے ''جنس''، یعنی مَرد اور عورت ہونے کے اعتبار سے بھی شرفِ انسانیت میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔ پیدائشی چیزوں میں سب برابری کی سطح پر ہیں۔ پھر یہ کہ اکتسابی چیزوں میں بھی پیشے وغیرہ کی حد تک کوئی ادنیٰ نہیں' کوئی اعلیٰ نہیں۔ ان تمام پہلوؤں سے شرفِ انسانیت میں کامل مساوات ہے۔

مَیں عرض کر چکا ہوں کہ عدم مساوات انسانی دنیا میں قدیم ترین ظلم ہے جو انسانوں پر ہوا ہے۔ ہندوستانی تہذیب میں پیدائشی طور پر انسانوں کی تقسیم کی گئی ہے کہ یہ برہمن ہے' اس کے حقوق زیادہ ہیں اور یہ شودر ہے جسے معاشرے میں جانوروں سے بدتر قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح رنگت کی بنیاد پر بھی معاشرتی تفریق موجود ہے' مثلاً امریکہ میں آج بھی رنگت کے اعتبار سے انسانوں کو حقوق دیے جاتے ہیں۔ وہاں تعلیم اور قانون وغیرہ کے ذریعے بڑی جِدّوجُہد کی گئی ہے کہ رنگ کی بنیاد پر جو تفریق (discrimination) ہے یہ ختم ہو جائے' لیکن یہ تصوّر ان کے احساسات میں اس طرح رچا بسا ہوا ہے کہ ان کے دلوں سے نکلتا نہیں۔ ایک حجاب ہے جو ان کے دل ودماغ پر طاری ہے کہ مَن دیگرم تو دیگری! یہ اور ہے وہ اور ہے' یہ اعلیٰ ہے یہ ادنیٰ ہے' یہ اونچا ہے یہ نیچا ہے۔

اس سلسلہ میں قرآن مجید کا انقلابی پیغام سورۃ الحجرات کی آیت ۱۳ میں دیا گیا ہے' جو مَیں نے خطاب کے شروع میں تلاوت کی تھی:

﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۳﴾﴾ (الحجرات)

''اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہاری ذاتیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے بڑھ کر متقی ہے۔ یقیناً اللہ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزّت کا دار و مدار تقویٰ اور سیرت و کردار پر ہے۔ یعنی ایمان کا جو نتیجہ انسان کی انفرادی سیرت' شخصیت' اخلاق اور کردار میں نکلا ہے اس کی بنا پر انسانوں کی درجہ بندی ہے' ورنہ تو سب بنی نوع انسان ایک انسانی جوڑے حضرت آدم و حوا کی اولاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو قوموں میں تقسیم کر دیا' رنگتیں جدا کر دیں' ناک نقشے بدل دیے' اکتاہٹ کا شکار کرنے والی یکسانیت (monotony) نہیں رکھی۔ اس لیے یہاں رنگا رنگی ہے' جو اللہ تعالیٰ کی خلّاقی اور قوتِ تخلیق کا ایک مظہر ہے' لیکن ان میں سے کوئی شے کسی شرف' عزت اور کسی اعلیٰ و ادنیٰ کی تقسیم کی بنیاد نہیں بن سکتی۔ اگر کسی معاشرے یا تہذیب میں ایسی کوئی تقسیم یا معاشرتی تفریق ہے تو یہ بہت بڑا ظلم ہے۔

احادیثِ نبویہؐ میں بھی کامل انسانی مساوات کے انقلابی پیغام کا ذکر بکثرت ملتا ہے۔ خطبۂ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يَا اَيُّهَا النَّاسُ! اَلَا اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَاِنَّ اَبَاكُمْ وَاحِدٌ' اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى اَعْجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ وَلَا اَسْوَدَ عَلٰى اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى)) (۵)

''لوگو! آگاہ ہو جاؤ' یقیناً تمہارا ربّ ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ خبردار! نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر'

(۵) مسند احمد' ح ۲۲۹۷۸' شعب الایمان للبیہقی ۱۸۲۰/۴۔ صحیح الترغیب للالبانی' ح ۲۹۶۴۔ راوی: جابر بن عبد اللہ الانصاری ؓ۔

اور نہ کسی سرخ و سفید رنگت والے کو کسی سیاہ فام پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی سیاہ فام کو کسی سرخ و سفید رنگت والے پر، مگر تقویٰ کے لحاظ سے۔''

اس حدیث کے حوالے سے مَیں کبھی حیران ہوا کرتا تھا کہ کیا دنیا میں سیاہ رنگت بھی کبھی فضیلت کا باعث سمجھی گئی ہو گی؟ تو میرا یہ اشکال امریکہ جا کر حل ہوا۔ وہاں ایفرو امریکنز کے اندر یہ خیال بڑا راسخ اور پختہ ہے کہ ہم افضل ہیں اور مکمل وجود ہمارا ہے جبکہ یہ گورے گھٹیا اور نامکمل ہیں۔ چنانچہ مجھ پر حدیثِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی عظمت مزید منکشف ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے وہ بات بھی فرمائی تھی کہ کسی کالے کو بھی کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ حدیث کے آخر میں فرمایا: ((اِلَّا بِالتَّقْوٰی)) یعنی فضیلت کی بنیاد صرف تقویٰ ہے، اسی بنیاد پر کوئی اعلیٰ و افضل ہو سکتا ہے۔ متذکرہ بالا آیت مبارکہ کے آخر میں بھی تقویٰ کا ذکر ہے: ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ﴾

یہاں یہ بات نوٹ کر لیجیے کہ تقویٰ ایک مخفی حقیقت ہے، جیسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک مرتبہ اپنے دستِ مبارک سے اپنے قلب مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ((اَلتَّقْوٰی هٰهُنَا، اَلتَّقْوٰی هٰهُنَا)) ''تقویٰ تو یہاں ہے''۔ یہ تقویٰ جس میں زیادہ ہے وہی اللہ کے ہاں زیادہ فضیلت والا ہے۔ ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں فرمایا کہ لوگو! ابوبکر کو جو تم پر فضیلت ہے وہ اُس کی نمازوں، روزوں اور عبادت کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ اس شے کی بنیاد پر ہے جو اُس کے یہاں ہے اور دل کی طرف اشارہ فرمایا۔ یعنی ایمان، اخلاص، تقویٰ اور اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی محبّت کا والہانہ انداز اصل فضیلت والی شے ہے۔

اسلامی مساوات پر ایچ جی ویلز کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خراجِ تحسین

ایچ جی ویلز (۱۸۶۶۔۱۹۴۶ء) نے اپنی کتاب "A Concise History of the World" میں "Muhammad and Islam" کے عنوان سے پورا ایک باب شامل کیا ہے۔ اس میں اُس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ازدواجی زندگی اور تعددِ ازدواج پر رکیک حملے بھی کیے ہیں۔ اس حوالے سے مَیں عرض کیا کرتا ہوں کہ مغربی ذہن، خاص طور پر

عیسائی ذہن حضور ﷺ کی ازدواجی زندگی اور تعددِ ازدواج کو قبول کر ہی نہیں سکتا۔ یہ کڑوی گولی ان کے حلق سے اترتی نہیں' اس لیے کہ ان کے آئیڈیل حضرت مسیح اور حضرت یحییٰ علیہما السلام ہیں اور انہوں نے ایک بھی شادی نہیں کی تھی۔ چنانچہ ان عیسائیوں کا تصوّر تو یہ ہے کہ شادی کرنا ہی گھٹیا کام ہے' اس لیے کہ اصل روحانی زندگی اور اللہ والوں کی زندگی تو ان کی ہوگی جو تجرد کی زندگی گزاریں اور گھر گرہستی کا کھکیڑ ہی مول نہ لیں۔ ایک شادی ہی ان کے حلق سے بمشکل اُترتی ہے تو متعدد شادیاں کیسے اُتر سکتی ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ ان عیسائیوں کے دلوں میں حضور ﷺ کے لیے شدید بغض ہے۔

یہی متشدّد مصنف ایچ جی ویلز اس باب میں جب "The Teachings of Islam" پر پہنچتا ہے اور خطبۂ حجۃ الوداع کا ذکر کرتا ہے تو حضور ﷺ کی عظمت کے سامنے گھٹنے ٹیک کر خراجِ تحسین ادا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ سچ ہے کہ ''اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ'' یعنی اصل فضیلت تو وہ ہے جس کا اعتراف دشمن کرے۔

ایچ جی ویلز خطبۂ حجۃ الوداع کے اقتباسات نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے:

"Although the sermons of human freedom, fraternity and equality were said before. We find a lot of these sermons in Jesus of Nazareth, but it must be admitted that it was Muhammad who for the first time in history established a society based on these principles."

''اگرچہ انسانی حریت' اخوت اور مساوات کے وعظ تو دنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان چیزوں کے بارے میں مسیح ناصری کے ہاں بھی بہت سے مواعظ حسنہ ملتے ہیں' لیکن یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہ صرف محمدِ عربی (ﷺ) تھے جنہوں نے تاریخِ انسانی میں پہلی مرتبہ بالفعل ایک باضابطہ معاشرہ انہی اصولوں پر قائم کر کے دکھایا۔''

اس حوالے سے مَیں تھوڑی سی وضاحت مزید کر دوں کہ اس کتاب کے جو نئے ایڈیشن شائع ہوئے ہیں ان میں حضور ﷺ کی مدح میں ایچ جی ویلز کی طرف سے لکھے

گئے مندرجہ بالا جملوں کو نئے مرتّبین اور ایڈیٹرز نے حذف کر دیا ہے۔ یہ جملے ان کے حلق سے نیچے نہیں اُتر پائے۔ لیکن آپ کو کسی پرانی لائبریری سے اس کتاب کا پرانا ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۲۰ء) مل سکتا ہے جس میں یہ الفاظ بعینہٖ موجود ہیں۔ مَیں نے کراچی یونیورسٹی کی لائبریری سے اس کتاب کا پرانا ایڈیشن حاصل کیا تھا' جس میں جوں کے توں یہ الفاظ موجود ہیں اور مجھے امید ہے کہ اب بھی کراچی یونیورسٹی میں یہ ایڈیشن موجود ہوگا۔ ☆

اسلامی معاشرہ کی بنیاد: اسلام

اگرچہ تمام انسان شرفِ انسانیت میں مساوی ہیں لیکن اسلامی معاشرہ انسانوں میں ایک فرق وتمیز کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ وہ فرق اور تمیز رنگ ونسل' زبان اور علاقے کی بنیاد پر نہیں' بلکہ نظریہ اور ایمان کی بنیاد پر ہے۔ یعنی ایمان لانے والے مؤمن اور انکار کرنے والے کافر آپس میں برابر نہیں ہیں۔ یہ دستوری اور قانونی فرق وتمیز ہے جو اسلام قائم کرتا ہے۔ اسلام کا معاشرہ اس معنی میں مخلوط نہیں ہے کہ نظریے اور عقیدے کا کوئی ریفرنس نہ ہو' اس لیے کہ اسلامی ریاست کی شہریت میں مسلمان اور غیر مسلم سب مساوی نہیں ہیں۔ چنانچہ یہ بات جان لیجیے کہ اسلامی معاشرہ میں مسلم اور غیر مسلم کے اعتبار سے فرق وتفاوت ہوگا' ماننے والے ایک طرف ہوں گے اور نہ ماننے والے ایک طرف۔ یہ تقسیم اقرارٌ باللسان کے درجے میں ہے۔ اسلام کی سطح پر اس تقسیم کے کئی قانونی نتائج اور مضمرات (implications) ہیں۔ اسلامی معاشرے کا سارا اوپر کا ڈھانچہ اور بنیادیں اسلامی اخوت کے اصول پر مبنی ہیں' جس کی بنیاد ''ایمان'' پر ہے۔ پھر اس ''ایمان'' کے دو حصّے ہیں' ایک یقینِ قلبی ہے جو یہاں زیر بحث نہیں آئے گا' کیونکہ جب بھی دنیا کے اندر اسلامی معاشرہ بنے گا وہ اقرارٌ باللسان کی بنیاد پر ہوگا۔ جو کوئی اللہ کو' قرآن کو' حضرت محمد ﷺ کی رسالت کو اور ان تمام بنیادی ایمانیات کو مانتا ہے جن کا ماننا ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے' تو اس معاشرے میں وہ ایک مسلمان شمار ہوگا۔

انسانی مساوات کے بارے میں ابھی ہم نے سورۃ الحجرات کی آیت ۱۳ کا مطالعہ

☆ واضح رہے کہ اب یہ کتاب "The Outline of History" کے نام سے شائع ہوتی ہے۔

کیا۔اس سورۃ کا نام بھی بڑا عجیب ہے۔ ''حجرات'' کا لفظی مطلب ہے گھروندے' کمرے یا حجرے۔ یہ درحقیقت معاشرے کی صحیح ترین تعبیر ہے' کیونکہ معاشرہ ان گھروں اور خاندانوں ہی سے وجود میں آتا ہے۔ایک خاندان معاشرہ کی اکائی ہے۔اگرچہ اس سورۃ کے نام کی اصل بنیاد تو یہی ہے کہ اس سورۃ میں یہ لفظ آیا ہے: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ۝۴﴾ لیکن حُجُرات کے لفظی معنی کے اعتبار سے اس سورۃ کے اصل موضوع اور عنوان کے مابین ایک معنوی ربط قائم ہو گیا ہے۔اس سورۃ کی آیت ۱۳ میں ارشاد ہوا کہ تمام انسان مساوی ہیں' شعوب اور قبائل کی تقسیم صرف تعارف کے لیے ہے' تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو اور یکسانیت نہ ہو۔اگر سب انسانوں کی ایک ہی رنگت اور ایک ہی شکل وصورت ہوتی تو ہم کیسے پہچان سکتے تھے؟ اب ہمیں دُور سے نظر آجاتا ہے کہ یہ کس نسل اور کس قوم کا آدمی چلا آرہا ہے۔ دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا تاریخی پسِ منظر' سماجی پسِ منظر اور تہذیبی پسِ منظر یہ ہے اور یہ فلاں ملک کا رہنے والا ہے۔اس کے ساتھ ہی اگلی آیت میں فرمایا:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۴)

''یہ بدو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے۔(اے نبی ﷺ) ان سے کہہ دیجیے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو' بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں (یعنی ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے) جبکہ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔''

یہاں پر اسلام اور ایمان کا ذکر ہے۔ اسلام پہلی منزل ہے کہ زبان سے تم نے مان لیا' لیکن مؤمن اور ایمان والا وہ ہے جس کے دل میں ایمان سرایت کر جائے۔ مَیں اس حوالے سے عرض کر رہا ہوں کہ اسلامی معاشرہ بنیادی طور پر مسلمان معاشرہ ہے۔

غیر مسلم کے حوالے سے اسلام نے دو درجے قائم کیے ہیں۔اگر تو وہ متحارب ہے یعنی وہ آپ کی' آپ کے نظریات کی اور اللہ کے دین کی دشمنی پر تُلا ہوا ہے تو اس کے ساتھ مقابلہ ہوگا۔قرآن حکیم نے متحارب غیر مسلموں کے مقابلے میں مؤمنین کی یہ شان بیان

کی: ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ (الفتح:۲۹) ''کفّار کے مقابلے میں بہت سخت ہیں''۔ ﴿اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ (المائدۃ:۵۴) ''(مسلمان کی شان یہ ہے کہ) وہ کافروں پر بہت بھاری ہے' بہت سخت ہے''۔ ﴿وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً﴾ (التوبۃ:۱۲۳) ''چاہیے کہ تمہارے اندر وہ اپنے لیے سختی محسوس کریں''۔ یہ شان مؤمن کے ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ واضح رہے کہ کفّار کے لیے یہ سخت رویّہ تب ہے جب وہ متحارب ہوں' لیکن اگر وہ متحارب نہیں ہیں تو ان کے ساتھ نیکی' بھلائی اور عدل وانصاف کا معاملہ رکھنے کا حکم ہے۔ اس سے بڑھ کر ان کے ساتھ دوستی اور قلبی محبّت کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ قرآن حکیم میں کم از کم دس مقامات پر شدّت کے ساتھ کفّار کے ساتھ دوستی' مؤدّت اور قلبی محبّت سے روکا گیا ہے۔ صرف ایک آیت میں غیر متحارب کفّار کے لیے رعایت والی بات آئی ہے:

﴿لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝﴾ (الممتحنۃ)

''اللہ تم کو منع نہیں کرتا ان لوگوں سے جو تم سے تمہارے دین کے بارے میں لڑتے نہیں ہیں اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالتے ہیں' کہ تم ان سے نیکی اور انصاف کا معاملہ کرو۔ یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔''

اس آیت میں غیر متحارب کفّار کے حوالے سے صرف یہ اجازت دی گئی ہے کہ ان کے ساتھ بھلائی کا سلوک اور انصاف والا معاملہ کرو۔ لیکن غیر مسلموں کے ساتھ قلبی محبّت و مؤدّت کا تعلق قرآن سے کہیں ثابت نہیں ہوتا۔ اس فرق وتفاوت کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے' جو درحقیقت آپ کی ایمانی غیرت کا تقاضا ہے۔ اگر وہ ڈھیلی پڑ گئی تو واقعہ یہ ہے کہ آپ کا معاشرتی معیار کمزور پڑ جائے گا' آپ کی ملّت کی بنیاد منہدم ہو جائے گی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کے لیے کچھ اور محسوس چیزیں ہیں جو ان کے معاشرے اور اجتماعیت کی اساس ہیں' جبکہ ہمارا تو سارا معاملہ ہی ہمارے عقائد پر قائم

ہے۔لہٰذا ان کُفّار کے معاملے میں ہماری غیرت وحمیت کے اندر کمی آئی تو درحقیقت اسلامی معاشرے کی بنیادیں کمزور ہوجائیں گی۔

ہمارے معاشرہ کی بنیاد اسلام ہے' اس کا حوالہ قرآن وحدیث میں ملتا ہے۔ سورۃ الحجرات ہی میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ...﴾ (آیت ۱۰) ''اہلِ ایمان تو بھائی بھائی ہیں''۔اس ضمن میں بہت سی احادیث آئی ہیں' صرف علامت کے طور پر چند ایک ملاحظہ کیجیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: (۱) ((اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ))(۶) ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔''(۲)((حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ سِتٌّ...))(۷) ''مسلمان کے مسلمان پر چھ حقوق ہیں.....''(۳)((تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَرَاحُمِهِمْ وَتَوَادِّهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ ...))(۸) ''تم اہلِ ایمان کو باہمی رحم دلی' محبّت اور ہمدردی میں ایک جسم کی مانند پاؤ گے.....'' اس سے معلوم ہوا کہ بنیادی طور پر ہمارا معاشرہ نظریاتی معاشرہ ہے اور دوسری منزل پر جا کر اسی نظریاتی بنیاد پر اسلامی مملکت قائم ہوگی۔اسلامی معاشرہ اس معنی میں مخلوط نہیں ہے کہ عقائد ونظریات کی تقسیم سے بھی بلند ہوجائے' بلکہ وہ بلند ہے رنگ اور نسل کی تقسیم سے اور ان تمام امتیازاتِ ظاہریہ کی تقسیم سے کہ جس پر دنیا کا انحصار ہے اور جو شرف وکرامت کی اساس بنا دیے گئے ہیں۔لیکن نظریہ وعقیدہ کی بنیاد پر اسلام کا پورا قانونی نظام اور پورا معاشرتی ڈھانچہ ہے۔ایک مسلمان مَرد کی شادی مسلمان عورت سے ہوگی یا زیادہ سے زیادہ کتابیہ خاتون کے ساتھ' جبکہ مسلمان عورت کا غیر مسلم کے ساتھ نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ہمارے اس قدر پختہ اصول ہیں' ہماری معاشرت کے لیے وہ بنیادیں ہیں کہ جن میں ذرا سی ڈھیل اختیار کی

---

(۶) صحیح البخاری' کتاب المظالم والغصب' باب لا یظلم المسلم المسلم ولا یسلمہ۔ وصحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب تحریم الظلم۔

(۷) صحیح مسلم' کتاب السلام' باب من حق المسلم علی المسلم رد السلام۔ وسنن الترمذی' ابواب الادب' باب ما جاء فی تشمیت العاطس۔

(۸) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب رحمة الناس والبھائم۔ وصحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب۔

جائے گی تو اس سے سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

دستوری اور قانونی سطح پر مسلم اور غیر مسلم کے درمیان فرق کے حوالے سے یہ بات ضرور ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہاں بھی معاملہ افضلیت یا مفضولیت کا نہیں ہے۔ کسی کو بھی یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ مَیں مسلمان ہوں اس لیے کافر سے افضل ہوں' کیونکہ ایمان کی فضیلت اپنی جگہ مگر آدم کی اولاد ہونے کے ناطے کافر اور مسلم دونوں ایک ہی سطح پر ہیں۔

اسلامی عائلی قوانین اور ہندوستانی مسلمانوں کی حساسیت

اس اعتبار سے مَیں واقعتاً ہندوستان کے مسلمانوں کو خراجِ تحسین پیش کرتا رہا ہوں اور آج پھر کرتا ہوں کہ انہوں نے اسلامی عائلی قوانین کے بارے میں بہت زیادہ حساس ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ وہاں ذرا سا ایک معاملہ پیش آیا تھا اور وہ بھی اسلامی قوانین کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں کی گئی تھی' بلکہ کلکتہ ہائی کورٹ کا ایک فیصلہ آ گیا تھا جس کا اثر اسلامی عائلی قوانین پر پڑ رہا تھا۔(۹) اس پر ہندوستان کے مسلمانوں کا اس قدر شدید ردِّعمل تھا کہ راجیو گاندھی کی گورنمنٹ کو گھٹنے ٹیکنے پڑے اور سپریم کورٹ کو یہ فیصلہ واپس لینا پڑا۔ وہاں تمام مسلمان اس معاملہ میں جس طرح متحد ہوئے' اس کی ایک مثال بھی پاکستان میں نہیں ملتی۔ ہم تو شریعت بل اور شریعت محاذ میں بھی اس طرح جمع نہیں ہو سکے تھے۔ وہاں پر شیعہ' سُنّی' بریلوی' دیوبندی' اہلحدیث' جماعت اسلامی اور سب مسلمان ایک پلیٹ فارم (مسلم پرسنل لاء بورڈ) پر بلاتفریق جمع ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ مجھے بتایا گیا کہ وہاں ''مسلم پرسنل لاء بورڈ'' قائم ہونے کے بعد سے ہندوستان کے مسلمان اس طرح ''بنیانِ مرصوص'' بن گئے ہیں کہ کہیں شیعہ سُنّی فساد بھی نہیں ہوا' حالانکہ اس سے پہلے کوئی

---

(۹) کلکتہ ہائی کورٹ نے شاہ بانو کیس میں یہ فیصلہ دیا تھا کہ کوئی مسلمان اگر اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور وہ مطلقہ دوسری شادی نہ کرے تو جب تک وہ زندہ رہے گی اس کا نان نفقہ طلاق دینے والے کے ذمے رہے گا۔ اس پر بھارت کے مسلمانوں نے کہا کہ یہ ہماری شریعت اور عائلی قوانین میں دخل اندازی ہے' کیونکہ شریعت نے مطلقہ کے لیے صرف عدت تک نان ونفقہ کا حق رکھا ہے۔ (مرتّب)

ماہِ محرم ایسا نہیں ہوتا تھا جس میں کوئی فساد نہ ہو۔ مَیں یقیناً انہیں سلام کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنی صحیح بیداری کا ثبوت دیا ہے کہ ہماری یہ چار دیواری ہی تو باقی رہ گئی ہے' اس کے اندر اسلامی معاشرت کے تحفظ کا ابھی ہمارے پاس ایک ذریعہ موجود ہے۔ کہیں اگر یہ چار دیواری منہدم ہوگئی تو پھر ہمارا تشخّص ختم ہوکر رہ جائے گا۔ بہرحال اس بحث کو مَیں علّامہ اقبال کے ان دو اشعار پر ختم کر رہا ہوں: ؎

کُلُّ مُؤمِن اِخوۃٌ اندر دلش
حُریت سرمایۂ آب و گِلش
ناشکیبِ امتیازات آمدہ
در نہادِ او مساوات آمدہ

غیر مسلموں کے لیے خدمتِ خلق: دعوت الی اللہ

خدمتِ خلق کا میدان بہت وسیع ہے۔ بھوکے کو کھانا کھلانا اور مریض کا علاج معالجہ بھی خدمتِ خلق ہے' اس میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق نہیں ہوگی۔ لیکن سب سے بڑی خدمتِ خلق یہ ہے کہ جس دلدل میں وہ غیر مسلم پھنسے ہوئے ہیں وہاں سے ان کو نکالنے کی کوشش کی جائے' جس جہنّم کی آگ کی طرف وہ بگٹٹ دوڑے جا رہے ہیں اس سے ان کو روکنے کی کوشش کی جائے' ان کو دعوت اِلی اللہ' دعوت اِلی الخیر اور تبلیغ دین کی جائے۔ یہ ان کی سب سے بڑی خدمت ہے' لیکن اس میں بھی بڑے توازن کی ضرورت ہے۔ خدمتِ خلق کا ایک تصوّر عالمگیر ہے کہ تمام معاشرے مشترک ہیں۔ جیسے مَیں نے گزشتہ خطاب میں عرض کیا تھا کہ ایک وہ بنیادی انسانی اخلاقیات ہیں جو پوری نوعِ انسانی کی مشترک متاع ہے' اس کے اوپر مختلف نظامِ اخلاق تعمیر ہوتے ہیں۔ اس میں اصل بحث یہ ہوتی ہے کہ اخلاق کی قوتِ محرکہ (motivating force) کون سی ہے؟ اسی طرح خدمتِ خلق کا ایک تصوّر مشترک ہے کہ بھوکے کو کھانا کھلاؤ' پیاسے کے لیے پانی کا انتظام کرو' جانوروں کے لیے بھی سبیلیں لگاؤ' یتیموں کے لیے یتیم خانے بنواؤ' بیواؤں کی خبر گیری کا اہتمام کرو' مریضوں کے علاج معالجے کا سامان کرو۔ پرانے زمانے میں کہا جاتا تھا کنویں

کھدواؤ' سرائے بنواؤ وغیرہم' یہ سب خدمتِ خلق میں شامل ہے۔لیکن اسلام اور ایمان کے اعتبار سے خدمتِ خلق کا اس سے بھی بڑھ کر تصوّر یہ ہے کہ ان کی عاقبت سنوارنے کی کوشش کرو'ان کو دین کی طرف بلاؤ' ان کو اس ظلمت سے نکالو۔ جیسے فرمایا: ﴿يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۵۷) ''وہ ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے''۔جس کے لیے قرآن پاک میں آتا ہے: ﴿قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ (التحریم:۶) ''بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے''۔اور جس کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما رہے تھے:((يَا فَاطِمَةُ بِنْتَ مُحَمَّدٍ اَنْقِذِىْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ فَاِنِّىْ لَا اَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا)) (۱۰) ''اے فاطمہ! محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی لختِ جگر! اپنے آپ کو آگ سے بچانے کی فکر کرو'اس لیے کہ اللہ کے ہاں تمہارے بارے میں مجھے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے''۔ یہ اصل خدمتِ خلق ہے جو آپ مسلمان ان غیر مسلموں کے لیے کر سکتے ہیں' جس کا نتیجہ ابدی ہوگا اور وہ جہنّم کی آگ کا ایندھن بننے سے بچ جائیں گے۔

معاشرت کا نقطۂ آغاز: رشتہ ازدواج

معاشرتی زندگی کا نقطۂ آغاز رشتہ ازدواج ہے۔ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان ازدواج کا تعلق قائم ہوتا ہے جس سے نسل آگے چلتی ہے۔اس میں ایک بڑا ٹیڑھا مسئلہ سامنے آجاتا ہے کہ اگر عورت اور مرد کو اس خاندان کے ادارے میں' جو انسانی معاشرے کی اکائی ہے' بالکل مساوی قرار دے دیا جائے تو نظم درہم برہم ہو جائے گا' خاندان کا نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گا۔ یہ ایک فطری اور سادہ سا اصول ہے جو ہر شعور رکھنے والا انسان جانتا ہے کہ کسی بھی ادارے کے دو سربراہ بالکل مساوی اختیارات رکھنے والے نہیں ہو سکتے۔اگر ہوں گے تو فساد ہوگا' بربادی ہوگی' کوئی ڈسپلن نہیں ہوگا' کوئی نظم نہیں ہوگا' اور کسی بھی وقت سارا نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گا۔اور یہ بھی جان لیجیے' جیسے

---

(۱۰) یہ حدیث الفاظ کے معمولی فرق سے متعدد کُتبِ احادیث میں وارد ہوئی ہے۔مثلاً: صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب فی قولہ: وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ۔ وسنن الترمذی' ابواب تفسیر القرآن' باب ومن سورۃ الشعراء۔ ومسند احمد' ح ۸۰۵۱۔

ہمارے اپنے اندر کا امن اور ہمارے اندر کا ضبطِ نفس ہمارے اخلاق میں ظاہر ہوتا ہے اسی طرح اگر خاندان کے اندر نظم وضبط اور ڈسپلن ہوگا تو اُسی کا عکس معاشرے میں نظر آئے گا' اور اگر خاندان کی چولیں ڈھیلی ہیں' نظم نہیں ہے' بدنظمی ہے تو پھر معاشرہ بھی بدنظمی کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ لہٰذا ان قباحتوں کے پیشِ نظر مرد وعورت کے مابین فرق قائم کرنا ایک لازمی امر ہے۔

اب فطری طور پر دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں' بیوی کو فوقیت دی جائے یا شوہر کو۔ اس لیے کہ دونوں کو مساوی نہیں رکھا جا سکتا۔ اس حوالے سے مغربی معاشرہ سب سے بڑے اندھے پن کا شکار ہے کہ جو بنیادی اور عقل عام پر مبنی حقیقت سے نہ صرف صَرفِ نظر کیے ہوئے ہے بلکہ اس کو پوری دنیا میں بالفعل قائم کرنے کے لیے ایک مسلسل جِدّوجُہد بھی کر رہا ہے۔ اہلِ مغرب نے مساواتِ مَردوزَن کا بڑا ہی خوش نما نعرہ لگایا ہے اور اس تصوّر کو ذہنوں کے اوپر اس طرح مسلّط کر دیا ہے کہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ خاندان کا ادارہ برباد ہو رہا ہے' معاشرے کی چولیں ڈھیلی ہو رہی ہیں' امن وسکون ختم ہو گیا ہے لیکن وہ کچھ کر نہیں پا رہے۔ ظاہر ہے اگر گھر کی فضا میں بیوی اور شوہر کے درمیان انتہائی گہرے اعتماد کا رشتہ نہیں ہے تو وہاں سکون کی کیفیت عنقا ہو جائے گی۔ نہ شوہر کو بیوی پر اعتماد ہو کہ وہ اس کی غیر حاضری میں کیا کرتی ہے اور نہ بیوی کو شوہر پر اعتماد ہو کہ وہ باہر جاتا ہے تو کیا کرتا ہے اور ان کے جنسی مراسم اور تعلقات کہاں کہاں ہیں' تو ایسا گھر جہنّم بن جاتا ہے اور پھر اس جہنّم کی فضا میں جو اولاد پرورش پاتی ہے اس میں بغاوت' منفی جذبات اور منفی رجحانات کا پیدا ہونا اس بے سکونی کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے۔ جیسا کہ اقبال نے کہا ہے ؏

فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور!

یعنی معاشرے میں یہ ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ (الروم: ۴۱) کی کیفیت فرنگی اور مغربی معاشرت سے آئی ہے۔

اس خاندانی نظام کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے لیے' گھر کی اس فضا میں امن وسکون'

باہمی اعتماد اور وفاداری کا احساس پیدا کرنے کے لیے اسلام نے ایک عائلی نظام دیا ہے جس کو امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''تدبیرِ منزل'' سے تعبیر کیا ہے۔ یہ گویا اجتماعیت کی پہلی سیڑھی ہے اور معاشرتی زندگی کا نقطۂ آغاز اور پہلا قدم ہے۔ اس کے لیے اسلام نے نہایت تفصیلی احکام دیے ہیں' جیسا کہ معاشرتی نظام کی اہمیت کے ذیل میں مَیں عرض کر چکا ہوں۔ لیکن ایسے محسوس ہوتا ہے کہ عورت کا اپنی ثانوی حیثیت کو قبول کرنا اور reconcile کرنا جتنا آج مشکل ہے' اتنا ہی ہمیشہ سے مشکل رہا ہے۔ عورت اپنی ثانوی حیثیت کو قبول کرنے کے لیے ذہناً تیار نہیں ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کے اندر جو شرفِ انسانیت ہے وہ اسے اس کی ثانوی اور درجہ دوم کی حیثیت قبول نہ کرنے پر اُبھارتا ہے۔ اور یہ ایک فطری تقاضا ہے کہ مَیں بھی انسان ہوں اور یہ بھی انسان ہے' فرق صرف اتنا ہے کہ یہ مَرد ہے اور مَیں عورت' یعنی صرف جنس کا فرق ہے لیکن نوع تو ایک ہے' اس اعتبار سے مَرد و زَن میں کوئی فرق و تفاوت نہیں ہے۔ اس لیے عورت اپنی ثانوی حیثیت کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتی۔

عرب معاشرہ میں عورت کا مقام

اس حوالے سے ایک اور بات بڑی عجیب محسوس ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں کچھ حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ شاید عرب معاشرہ (جس میں قرآن نازل ہوا' اور جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دعوت و تبلیغ کی اور پھر ایک انقلاب برپا کیا) میں عورت واقعتاً بالکل حقیر اور بے وقعت تھی' اسے اپنی عزّت اور اپنے مقام کا احساس تھا ہی نہیں! حالانکہ ایسا نہیں ہے' یہ مسئلہ جیسے آج شدید ہے ویسا ہی اس وقت بھی شدید تھا' البتہ یہ ضرور ہے کہ اُس زمانے میں بچیوں پر بچپن میں ظلم ہوتا تھا۔ وہ معصوم پھول جس نے چاہا مسل دیا اور جا کر خاک میں دبا دیا۔ یہ درحقیقت ان کی عزّت کا غلط جاہلی تصوّر تھا۔ اس معاشرے میں جس کو بھی بشارت دی جاتی کہ اس کے گھر بیٹی پیدا ہوئی ہے تو وہ سوچتا کہ مَیں اس توہین اور بے عزّتی کو کیسے برداشت کروں گا جو عنقریب ہو کر رہے گی کہ اس کو مجھے اپنے گھر سے رخصت کرنا ہوگا' کوئی میرا داماد بنے گا جو اس کو لے جائے گا' تو آیا مَیں اس توہین کو برداشت

کرتے ہوئے اسے زندہ رکھوں یا اس کو مٹّی میں دفن کر دوں! از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اَیُمۡسِکُهٗ عَلٰی هُوۡنٍ اَمۡ یَدُسُّهٗ فِی التُّرَابِ ؕ﴾ (النحل:۵۹) ''کیا اس کو ذلّت کے باوجود زندہ رکھے یا اس کو مٹّی میں دبا دے!'' یہ مسئلہ مجھے منفرد (isolated) معلوم ہوتا ہے' ورنہ اُس معاشرے میں بھی' مَیں دلیل سے ثابت کر رہا ہوں کہ عورت کا بھی اپنا ایک مقام اور قانونی تشخص تھا۔ اس کی سب سے بڑی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زوجۂ اوّل حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ہیں۔ کیا وہ دولت مند نہ تھیں؟ کیا وہ تجارت خود نہیں کرتی تھیں؟ کیا وہ مَردوں کو ملازم نہیں رکھتی تھیں؟ کیا خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ابتداءً ان کے نمائندے اور ایجنٹ کی حیثیت سے معاوضے پر کام نہیں کیا؟ چنانچہ عرب معاشرے میں عورت کو اعلیٰ مقام اور قانونی تشخص حاصل تھا۔

اس حوالے سے دوسری دلیل یہ ہے کہ قریش کے بڑے بڑے رؤساء سردار حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے نکاح کے خواہش مند تھے' حالانکہ وہ بیوہ تھیں۔ گویا وہاں بیوہ کے نکاح کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ پھر یہ کہ حضرت خدیجہؓ نے ان سرداروں کی درخواستوں کو از خود ٹھکرا دیا اور اپنی آزاد مرضی سے محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ نکاح کیا۔ تو یہ نہ سمجھئے کہ اس معاشرے میں عورت کا معاملہ بس وہی تھا کہ بچیوں کو دفن کر دیا جاتا تھا' بلکہ عورت کا وہاں ایک مقام تھا۔ اس اعتبار سے مَیں سمجھتا ہوں کہ اُس وقت عرب کا جاہلی معاشرہ دنیا کے دوسرے تمام معاشروں سے بہتر پوزیشن میں تھا کہ وہاں عورت کو ایک قانونی تشخص حاصل تھا' شادی بیاہ کے معاملات میں اُس کی مرضی کو دخل تھا کہ وہ شادی کی درخواست رد بھی کر سکتی تھی اور اپنی مرضی سے شادی کی درخواست قبول بھی کرتی تھی۔

مَرد کی قوّامیت کے لیے تدریجی اسلوب

عرب معاشرہ میں عورت کو جو باعزّت مقام حاصل تھا' اس حوالے سے مَیں نے جو دلائل دیے وہ صرف ایک عورت کے حوالے سے ہیں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ ایک اور حوالے سے بات زیادہ واضح ہو جائے گی۔ مَیں نے حرمتِ شراب اور مَرد کی قوامیت کے اثبات میں ایک عجیب مشابہت و مماثلت پائی ہے کہ قرآن مجید نے ان دونوں کے لیے تدریجی

اسلوب اختیار کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ معاشرہ شراب کا عادی تھا اور اسی طرح وہاں مساواتِ مَرد وزَن کا مسئلہ بھی شدید تھا' اس لیے قرآن نے تدریجاً شراب کی حرمت اور مَرد کی قوامیت کو بیان کیا۔ حرمتِ شراب کو جس طریقے سے قرآن مجید نے تدریجاً اور قدم بہ قدم نافذ کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان کی گھٹّی میں پڑی ہوئی تھی اور وہ برسہا برس سے پی رہے تھے۔ جن کی عمر ساٹھ برس تھی ان کو پیتے ہوئے پچاس برس ہو گئے تھے۔ اتنی پختہ عادت کے حوالے سے یہ آسان کام نہیں تھا کہ اس کو ایک ہی جھٹکے میں ختم کر دیا جائے۔ آج بھی یہ کہا جاتا ہے کہ شراب انسان کی عادت بن جاتی ہے اور اس کو اچانک ختم کر دینا انسان کے لیے خطرناک ہوسکتا ہے۔ اسی لیے اُس وقت یہ کام تدریج کے ساتھ کیا گیا۔ سورۃ البقرۃ' آیت ۲۱۹ میں صرف اشارہ کیا گیا ہے:

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ز﴾

''وہ آپؐ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپؐ ان سے کہہ دیں کہ ان دونوں میں بڑا نقصان ہے اور کچھ فائدے بھی ہیں لوگوں کے لیے۔''

شراب ٹانک کے طور پر بھی استعمال کی جاتی ہے اور بطور stimulant بھی' اگر اسے تھوڑی مقدار میں لیا جائے۔ اور اگر زیادہ پی لی جائے تو نشہ پیدا کرے گی۔ اسی طرح شراب دوا کے طور پر بھی استعمال ہوتی ہے اور یقیناً اُس وقت بھی ہوتی ہوگی۔ اب بھی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے اندر منفعت کے بہت سے پہلو ہیں۔ قرآن نے بھی کہا: ﴿وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾۔ لیکن آگے فرمایا: ﴿وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ﴾ ''اور ان کے نقصان' منفعت سے زیادہ ہیں''۔ یہ بس ایک اشارہ کر دیا گیا۔ اب جن کی حس بیدار ہو چکی تھی انہوں نے اشارے سے ہی بات پالی' اسی وقت تائب ہو گئے اور شراب کو چھوڑ دیا۔

اس حکم کے بعد دوسرا حکم آیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ (النساء:۴۳) ''اے ایمان والو! نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جایا کرو' یہاں تک کہ تمہیں معلوم ہو جو تم کہہ رہے ہو''۔

اُس وقت تک اہلِ ایمان میں نماز سے اُنس پیدا ہو چکا تھا' لہٰذا نماز کو استعمال کیا گیا اس عادت کو چھڑوانے کے لیے کہ ایک مسلمان سوچے کہ یہ وہ چیز ہے جو مجھے نماز سے محروم کر سکتی ہے' اس لیے مجھے اس سے دور رہنا چاہیے۔ اس کے بعد سورۃ المائدۃ کے اندر یہ آخری حکم آ گیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۹۰﴾

''اے اہلِ ایمان! یقیناً شراب اور جوا' بُت اور پانسے' یہ سب گندے کام ہیں شیطان کے عمل میں سے' تو ان سے بچ کر رہو تا کہ تم فلاح پاؤ۔''

اگلی آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝۹۱﴾ پس تم چھوڑتے ہو کہ نہیں' باز آتے ہو کہ نہیں؟ کیونکہ یہ عملِ شیطان میں سے ہے' یہ نجس اعمال میں سے ہے۔

جس طرح شراب کی حرمت کے بارے میں اور اس پختہ عادت کو چھڑانے کے لیے تدریجاً احکام نازل ہوئے بالکل اسی طرح مَرد کی قوامیت کو عورت کے حلق سے اُتارنے کے لیے قرآن مجید نے تدریجی طریق کار اختیار کیا ہے' یعنی مختلف مراحل سے گزار کر' ذہنوں کو تیار کرنے اور طبائع کو آمادہ کرنے کا عمل پورا کیا ہے۔ اس لیے کہ یہ کڑوی گولی حلق سے نیچے نہیں اُترتی۔ آج بھی عورت اس کو برضا و رغبت تسلیم اور reconcile نہیں کرتی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ (جسے مَیں بیان کر چکا ہوں) یہ ہے کہ شرفِ انسانیت خود اپنی جگہ مدّعی ہے کہ انسان ہونے کے ناطے وہ برابر ہے۔ لیکن یہ جو مَرد اور عورت کے درمیان عدم مساوات کی انتظامی ضرورت ہے اس کو کس طرح ذہنوں میں اُتارا گیا' اس کے چند اشارے آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

مَرد کی قوّامیت کے اثبات کا پہلا مرحلہ: پہلے تو ایک تسلّی و تشفّی دی گئی کہ گھبراؤ نہیں' اصل مساوات تو انسانی مساوات ہے' اصل مساوات اخلاقی مساوات ہے' خیر و شر پر معاملات کھلے ہوئے ہیں' نیکیوں کا میدان آپ کے سامنے ہے' مَرد بھی اور عورت بھی جو چاہے کمائی کریں' نیکی کمائیں' ان کے حصّہ کو کسی صورت ضائع نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ سورۂ آلِ

عمران میں فرمایا: ﴿اَنِّیۡ لَاۤ اُضِیۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی ۚ﴾ ''مَیں تم میں سے کسی بھی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا چاہے وہ مرد ہو یا عورت''۔ یعنی کسی بھی نیکی کے کام اور اکتسابِ خیر کرنے والے کی کسی کوشش کو مَیں ضائع کرنے والا نہیں ہوں' چاہے وہ کوئی مرد ہو یا عورت۔ پھر بڑی پیاری بات کہی: ﴿بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۚ﴾ ''تم سب ایک دوسرے میں سے تو ہو''۔ یعنی ایک ہی باپ کے صُلب سے بیٹا بھی ہے بیٹی بھی۔ اسی طرح ایک ہی ماں کے بطن میں بیٹا بھی پرورش پا رہا ہے اور بیٹی بھی۔ آگے فرمایا:

﴿فَالَّذِیۡنَ هَاجَرُوۡا وَاُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِهِمۡ وَاُوۡذُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِیۡ وَقٰتَلُوۡا وَقُتِلُوۡا لَاُکَفِّرَنَّ عَنۡهُمۡ سَیِّاٰتِهِمۡ وَلَاُدۡخِلَنَّهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ۚ﴾ (آیت ۱۹۵)

''پس جنہوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکال دیے گئے اور جنہیں میری راہ میں ایذائیں پہنچائی گئیں اور جنہوں نے (میری راہ میں) جنگ کی اور جانیں بھی دیں' مَیں لازماً ان سے ان کی بُرائیوں کو دور کروں گا اور داخل کروں گا انہیں ان باغات میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔''

یہاں یہ بتا دیا گیا کہ خیر کے دروازے سب کے لیے یکساں کھلے ہیں' چاہے کوئی مرد ہو یا عورت' ہر کوئی اس میں سے اپنی استطاعت اور کوشش کے بقدر حصّہ لے سکتا ہے اور اس کے حصے کو ضائع نہیں کیا جائے گا۔ انگریزی کی ایک نظم یاد آ رہی ہے جو مَیں نے میٹرک میں پڑھی تھی' جس کا عنوان تھا: ''Charity''

Charities that soothe and heal and bless.
Are scattered over the feet of men like flowers.
No mystery is here no special boon.
For the high and not for the low.
The smoke ascends as high from the hearth of a humble cottage.
As from that of a haughty palace.

''وہ تمام نیکیاں اور بھلائیاں جو سکون بخشتی ہیں اور زخموں کو مندمل کرتی ہیں اور رحمت کا باعث بنتی ہیں' انسان کے قدموں پر پھولوں کی طرح بکھری ہوئی ہیں۔ اس معاملے میں نہ کوئی راز کی بات ہے اور نہ ہی کسی پر خصوصی نوازش و کرم' بلکہ ان کا معاملہ بالکل اس دھوئیں کی مانند ہے جو کسی غریب کی کٹیا کے چولہے سے بھی اسی طرح بلند ہوتا ہے جیسے کسی مغرور انسان کے محل کے آتشدان سے!''

آگ چاہے کسی محل میں جلے چاہے کسی غریب کی کٹیا میں' دھواں تو برابر اوپر جا رہا ہے۔ اسی طرح حسنات' خیرات' نیکیاں' بھلائیاں' ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ امیر اور غریب کے اندر امتیاز نہیں ہے۔ یہ پھول سب کے سامنے بکھرے ہوئے ہیں' گلشن گلشن پھول کھلے ہوئے ہیں' چاہے مَردان سے اپنا دامن بھر لے اور چاہے عورت ان کو اپنے دامن میں سمیٹ لے۔ سورۃ النحل میں ارشاد فرمایا:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٧﴾﴾

''جو شخص بھی نیک عمل کرے گا' خواہ وہ مرد ہو یا عورت' بشرطیکہ ہو وہ مؤمن تو ہم اسے (دنیا میں) پاکیزہ زندگی دیں گے اور (آخرت میں) بدلہ دیں گے ان کے نیک اعمال کا جو وہ (دنیا میں) کرتے تھے۔''

اسی طرح سورۃ النساء میں فرمایا:

﴿لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۭ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۭ﴾

(آیت ۳۲)

''مَردوں کے لیے حصّہ ہے ان کی اپنی کمائی میں سے' اور عورتوں کے لیے حصّہ ہے ان کی اپنی کمائی میں سے۔''

جو خیر' نیکی اور بھلائی کمائے اس کا فائدہ اسی کو ہے۔ اس میں مَرد و عورت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ سب دلجوئی کا انداز ہے اور یہ جو مَرد اور عورت کے درمیان انتظامی طور پر فرق و تفاوت قائم کرنا ہے' اس کے لیے ذہن کو آمادہ کیا جا رہا ہے کہ اس اعتبار سے کوئی فرق و

تفاوت نہیں ہے۔ اسی کی مثال سورۃ الاحزاب کی آیت ۳۵ ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر یہ آیت بہت ہی اہم ہے:

﴿اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۳۵﴾﴾

''یقیناً جو مَرد اور جو عورتیں مسلم ہیں' مؤمن ہیں' مطیع فرمان ہیں' راست باز ہیں' صابر ہیں' اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں' صدقہ دینے والے ہیں' روزے رکھنے والے ہیں' اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں' اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر مہیّا کر رکھا ہے۔''

ان تمام خیرات وحسنات' نیکیوں اور بھلائیوں میں مَرد وعورت برابر ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مَرد اور عورت کو ایک گاڑی کے دو پہیوں کی حیثیت سے اگر بنایا ہے تو اس کی حکمتِ تخلیق میں ان کی نفسیاتی ساخت مختلف ہے کہ ایک میں اقدام ہے تو دوسرے میں نہیں ہے' ایک میں فعل ہے دوسرے میں انفعال ہے' ایک میں جذبہ زیادہ رکھا گیا ہے دوسرے میں نسیان اور بردباری (cool mindedness) زیادہ ہے۔ ویسے تو: ؎

خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

نہ ہر زَن زَن است و نہ ہر مَرد مَرد

بہت سی عورتیں ایسی ہوسکتی ہیں جو بہت سے مَردوں سے بڑھ کر ''مَرد'' ہوں اور بہت سے مَرد ایسے ہوسکتے ہیں کہ وہ زنانے ہوں اور بہت سی عورتوں سے بڑھ کر ''عورت'' ہوں۔ لیکن ''حُکم الاکثر حُکم الکُل'' کے مصداق مجموعی طور پر ان کی نفسیاتی ساخت میں فرق وتفاوت ہے۔ اس لیے سورۃ الملک میں فرمایا:

﴿اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۭ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۴﴾﴾

''کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے' حالانکہ وہ باریک بین اور باخبر ہے۔''

یعنی جس نے پیدا کیا ہے وہ جانتا ہے کہ اُس نے کیا پیدا کیا ہے' کیا نفسیاتی کیفیات رکھی ہیں' کیا انسان کی ساخت ہے' کیا ان کے مزاج و افتاد کا فرق ہے۔ ہمیں تو صرف بعض ظاہری چیزیں نظر آ جاتی ہیں جبکہ اللہ تو ہر خفی سے خفی شے کا جاننے والا ہے اور ہر شے سے باخبر ہے۔

دوسرا مرحلہ: یہاں تک تو پہلا مرحلہ تھا' جس میں بتایا گیا کہ نیکی کے دروازے مَرد وعورت پر یکساں کھلے ہیں اور اس معاملے میں ان میں کوئی فرق نہیں۔ اس کے بعد سورۃ البقرۃ میں دوسرا حکم آیا' جس میں تھوڑا سا قدم اٹھایا گیا:

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۖ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ﴾

(آیت ۲۲۸)

''اور عورتوں کے لیے اسی طرح حقوق ہیں جس طرح ان پر ذمہ داریاں ہیں دستور کے مطابق' اور مَردوں کے لیے ان پر ایک درجہ فوقیت کا ہے۔''

جیسے سورۃ البقرۃ میں خمر کے بارے میں صرف یہ کہا گیا: ﴿وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا﴾ اسی انداز میں یہ بات فرمائی گئی: ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۖ﴾ حرفِ جار ''لام'' حق کے لیے اور ''عَلٰی'' ذمہ داری اور فرض کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ ان الفاظ کا ترجمہ ہوگا: ''عورتوں کے ویسے ہی حقوق ہیں جیسے ان کے فرائض ہیں''۔ ان الفاظ کا ایک ترجمہ بعض حضرات نے بے دھیانی میں یوں کر دیا ہے: ''جیسے حقوق مَردوں کے عورتوں پر ہیں ویسے ہی حقوق عورتوں کے مَردوں پر ہیں''۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ ذرا صحت سے ہٹا ہوا ترجمہ ہے' کیونکہ اس ترجمہ سے تو کامل مساواتِ مَرد وزَن ہو جائے گی' حالانکہ اس کی نفی کے لیے تو یہ ساری بات کہی جا رہی ہے۔ اصل اصول جو دنیا میں ہمیشہ مانا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ''جیسی ذمہ داری (responsibility) ویسے حقوق (rights)''۔ یعنی جیسے آپ کی ذمہ داری ہے ویسے آپ کا اختیار بھی ہونا چاہیے اور جتنے آپ کے فرائض ہیں اسی طرح کے آپ کے حقوق ہونے چاہئیں۔ تو اس کا صحیح

اور عقل عام کے مطابق ترجمہ یہ ہے: ''جیسے ان کے فرائض ہیں ویسے ہی (اللہ نے) ان کے لیے حقوق رکھے ہیں''۔ آگے فرمایا: ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۭ﴾ ''اور مَردوں کو ان (عورتوں) کے اوپر ایک درجہ فوقیت کا حاصل ہے''۔ آیت کے پہلے ٹکڑے کا ترجمہ مساواتِ مَرد و زَن والا کیا جائے تو گویا یہ آیت متضاد ہو جاتی ہے کہ اس کا پہلا ٹکڑا کچھ اور کہہ رہا ہے اور دوسرا ٹکڑا کچھ اور کہہ رہا ہے۔ دوسرا ٹکڑا تو کامل مساواتِ مَرد و زَن کی نفی کر رہا ہے کہ ''مَردوں کو ان کے اوپر ایک درجہ فوقیت کا حاصل ہے۔''

یہاں قرآن کا اسلوب ملاحظہ کیجیے کہ کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں کیا گیا جس سے عورتوں کی دلآزاری ہو کہ مَردوں کو ان پر اس اعتبار سے فضیلت اور فوقیت حاصل ہے۔ بس اتنا بتا دیا گیا کہ ''مَردوں کو ان پر ایک درجہ برتری کا حاصل ہے''۔ وہ درجہ فضیلت کا ہے، اختیار کا ہے، اقتدار کا ہے، کس چیز کا ہے، اس کے بارے میں یہاں سکوت اختیار کیا گیا۔

تیسرا مرحلہ: اس بات کو آگے چل کر سورۃ النساء کی آیات ۳۲ اور ۳۴ میں مزید کھولا گیا۔ آیت ۳۲ میں بات آگے بڑھی:

﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ﴾

''مت تمنّا کیا کرو ان چیزوں کی جن میں اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دے دی ہے۔''

یہاں بھی پردہ رکھا گیا ہے اور مَرد و عورت کی بات نہیں کی گئی، لیکن ذہن کو تیار کیا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

یہاں ﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا﴾ فرما کر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا کہ کسی عورت کے لیے کتنی گھٹیا بات ہوگی کہ وہ اس شش و پنج اور حسرت میں رہے کہ کاش میں مَرد ہوتی! آج کل ہمارے معاشرے میں جو لڑکی سے لڑکا بننے کا رواج عام ہو رہا ہے وہ اسی خواہش کا ظہور ہے، جبکہ قرآن نے اس سے واضح طور پر منع کیا ہے اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے اس حرکت پر لعنت فرمائی ہے:

((لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْمُتَشَبِّهِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَاءِ وَالْمُتَشَبِّهَاتِ مِنَ

النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ))(۱۱)

''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے اُن مَردوں پر جو عورتوں کی مشابہت اختیار کریں اور اُن عورتوں پر جو مَردوں کی مشابہت اختیار کریں۔''

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے کسی کو اگر کسی پہلو سے فضیلت دی ہے تو اللہ نے جو تمہیں دیا ہے اس پر تمہیں راضی رہنا چاہیے۔ آگے فرمایا:

﴿لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ﴾

''مَردوں کے لیے حصّہ ہے ان کی کمائی میں سے اور عورتوں کے لیے حصّہ ہے ان کی کمائی میں سے۔''

یہاں پھر وہی توجّہ دلائی گئی کہ خیر، نیکی، بھلائی، خیرات، حسنات الغرض عام نیکیوں میں تو کوئی فرق ہے ہی نہیں۔ مَردوں کے لیے ان کی کمائی میں سے حصّہ ہے اور عورتوں کے لیے ان کی کمائی میں سے حصّہ ہے۔

﴿وَاسْأَلُوا اللَّهَ مِن فَضْلِهِ ۚ﴾ ''اور مانگو اللہ سے اُس کا فضل۔''

اگر اللہ نے کسی کو اس اعتبار سے تم پر فضیلت دے دی ہے تو اللہ سے سوال کرو، اللہ تمہیں کسی اور اعتبار سے فضیلت دے دے گا۔ کوئی اخلاقی و روحانی فضیلت دے دے گا۔ تم رابعہ بصری بن سکتی ہو، تم حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کی اہلیہ حضرت سُمیّہ رضی اللہ عنہا کا سا مقام حاصل کر سکتی ہو، تم ان خواتین کا مقام حاصل کر سکتی ہو جنہوں نے وہ ساری مصیبتیں جھیلیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے مَردوں نے جھیلیں۔ حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا نے ہجرت نہیں کی تھی اور ان کو وہ مصیبت آئی کہ حبشہ میں جا کر ان کا شوہر مرتد ہو گیا۔ اس طرح وہ نکاح سے فارغ ہو گئیں، لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی دلجوئی کے لیے انہیں پیغام بھیجا۔ جب تک پردے کے احکام نہیں آئے تھے تب تک آپؓ زخمیوں کی مرہم پٹی کی خدمات سرانجام دے رہی تھیں۔ اُس وقت تک تمام میدانوں میں عورتیں مَردوں کے برابر تھیں۔ اگر اللہ

---

(۱۱) صحیح البخاری، کتاب اللباس، باب المتشبھون بالنساء والمتشبھات بالرجال۔ وسنن الترمذی، ابواب الادب، باب ما جاء فی المتشبھات بالرجال من النساء۔

کی راہ میں پہلے جان دینے والے مَرد حضرت یاسرؓ ہیں تو ان کی بیوی حضرت سُمیہ ؓ بھی عورتوں میں سے پہلی شہیدہ ہیں۔ یہاں یہ بتا دیا گیا کہ آپ اللہ سے کسی اور پہلو سے فضیلت مانگ لو کہ یہ میدان کھلا ہے۔ آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿٣٢﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔''

اس کے بعد آیت ۳۴ میں آ کر بات کھولی گئی: ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ دیکھئے کس طرح اس مضمون کو ان آیات کے اندر تدریجاً آگے بڑھایا گیا ہے۔ اب وہ فیصلہ کن بات آئی ہے جو کڑوی گولی تھی: ''یقیناً مَرد عورتوں پر حاکم ہیں''۔ ''قَوَّام'' کا صحیح ترجمہ ''حاکم'' کا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ﴾ (آیت ۷۵) ''جب تک کہ تم اُس کے سر پر سوار نہ رہو''۔ یہاں بھی معنی ہوگا کہ مَرد کو عورت پر اختیار دیا گیا ہے' وہ اس کی نگرانی کرے' نگہبانی کرے اور اس کے اوپر حکومت کرے۔ یہ ہے مَرد کی قوامیت۔ ﴿بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ ''بسبب اس فضیلت کے جو اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر دی ہے''۔ اب بھی بعض کو بعض پر کہا ہے' کیونکہ عورت آسانی سے اس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی' لیکن ﴿بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ فرما کر ایک اصول کا حوالہ دیا ہے' اور دوسرا سبب اس فضیلت کا یہ بیان کیا: ﴿وَبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ﴾ ''اور بسبب اس کے جو وہ خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں میں سے۔''

اللہ تعالیٰ کا عدل یہ ہے کہ اگر اس نے مَرد کو جسمانی قوت زیادہ دی ہے تو بوجھ بھی اُسی پر ڈالا ہے اور عدل کا تقاضا بھی یہی ہے۔ یہ عدل نہیں ہے کہ ایک کمزور اور ایک قوی انسان کو آپ برابر کام کرنے کا کہیں' یہ ظلم ہے۔ عدل اور توازن تو یہ ہوگا کہ جس کی جتنی استعداد ہے اس کے مطابق اس کو مکلّف بنایا جائے' جیسے سورۃ البقرۃ میں اللہ تعالیٰ نے خود یہ اصول بیان فرمایا: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ﴾ (آیت ۲۸۶) ''اللہ کسی جان کو مکلّف نہیں ٹھہراتا مگر اُس کی استطاعت کے مطابق''۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اُس کی استعداد کے مطابق ہی مکلّف ٹھہرایا ہے۔ یہ ہے توازن' یہ ہے عدل۔ تو اللہ بہتر

جانتا ہے کہ اس نے کس کو کتنی طاقت اور کیا نفسیاتی ساخت دی ہے۔

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ﴾ کے اصول کی روشنی میں اب ہم مرد و عورت کی ذمہ داریوں کے فرق کو بیان کرتے ہیں۔ وراثت میں بیٹی کے مقابلے میں بیٹے کو دوگنا حصہ ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیٹے کو پورے خاندان کی کفالت کرنی ہے جبکہ بیٹی کے ذمے کسی کی کفالت نہیں' بلکہ وہ تو خود کسی کی کفالت میں ہوگی۔ عورت کو پورا حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مال میں سے ایک پیسہ بھی شوہر کے گھر پر خرچ کرے یا نہ کرے' اُس کی مرضی ہے۔ اس بارے میں یہاں تک آیا ہے کہ ایک خاتون نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ کیا مَیں اپنے شوہر کو زکوٰۃ دے سکتی ہوں؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں' تمہیں دوہرا اجر ملے گا۔ حالانکہ اولاد اپنے والدین کو اور شوہر اپنی بیوی کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا' اس لیے کہ بیوی تو اس کے زیرِ کفالت ہے' اس کی کفالت تو اسے کرنی ہی ہے' اس لیے زکوٰۃ میں اس کا حق نہیں ہے۔ اولاد اپنے والدین کو اس لیے زکوٰۃ نہیں دے سکتی کہ والدین کا تو حق ہے کہ آپ ان کی ہر ضرورت پوری کریں اور ان کی خدمت کریں۔ لیکن بیوی پر شوہر کی ذمہ داری نہیں ہے' لہٰذا بیوی شوہر کو زکوٰۃ دے سکتی ہے۔ یہ ایک مکمل نظام ہے' اس کی ساری چولیں بہت مربوط ہیں' اس میں آپ کسی ایک شے کو اٹھا کر علیحدہ نہیں کر سکتے۔

اسی طرح شہادت کا معاملہ ہے۔ شہادت حق نہیں بلکہ ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے' خاص طور پر فوجداری مقدمات میں بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ غنڈوں کے خلاف شہادت دے کر تو دیکھئے آپ کو دن میں تارے نظر آجائیں گے۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے اور اس کے لیے بڑی تاکید آئی ہے: ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ﴾ (البقرۃ: ۱۴۰) ''اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جس کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی شہادت ہو اور وہ اسے چھپا دے!'' شہادت تو ادا کرنا ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ۝۳۳﴾ (المعارج) ''اور (مؤمن وہ ہیں) جو اپنی گواہیوں پر قائم ہیں''۔ شہادت کی یہ ذمہ داری مرد پر ڈالی گئی ہے جبکہ عورت پر اس کا بوجھ نہیں ڈالا گیا۔

یہاں یہ اصول نوٹ کر لیجیے کہ اسلام نے عورت کو مکمل قانونی تشخص دیا ہے۔ وہ

ایک لیگل پرسن ہے۔ وہ اپنی جائیداد بنا سکتی ہے' وہ انویسٹ کر سکتی ہے' کاروبار کر سکتی ہے' اپنا مال اپنے پاس رکھ سکتی ہے' شوہر پر کچھ خرچ کرے نہ کرے' لیکن اس سے اپنا نفقہ وصول کر سکتی ہے۔ یہ سارے اس کے حقوق ہیں' لیکن کئی اعتبارات سے مَرد کی قانونی حیثیت عورت کے مقابلے میں قوی تر ہے۔ مثلاً وراثت' شہادت اور سب سے زیادہ جو معاملہ عائلی قوانین سے متعلق ہے۔ از روئے: ﴿اَلَّذِیْ بِیَدِہٖ عُقْدَۃُ النِّکَاحِ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۳۷) نکاح کی گرہ مَرد کے ہاتھ میں ہے۔ یعنی وہ طلاق دے سکتا ہے' عورت طلاق دے نہیں سکتی لیکن خلع کے ذریعے طلاق حاصل کر سکتی ہے۔ اس کے لیے اُسے کسی تیسرے کو درمیان میں ڈالنا ہوگا' وہ قاضی ہو' بزرگ ہو یا خاندان کے بڑے ہوں۔ اور پھر اُسے مَرد کو راضی کرنا ہوگا چاہے اپنے مہر کا کوئی حصّہ چھوڑ کر' چاہے کسی اور انداز میں' لیکن اُسے طلاق کا اختیار نہیں ہے۔ اب جن معاشروں میں بیوی کو بھی طلاق کا برابر اختیار دیا گیا ہے تو وہاں خاندان کے ادارے کی تباہی کے لیے گویا پہلے ہی اُس کے اندر بارود بھر دیا گیا ہے۔ یہ ہے مَرد کی قوامیت خاندان کے ادارے' قانونی نظام اور بالخصوص عائلی نظام میں۔ ویسے پورے تمدنی نظام میں آپ کو یہ قوامیت نظر آئے گی کہ بھاری اور بوجھل کام مَردوں کے ذمہ ہیں' جبکہ عورت کے لیے اصل دائرۂ کار اُس کا گھر ہے اور اولاد کی پرورش اس کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔ وہ قوم کے مستقبل کی امین ہے۔ مَرد کو قوم کے حال کی ذمہ داریوں کو ادا کرنا ہے لیکن قوم کا مستقبل تو اگلی نسل سے وابستہ ہے۔ اس کے لیے عورت کی گود بہترین تربیت گاہ اور بہترین درس گاہ ہے' اسی سے اس کے اندر بہترین جذبات کا احساس پیدا ہوگا۔

مَرد و عورت کے مابین تقسیم کار اور قانونی سطح پر مَرد کی عورت پر فوقیت' نصِ قرآنی کی رُو سے ہمارے دین کے نظام کا جزوِ لاینفک ہے۔ لہٰذا اس کو تو ہر صورت ماننا پڑے گا' یہ کڑوی گولی حلق سے نیچے اتارنی پڑے گی ع ''تاب لاتے ہی بنے گی غالبؔ!'' اگر نہیں مانتے تو پھر سیدھی سی بات ہے کہ قرآن کے احکام آپ کے لیے قابل قبول نہیں!

جس زمانے میں عورت کا مقام اور پردہ کے متعلق میرے حوالے سے

controvercy چل رہی تھی' اس زمانے میں پاکستان ٹائمز میں ایک صاحب کا خط شائع ہوا تھا' جس میں انہوں نے کھل کر لکھا تھا کہ ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ قرآن عورت کو ایک ثانوی حیثیت دیتا ہے اور ہمیں اب اجتہاد کے ایسے اصول تلاش کرنے چاہئیں جو قرآن کو بھی اوور رول کر سکیں' اوور رائٹ کر سکیں۔ ظاہر ہے اگر عورت کی ثانوی حیثیت کو تسلیم نہیں کرنا تو پھر آپ کو مان لینا چاہیے کہ آپ قرآن کی پیروی نہیں کریں گے' قرآن کو اپنا حاکم نہیں بنائیں گے بلکہ آپ اپنے آپ کو قرآن پر حاکم بنائیں گے۔ آپ قرآن کے پیچھے نہیں چلیں گے بلکہ قرآن کو اپنے پیچھے گھسیٹنے کی کوشش کریں گے۔ قرآن' اسلام اور محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات سے تو یہی اصول ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ﴾ ثابت ہے اور ہمارا پورا عائلی نظام اسی اصول پر قائم ہے۔ یہ ایک مثال ہماری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے کہ ہمارے معاشرے کا مزاج کتنا سیکولر ہو چکا ہے' اور دین کے خلاف کتنا نشوز' کتنی بغاوت اور دین کی اہم ترین باتوں کا کس قدر انکار اس معاشرے کے اندر موجود ہے۔

عورتوں کو اَخلاقی سطح پر فوقیت

مَرد کو عورت پر جو قانونی فوقیت دی گئی ہے' اس حوالے سے ہمارے ذہن میں آسکتا ہے کہ یہ مساوات کے خلاف ہے' لیکن اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو ایک اور اعتبار سے مَردوں پر فوقیت دی ہے کہ عورتوں کے حقوق کو اخلاقی سطح پر حسنِ سلوک کے اعتبار سے بہت بلند مقام دیا ہے۔ عورت کا مقام ماں کی حیثیت سے تین درجے بلند ہے جبکہ باپ کی حیثیت تین درجے نیچے رہ جاتی ہے۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک صحابیؓ نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ میرے حسنِ سلوک کا اوّلین مستحق کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

((اُمُّکَ)) قَالَ ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: ((ثُمَّ اُمُّکَ)) قَالَ ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: ((ثُمَّ اُمُّکَ)) قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: ((ثُمَّ اَبُوْکَ))(۱۲)

''تمہاری والدہ''۔ صحابی نے پھر پوچھا: ان کے بعد کون؟ فرمایا: ''پھر تمہاری

(۱۲) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب من احق الناس بحسن الصحبة۔

والدہ''۔صحابی نے پھر پوچھا: پھر کون؟ فرمایا: ''پھر تمہاری والدہ''۔صحابی نے پھر عرض کیا: ان کے بعد کون؟ فرمایا: ''پھر تمہارے والد۔''

اس کے علاوہ بھی اخلاقی سطح پر مختلف اعتبارات سے عورتوں کو مَردوں پر فوقیت دی گئی ہے۔مثلاً:

(۱) ماں کے قدموں تلے جنّت بتائی گئی ہے' باپ کے قدموں تلے نہیں۔معاویہ بن جاہمہ سلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جاہمہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! مَیں جہاد کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور آپ کے پاس اس بارے میں مشورہ لینے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے پوچھا: ''کیا تمہاری ماں موجود ہے؟'' انہوں نے کہا: جی ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ((فَالْزَمْهَا فَإِنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ رِجْلَيْهَا)) (۱۳) ''انہی کی خدمت میں لگے رہو' کیونکہ جنّت ان کے قدموں کے نیچے ہے!''

(۲) بیٹوں کے پالنے پوسنے پر کسی اجروثواب کا ہمیں ذکر نہیں ملتا جبکہ احادیث میں بیٹیوں کے پالنے پوسنے پر بہت زیادہ اجروثواب کا ذکر ملتا ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تَبْلُغَا جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَنَا وَهُوَ وَضَمَّ أَصَابِعَهُ)) (۱۴)

''جس نے دو بچیوں کو پالا پوسا' اچھی طرح پرورش کی یہاں تک کہ جوان ہو گئیں' مَیں اور وہ قیامت کے دن اس طرح ہوں گے' اور آپؐ نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو بالکل ملا کر دکھایا۔''

(۳) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي)) (۱۵)

''تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں اور

---

(۱۳) سنن النسائی' ح ۳۱۰۴ وسنن ابن ماجه' ح ۲۷۸۱۔ علامہ البانی نے اس حدیث کو صحیح' علامہ سیوطی نے حسن' جبکہ علامہ زرقانی نے اسے صحیح کہا ہے۔

(۱۴) صحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب فضل الاحسان الی البنات۔

(۱۵) سنن الترمذی' ابواب المناقب والصلة ' باب ما جاء فی فضل ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

مَیں تم میں اپنی بیویوں کے ساتھ سب سے بہتر سلوک کرنے والا ہوں۔''

چنانچہ عورتوں میں جہاں قانونی اعتبار سے ایک کمی رکھی گئی ہے وہاں اخلاقی اور دوسرے اعتبارات سے اس کی تلافی (compensation) کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔

خاندانی نظام کا دوسرا رُخ: والدین کے حقوق

اس خاندان کے استحکام کا ایک دوسرا رخ یا بُعدِ ثانی (second dimension) والدین کے حقوق ہیں۔ دیکھئے بڑی خوبصورت تعبیر ہے کہ مَرد اور عورت کے رشتہ ازدواج سے خاندان کی بنیاد بنی۔ اولاد ہوئی تو ایک دوسری جہت جمع ہوگئی۔ اب نسبت قائم ہوئی والدین اور اولاد کی۔ پھر جب اولاد ایک سے زائد ہوئی تو اب ایک تیسری جہت جمع ہوگئی یعنی بہن بھائیوں میں رشتۂ اخوت۔ یہ گویا ایک خاندان کے اَبعادِ ثلاثہ (three dimensions) ہیں۔ یہ تین جہتیں ہیں جن سے خاندان وجود میں آیا۔ خاندان کے استحکام کے لیے اسلام نے اس دوسری جہت کو بڑے شدّ ومدّ سے بیان کیا ہے۔ آپ ذرا اندازہ کیجیے کہ قرآن مجید میں والدین کے حقوق کا ذکر متعدد مقامات پر اللہ کے حقوق کے فوراً بعد آیا ہے۔ والدین کا ادب' والدین کا احترام' والدین کے سامنے کندھے جھکا کر رہنا' والدین کے ساتھ بڑے ادب کے ساتھ بولنا' یہ سب والدین کے حقوق میں شامل ہے۔

مَیں نے گزشتہ خطاب میں عرض کیا تھا کہ دو چیزیں ایسی ہیں جن میں اللہ اور رسول بریکٹ ہو جاتے ہیں' ایک وحدت بن جاتے ہیں۔ ایک ہے اطاعت اور دوسری محبّت۔ قرآن حکیم میں جا بجا ارشاد ہوا:

﴿اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ (النساء:۵۹)

''اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔''

ایک جگہ ارشاد ہوا:

﴿مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ ۚ﴾ (النساء:۸۰)

''جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی۔''

مزید فرمایا:

﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ﴾ (النساء:۶۴)

''ہم نے جو بھی رسول بھیجا وہ اس غرض سے تھا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔''

یہ دونوں (اللہ اور رسول) اطاعت میں ایک ہی ہیں۔ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے اور اللہ کی اطاعت رسول کی اطاعت۔ اسی طرح محبت میں یہ دونوں ایک ہیں۔ محبتِ خداوندی اور محبتِ رسولؐ بالکل ایک شے اور ایک ہی حقیقت ہے۔ اسی طرح قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ کے حق کے ساتھ والدین کے حقوق کا ذکر ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ ان مقامات پر رسول کا ذکر بھی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حسنِ سلوک' ادب' شکر اور احسان مندی میں اپنے ساتھ والدین کو نتھی کیا ہے۔

قرآن حکیم میں کئی مقامات پر یہ اسلوب ملتا ہے کہ ادائے حقوق کے معاملے میں جہاں اللہ تعالیٰ کے اس حق کا تذکرہ ہوتا ہے کہ صرف اور صرف اُسی کی عبادت کی جائے' وہاں اُس کے فوراً بعد والدین کے حقوق کا بیان ہوتا ہے۔ سورۂ لقمان میں حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو اجتنابِ شرک اور التزامِ توحید کی نصیحت کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرمایا گیا: ﴿وَوَصَّيۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَيۡهِ ۚ﴾ ''اور ہم نے نصیحت کی انسان کو اُس کے والدین کے بارے میں.....'' آگے خاص طور پر والدہ کے حق کو نمایاں کرنے کے بعد فرمایا:

﴿اَنِ اشۡكُرۡ لِىۡ وَلِوَالِدَيۡكَ ؕ﴾ (لقمان)

''کہ شکر کرو میرا اور اپنے والدین کا۔''

سورۂ بنی اسرائیل میں بڑی وضاحت کے ساتھ فرمایا:

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا ؕ اِمَّا يَبۡلُغَنَّ عِنۡدَكَ الۡكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوۡ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلۡ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّلَا تَنۡهَرۡهُمَا وَقُلۡ لَّهُمَا قَوۡلًا كَرِيۡمًا ﴿۲۳﴾ وَاخۡفِضۡ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحۡمَةِ وَقُلۡ رَّبِّ ارۡحَمۡهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِىۡ صَغِيۡرًا ﴿۲۴﴾﴾ (بنی اسراءیل)

''تیرے ربّ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اُس کے سوا کسی کی پرستش مت کرو اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک یا وہ دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انہیں اُف تک نہ کہو اور نہ انہیں جھڑکو اور ان سے نرمی سے بات کرو۔ اور ان کے سامنے اپنے شانے نیازمندی کے ساتھ جھکا کر رکھو اور یہ دعا کیا کرو کہ اے میرے رب ان دونوں پر رحم فرما جیسا کہ انہوں نے بچپن میں (رحم کے ساتھ) میری پرورش کی۔''

سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہوا:

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۫ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا...﴾ (آیت ۸۳)

''اور یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا.....''

اسی بارے میں سورۃ النساء (آیت ۳۶) میں فرمایا:

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا...﴾

''اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہراؤ' اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو.....''

اسی طرح سورۃ الانعام میں فرمایا:

﴿قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَیْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ۚ﴾ (آیت ۱۵۲)

''(اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ان سے) کہہ دیجیے کہ آؤ میں تمہیں سناؤں کہ تمہارے ربّ نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں! یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔''

والدین اور اولاد کے حوالے سے ایک بات اور نوٹ کر لیجیے کہ آپ کو قرآن مجید میں والدین کے لیے یہ تشویق و ترغیب کہیں نہیں ملے گی کہ اولاد سے محبّت کرو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ محبّت تو جبلی طور پر اتنی شدید ہے کہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ الٹا کہنا

پڑتا ہے کہ اولاد کی محبّت کے ترازو کو ذرا کھینچ کر رکھو کیونکہ یہ محبّت جب حد سے تجاوز کرتی ہے تو تمہاری عاقبت کی بربادی کا باعث بن جاتی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ﴾ (التغابن:۱۴)

''اے اہلِ ایمان! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولادوں میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں، پس ان سے ہوشیار رہو۔''

اگر ازواج اور اولاد کی محبّت نہ ہو تو تمدن کا یہ پورا کھکیڑ اور دُنیا کی یہ رونقیں ہی کہیں نہ ہوں۔ لہٰذا یہاں تو متنبہ کیا گیا ہے، لیکن والدین سے محبّت کی تلقین کی گئی ہے۔ حدیث مبارکہ میں یہاں تک آیا ہے کہ والدین کو محبّت بھری نگاہ سے دیکھنا بھی بہت بڑے اجر و ثواب کا موجب ہے۔ میرے علم میں دو ہی چیزیں ایسی ہیں جن کو دیکھنا بھی عبادت ہے، ایک خانہ کعبہ اور دوسرے والدین۔

والدین کے ساتھ محبّت پر اجر و ثواب کا سبب یہ ہے کہ آپ کی جبلّت میں والدین کی محبّت کی کوئی بنیاد نہیں ہے، بلکہ ہمارے ہاں جو خاندانی جھگڑے اور فسادات ہوتے ہیں اور بہت سی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں، اس کی ایک نفسیاتی بنیاد یہی ہے کہ والدین میں محبّت کی ایک شدید پیاس پیدا ہو جاتی ہے۔ جب وہ جوان تھے، ان کے جسم و جان میں توانائیاں تھیں تب انہوں نے اپنے آپ کو، اپنی توانائیوں کو، اپنی قوتوں کو اپنی اولاد پر نچھاور کیا اور اولاد ہی اُن کی محبّت کا مرکز و محور بنی رہی۔ لیکن اب جب اولاد جوان ہو گئی تو اولاد کی محبّت کا مرکز اُن کے اپنے بیوی بچے بن گئے۔ اس حوالے سے والدین میں محبّت کی شدید پیاس پیدا ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر ماں کو اس کا شدّت کے ساتھ احساس ہوتا ہے۔ باپ کا معاملہ باہر کی دنیا سے متعلق ہے، اسے اتنا زیادہ احساس نہیں ہوتا، لیکن ماں کا احساس شدید تر ہوتا ہے جس کے نتیجے میں ساس بہو کا جھگڑا جنم لیتا ہے اور اسی وجہ سے یہ سارے فسادات ہوتے ہیں۔ چنانچہ والدین کی محبّت کی پیاس بجھانے کے لیے جو شخص بھی ان کو محبّت بھری نگاہ سے دیکھے تو یہ بڑے اجر و ثواب کا موجب ہے۔

دوسری چیز یہ کہ والدین پورے خلوص کے ساتھ اپنے آپ کو اولاد کے لیے invest کر دیتے ہیں اور انہیں یہ امید ہوتی ہے کہ بڑھاپے میں جب ہمیں ایک عصا کی ضرورت ہو گی تو ہماری اولاد ہمارا عصا بنے گی۔ یہ دونوں چیزیں مغرب میں ختم ہو چکی ہیں۔ خود غرضی اس درجے کو پہنچ گئی ہے کہ والدین ایک خاص عمر تک اپنی اولاد کو پال پوس کر کہتے ہیں اب نکلو یہاں سے اور اپنی ذمہ داریاں خود سنبھالو۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب وہی بوڑھے والدین ترس رہے ہیں کہ بیٹا بیٹی ہمیں شکل ہی دکھا جائے۔ مغرب میں تو کرسمس کے تہوار کی بڑی اہمیت ہی یہ ہے کہ سال میں ایک مرتبہ تو شاید بیٹا بیٹی کو دیکھنا نصیب ہو جائے' لیکن قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ اب اس موقع پر بھی ان کو اپنے پیاروں کی شکل دیکھنے کو نہیں ملتی۔ ان کے لیے ''اولڈ ہومز'' بنا دیے گئے ہیں' جہاں انہیں ٹیلی ویژن' فریج اور ضرورت کی ہر چیز دے دی گئی ہے' لیکن انسانی جذبات کسی اور چیز کا بھی تقاضا کرتے ہیں اور وہ محبّت کی پیاس ہے۔ کوئی ٹیلی ویژن' کوئی مشروب' کوئی پھل اور دنیا کی کوئی بھی آسائش پیار و محبّت کے جذبات کا بدل نہیں بن سکتے۔

ضبطِ نفس اور ستر و حجاب کے اَحکام کی پابندی

ایک اور چیز جو خاندان کے ادارے کو مستحکم کرنے والی' اس میں امن و سکون پیدا کرنے والی اور ہماری معاشرتی زندگی کی ایک اہم اساس ہے' وہ یہ ہے کہ معاشرے میں ضبطِ جنس اور ضبطِ شہوت (sex discipline) ہو' جنسی انارکی نہ ہو۔ انسان اپنی اس فطری ضرورت (urge) کو ایک قاعدہ و قانون اور حلال و حرام کے حدود و قیود کے اندر پورا کرے۔ مجھے فرائڈ (اہلِ مغرب جسے نفسیات کا ''امام'' مانتے ہیں) کی اس بات سے بہت حد تک اتفاق ہے کہ انسان کے اندر سب سے طاقتور (potent) جذبۂ محرکہ شہوت یعنی جنسی جذبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت تخلیق کے مطابق یہ بے حد ضروری تھا' کیونکہ اگر یہ جذبہ اتنا طاقتور نہ ہوتا تو کون شادی کا کھکیڑ مول لیتا اور انسان کی نسل کیسے چلتی؟ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو آباد رکھنا ہے' نسلِ انسانی کو ابھی اور بڑھانا ہے' لہٰذا جنس مخالف میں اس قدر کشش اور طلب پیدا کی ہے کہ انسان یہ جانتے ہوئے بھی کہ شادی کے بعد اتنی ذمہ داریاں ہوں

گی‘ خاندان کا بوجھ اٹھانا ہوگا‘ اولاد کو پالنا پوسنا ہوگا‘ یہ ساری ذمہ داریاں جھیلتا ہے۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ جس شے میں جتنی زیادہ کشش اور شدّت ہوتی ہے اتنا ہی اس میں کج روی اور بگاڑ کا زیادہ امکان ہوتا ہے‘ جیسے پولیٹکل سائنس کا مسلّمہ اصول (axiom) ہے:

Authority tends to corrupt and absolute authority corrupts absolutely.

چنانچہ جنسی جذبے کی یہ شدّت جتنی زیادہ ہے تو اس کے بگاڑ کا بھی اتنا ہی زیادہ امکان موجود ہے۔ یوں سمجھئے کہ گویا انسان کے اندر بارود ہے‘ لہٰذا اس پر بڑی قدغنوں‘ بڑی پابندیوں اور بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ یہ پابندیاں اور یہ اہتمام ہمارے دین کی طرف سے ہے۔

خطاب کے آغاز میں مَیں نے سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیات کی تلاوت کی تھی۔ ان آیات میں اہلِ ایمان کے لوازماتِ فلاح کی شرائط میں ایک شرط یہ بھی بیان کی گئی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝﴾

’’وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ سوائے اپنی بیویوں اور ان عورتوں کے جو اُن کی ملک یمین ہوں‘ سو اُن پر کوئی ملامت نہیں ہے۔‘‘

آپ غور کیجیے کہ اس میں کس قدر توازن ہے۔ ایک طرف یہ تصوّر دیا گیا ہے کہ جنسی شہوت کو بُری نہ سمجھو‘ یہ کوئی بُرائی (evil) نہیں ہے‘ یہ تو فطرت کا داعیہ اور فطرت کا تقاضا ہے جو اللہ نے انسان کی فطرت میں اپنی حکمت کے تحت رکھا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ...﴾ (آیت ۱۴)

’’مزیّن کر دی گئی ہے لوگوں کے لیے مرغوباتِ دنیا کی محبّت جیسے عورتیں اور بیٹے.....‘‘

یہاں سب سے پہلے ’’حُبُّ الشَّهَوٰت‘‘ کا ذکر کر کے یہ واضح کر دیا گیا کہ جنسی خواہش

کوئی بُرائی نہیں ہے۔ اوّل تو جو دین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ لائے وہ انتہائی دینِ فطرت ہے، پھر آپؐ کی زندگی اتنی کھلی کتاب ہے کہ آپؐ نے ہر چیز کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((حُبِّبَ اِلَیَّ مِنَ الدُّنْیَا: اَلنِّسَاءُ وَالطِّیْبُ، وَجُعِلَ قُرَّةُ عَیْنِیْ فِی الصَّلَاةِ)) (۱۶)

''مجھے دنیا میں سے عورتیں اور خوشبو محبوب ہے، جبکہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔''

حضور ﷺ نے خود بھی شادیاں کیں اور اُمّت کو بھی اس کا حکم دیا۔ فرمایا:

((اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ)) (۱۷) ''نکاح میری سُنّت ہے۔''

مزید فرمایا:

((فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ)) (۱۸)

''جس کو میری سُنّت پسند نہیں اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔''

دوسری طرف اسلام نے اس جذبے پر شدید قدغنیں عائد کی ہیں۔ اس لیے کہ اگر اس جذبے میں کج روی اور آوارگی آ گئی تو پوری انسانی شخصیت اور سیرت و کردار کی متاع اس سوراخ سے بہہ نکلے گی۔

مَیں ان لوگوں کا مرثیہ کہا کرتا ہوں جو ایک طرف تو مغرب کے فلاسفہ کی عظمت کے قائل ہیں اور دوسری طرف جب پردے اور ستر کا بیان آتا ہے تو وہ ایسے ''معصوم'' بن جاتے ہیں کہ جنسی جذبہ شاید صرف مولویوں ہی کے اندر ہوتا ہے، ان کے علاوہ کسی اور کے اندر اس جذبے کا کوئی احساس اور حس سرے سے ہوتی ہی نہیں۔ یہ سراسر ان کی بددیانتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم اُس رسول ﷺ کے پیروکار ہیں جنہوں نے خود یہ کہا ہے کہ مجھے

---

(۱۶) سنن النسائی، کتاب عشرة النساء، باب حب النساء۔

(۱۷) سنن ابن ماجه، کتاب النکاح، باب ما جاء فی فضل النکاح۔

(۱۸) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح۔ وصحیح مسلم، کتاب النکاح، باب استحباب النکاح لمن تاقت نفسه الیه ...

تو دنیا میں یہ دو چیزیں خوشبو اور عورت پسند ہیں' اور ہم اس قرآن مجید کو ماننے والے ہیں جس میں سورۃ المؤمنون کے بعد سورۃ المعارج میں دوبارہ بعینہٖ انہی الفاظ کے ساتھ یہ آیات وارد ہوئی ہیں:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝۲۹ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝۳۰﴾

اس کے بعد دونوں مقامات پر یہ الفاظ آئے ہیں:

﴿فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝۳۱﴾

''البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی زیادتی کرنے والے ہیں۔''

یعنی جو اس جذبے میں حد سے بڑھیں گے اور اپنی خواہشات حرام طریقوں سے پوری کریں گے تو وہ زیادتی کرنے والے اور حدود سے تجاوز کرنے والے ہیں۔

تو جان لیجیے کہ یہ ایک بہت زوردار داعیہ ہے۔ فرائڈ نے مبالغہ آرائی کرتے ہوئے اسے ذرا اور آگے بڑھا دیا ہے کہ اس کے نزدیک تو سارے کے سارے خواب بھی سیکس کی بنیاد پر آتے ہیں اور ساری اخلاقیات بھی اسی جذبہ کی بنیاد پر ہیں۔ ماں اگر محبّت بھری نگاہ سے بیٹے کو دیکھ رہی ہے یا باپ نے اگر بیٹی پر محبّت بھری نگاہ ڈال لی تو وہ بھی جنسی جذبہ کے تحت ہے۔ معاذ اللہ! ان لوگوں کا یہ غلط رویّہ ہے کہ ایک حقیقت کو دیکھتے ہیں تو جزء کو کُل بنا دیتے ہیں' لیکن اس حد تک یہ بات صحیح ہے کہ اس جذبے کے اندر بہت پوٹینشل' شدّت اور قوت ہے۔ چنانچہ جتنا مُنہ زور گھوڑا ہوگا اتنا ہی اسے سدھانے کے لیے آپ کو محنت کرنا پڑے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اس جذبے کے لیے اتنی حدود و قیود عائد کی گئی ہیں۔ ہمارے دین میں ستر و حجاب کا مکمل نظام موجود ہے اور ستر و حجاب کے یہ احکام ہمارے معاشرتی نظام کے استحکام کا ذریعہ ہیں۔

غیر مخلوط اسلامی معاشرہ

یہ بات قبل ازیں عرض کی جا چکی ہے کہ اسلامی معاشرہ مخلوط معاشرہ نہیں ہے' اس میں عقیدے اور ایمان کی بنیاد پر تقسیم ہے۔ یہ اصلاً مسلمان معاشرہ ہے' غیر مسلم اس

معاشرے کا اصلاً شریک نہیں ہے۔ البتہ جو بھی غیر مسلم ہمارے مقابلے میں متحارب نہیں ہے' اس کے ساتھ بھلائی' خدمتِ خلق' تالیفِ قلب' عدل و انصاف' یہ سارے معاملات کریں گے' لیکن محبّت اور مودّت کا معاملہ صرف اہلِ ایمان کی برادری کے دائرے کے اندر رہے گا۔ اسی طرح مسلمان معاشرے میں جنس کے اعتبار سے مخلوط معاملہ نہیں ہے۔ یہ ایک غیر مخلوط (seggregated) سوسائٹی ہے' جہاں مَرد کا علیحدہ دائرۂ کار ہے اور عورت کا علیحدہ۔ ان دونوں کا میدانِ کار جُدا' فرائض جُدا' ذمّہ داریاں جُدا' لہٰذا ان کا آپس میں میل جول اور اختلاط اسلام بالکل گوارا نہیں کرتا۔ اس لیے کہ یہ بارود کو چنگاری دکھانے والی بات ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ جنسی جذبہ بہت ہی خوفناک اور خطرناک حد تک مُنہ زور ہے اور اس کے لیے بہت زیادہ احتیاط اور پابندیوں کی ضرورت ہے۔

حجاب کے تفصیلی احکام میں تو کسی کو اختلاف ہوسکتا ہے لیکن مَیں اس وقت جو اصول بیان کر رہا ہوں کہ مَرد و عورت میں سے ہر ایک کا ایک جُداگانہ دائرۂ کار ہے۔ مَیں دعوے سے کہتا ہوں کہ اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا۔ جس زمانے میں ستر و حجاب اور پردہ کی بڑی بحثیں چل رہی تھیں ایک مرتبہ مَیں پروفیسر وارث میر صاحب کے گھر ان کے بچے کی عیادت کے لیے گیا تھا۔ چونکہ وہ بھی میرے خلاف بڑے مضامین لکھ رہے تھے تو وہاں مَیں نے ان سے بات کی اور ان سے کہا کہ مجھے بتایئے تو سہی کہ اسلام نے ستر و حجاب اور seggregation کے جو اصول رکھے ہیں' ان کو اگر ہم ملحوظ رکھیں تو ہماری کون سی تمدنی ضرورت ہے جو رکتی ہے؟ پھر مَیں نے غیر مخلوط معاشرے کا ایک خاکہ ان کے سامنے رکھا کہ آپ تعلیم کا نظام علیحدہ کر دیجیے کہ مَردوں اور عورتوں کی یونیورسٹیاں اور کالج علیحدہ ہوں' اسی طرح ہسپتال علیحدہ ہوں۔ خواتین کے ہسپتالوں میں خواتین ڈاکٹر ہوں اور خواتین نرسیں ہوں جبکہ مَردوں کے ہسپتالوں میں مَرد نرسوں کا اہتمام ہو' کیونکہ وہاں زنانہ نرسیں فساد کی جڑ ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا مَرد نرسنگ نہیں کر سکتے؟ آرمی میں جہاں شدید ترین نرسنگ کی ضرورت ہوتی ہے' آپ اگلے مورچوں پر کیا عورتوں کو نرسیں بنا کر بھیجتے ہیں؟ وہاں نرسنگ کا کام مَرد سرانجام دیتے ہیں اور وہاں کی ساری ضرورتیں پوری

کرتے ہیں۔ تو اسی طرح مَردانہ ہسپتالوں میں میل نرس کام کیوں نہیں کر سکتے؟ عورتوں کے ہسپتال میں عورتوں کو نرس رکھیے اور مَردوں کے ہسپتال میں مَردوں کو نرس رکھیے۔ (۱۹)

آج کل یہ بات کہی جاتی ہے کہ اس دور میں ہمیں جو معاشی مسائل درپیش ہیں اور دنیا کے اندر جو اقتصادی بھاگ دوڑ کا مقابلہ ہے تو اس کے پیشِ نظر کیا ہم مَردوں کے ساتھ عورتوں کی نفری کو بروئے کار نہ لائیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ضرور ان سے کام لیجیے' اور اس کے لیے گھریلو صنعتوں کو فروغ دیجیے تاکہ خواتین کو گھروں کے اندر کام دیا جائے۔ یا آپ ایسے یونٹس بنایئے جس میں عورتیں کام کریں' عورتیں کام لیں' سپروائزنگ بھی عورتیں کریں اور اس کی چار گھنٹے کی شفٹ رکھیے تاکہ وہ خاتونِ خانہ کی حیثیت سے بھی اپنے فرائض ادا کر سکے اور یہاں آ کر قوم کی اجتماعی اقتصادیات میں بھی اپنا ایک حصّہ ادا کر سکے۔ اگر گھر پر بیٹھ کر اسے کام کرنے دیں گے تو وہ انتہائی مفید اور productive ہوگا' اس کے آنے جانے' کپڑے تبدیل کرنے اور بننے سنورنے کا وقت بھی بچے گا۔ دوسری جنگ عظیم میں دہلی کے ایک بہت بڑے علاقے ''باڑا ہندوراؤ'' کا ایک ایک گھر کارخانہ بنا ہوا تھا۔ صبح آرمی کے ٹرک آتے اور سامان دے کر چلے جاتے تھے۔ کہیں وردیاں سل رہی ہیں' کہیں بکلز بن رہے ہیں' کہیں بٹنز بن رہے ہیں۔ گھروں میں چھوٹے چھوٹے پریس لگے ہوئے تھے۔ شام کو ٹرک آتے اور تیار سامان لے کر چلے جاتے۔ نہ عورت کو گھر سے نکلنا پڑا' نہ اسے کوئی مشقّت جھیلنی پڑی۔ وہ گھر میں بیٹھ کر بچوں

---

(۱۹) اس طرح آپ سوچیے کہ کیا پی آئی اے میں کھانے اور ناشتے کی ٹرے مَرد نہیں پیش کر سکتا؟ مَیں نے یہ بات صدر ضیاء الحق مرحوم سے بھی کہی تھی کہ یہ ایئر ہوسٹس جو ہفتوں کے لیے گھر سے باہر جاتی ہے یہ شریعت کے کون سے قاعدے کے مطابق جائز ہے' جبکہ مسلمان عورت حج اور عمرہ کے لیے بھی محرم کے بغیر نہیں جا سکتی۔ حالانکہ حج اور عمرہ کرنے والی خواتین بالعموم ادھیڑ عمر یا عمر رسیدہ ہوتی ہیں مگر پی آئی اے میں اس کے برعکس نوجوان بچیاں بیس بیس دن کے لیے ایک سے دوسرے ملک فلائٹ کے ساتھ جاتی ہیں۔ غور کیجیے یہ کون ہیں؟ یہ حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ' حضرت خدیجہ الکبریٰ اور حضرت عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا کی ''بیٹیاں'' ہیں!!

(بحوالہ خلافت کی حقیقت اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام' از ڈاکٹر اسرار احمد' ص ۱۵۲)

کو ساتھ لگا کر کام کر رہی ہے' کہیں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ بس اصول طے ہو جائیں اور ایک دفعہ عزم کر لیں تو پھر راستے کھلتے جائیں گے۔ اس بات کو یقین محکم کے ساتھ مان لیں کہ مَرد و زَن کا اختلاط انتہائی خطرناک ہے اور اس میں شدید خطرات مضمر ہیں' اس لیے اس کو ہر صورت روکنا ہے۔

ستر و حجاب کے احکام کی پابندی اور غیر مخلوط نظام سے شوہر اور بیوی کے اندر وہ باہمی اعتماد پیدا ہوتا ہے جس سے گھر کے اندر اعتماد کی فضا پیدا ہوتی ہے اور اس میں مثبت جذبات پروان چڑھتے ہیں' پھر وہ گھر واقعتاً جنّت کا ایک نمونہ بنتا ہے۔ اس فضا میں جو اولاد پروان چڑھے گی اس کے اندر مثبت اقدار وجود میں آئیں گی' اس کے اندر بھلائیاں اور نیکیاں پرورش پائیں گی۔ اگر ایسا نظام نہ ہو تو انتقام اور منفی اثرات پروان چڑھتے ہیں۔ نہ بیوی کو شوہر پر اور نہ ہی شوہر کو بیوی پر اعتماد ہوتا ہے۔ اس طرح وہ صرف ایک قانونی بندھن میں بندھے ہوتے ہیں' جس سے چھٹکارا پانے کے لیے امریکہ اور مغرب میں بڑی کوششیں جاری ہیں۔ ان کا پورا عائلی نظام ان کے لیے ایک بہت بڑا شکنجہ' بہت بڑی مصیبت اور بہت بڑی لعنت بن کر رہ گیا ہے۔ لیکن ہم اب بھی مغربی تہذیب کی ظاہری چکاچوند سے مرعوب ہیں' جس کو اقبال نے "Dazzling exterior of the Western Civilization" کہا تھا۔ ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو: ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے!

ہم تو اسی کی مرعوبیت میں مبتلا ہو کر اس کی پیروی کر رہے ہیں اور اسی کو سمجھتے ہیں کہ یہ تہذیب اور تمدن ہے۔ یہ درحقیقت ہمارے ذہنی اَفلاس کا مظہر ہے' ورنہ ہمارے پاس تو اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا بہترین معاشرتی و عائلی نظام ہے۔ سب سے پہلے اگر آپ میں ایمان کی بنیاد موجود ہو تو آپ کو وہ بصیرت حاصل ہو گی کہ ان تمام اوامر و نواہی اور دین کے تمام احکام کی نورانیت' معنویت اور ان اَحکام کی پوشیدہ حکمتیں اور برکات نظر آئیں گی۔ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

((اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ))[20]

نوراللہ سے کیا مراد ہے؟ اس کے دوسرے پہلو بھی ہیں جن کی طرف اشارہ موجود ہے لیکن یہ بھی ہے کہ وہ نورِ ایمان ہے۔ پھر جسے اللہ انشراح عطا کرتا ہے اسے اطمینان ہو جاتا ہے کہ یہی نظام صحیح ہے اور اسی میں خیر و فلاح ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے: ﴿اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ﴾ (الزمر:۲۲) ''پھر بھلا وہ شخص کہ جس کے سینے کو اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا اور وہ اپنے ربّ کی طرف سے ایک نور (ہدایت) پر ہے (اُس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو کفر کی تاریکیوں میں پڑا ہے؟)''

قرابت دار کے ساتھ حسنِ سلوک

معاشرے کی تنظیم میں خاندان کے ادارے سے آگے بڑھ کر قرابت دار کے ساتھ حسنِ سلوک کا بھی ذکر ہے۔ خاندان کے ادارے کو مستحکم کرنے کے بعد اب انسان کے حسنِ سلوک کا دائرۂ کار درجہ بدرجہ آگے بڑھنا چاہیے اور ''الاقرب فالاقرب'' کے اصول کے مطابق جو سب سے قریب ہے وہ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ حسنِ سلوک کا مستحق ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾﴾ (بنی اسراءیل)

''اور رشتے دار کو اُس کا حق ادا کرو اور محتاج اور مسافر کو بھی (اپنے مال میں سے دو) اور اپنی دولت کو نمود و نمائش کے لیے نہ اڑاؤ۔''

قرآن مجید کے اندر متعدد بار قرابت داروں کا ذکر ہے:

﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى﴾ (البقرۃ:۱۷۷)۔ اور:

﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى﴾ (النساء:۳۶)

قرابت داروں کے بعد حسنِ سلوک کے دائرہ میں معاشرے کے محروم افراد کو بھی شامل کرنا ہوگا' جن میں یتیم' مساکین' مسافر' غرض سبھی لوگ شامل ہوں گے۔ قرابت دار

---

(۲۰) سنن الترمذی' ابواب تفسیر القرآن' باب ومن سورۃ الحجر۔

کے بعد یتیم اور مساکین کا نمبر آتا ہے: ﴿وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ﴾ ''اور (احسان کرو) رشتہ داروں' یتیموں اور مساکین پر''۔ اس سے آگے بڑھیے تو پڑوس کا نمبر آتا ہے: ﴿وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی﴾ ''اور پڑوسی جو قرابت دار بھی ہو''۔ اگر پڑوسی قرابت دار بھی ہو تو یوں سمجھئے کہ سونے پر سہاگا ہے کہ اس کے دو حقوق جمع ہو گئے۔ ﴿وَالْجَارِ الْجُنُبِ﴾ ''اور پڑوسی چاہے اجنبی ہو''۔ یعنی وہ آپ کے قبیلے کا نہ ہو تب بھی پڑوسی ہونے کے اعتبار سے وہ آپ کے حسنِ سلوک کا مستحق ہے۔ ﴿وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ﴾ ''اور آس پاس کے بیٹھنے والے''۔ عارضی طور پر آپ کی برابر کی نشست پر بیٹھا ہوا بھی آپ کا پڑوسی ہے اور وہ آپ کے حسنِ سلوک کا مستحق ہے۔ اس طرح آپ بس یا ریل میں سفر کر رہے ہیں تو آپ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا شخص آپ کا پڑوسی ہے اور آپ کا فرض ہے کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ ﴿وَابْنِ السَّبِیْلِ﴾ ''اور پھر مسافر''۔ ﴿وَمَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ﴾ ''اور پھر وہ جو تمہاری مِلکِ یمین میں ہوں''۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ﴿۳۶﴾﴾ (النساء) ''یقیناً اللہ تعالیٰ کو متکبّر اور اکڑنے والے لوگ بالکل پسند نہیں ہیں۔''

آخر میں ایک حدیث کا حوالہ دے رہا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((وَاللّٰهِ لَا یُؤْمِنُ، وَاللّٰهِ لَا یُؤْمِنُ، وَاللّٰهِ لَا یُؤْمِنُ)) قِیْلَ وَمَنْ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ((اَلَّذِیْ لَا یَأْمَنُ جَارُهٗ بَوَایِقَهٗ))(۲۱)

حضور ﷺ نے تین بار یہ بات فرمائی کہ ''اللہ کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں ہے!'' یعنی اُسے ایمان کی حقیقت حاصل نہیں ہے۔ یا ہمارے ہاں جو احتیاط کی وجہ سے ترجمہ کیا جاتا ہے کہ اُس کو ایمانِ کامل حاصل نہیں ہے۔ اگرچہ مَیں سمجھتا ہوں کہ جب ہم یہ ترجمہ کرتے ہیں تو اس حدیث میں جو زور اور تاثیر ہے وہ ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ بس یہ ذہن میں رکھیے کہ قانوناً وہ شخص کافر نہیں ہوتا بلکہ مسلمان رہتا ہے' لیکن ایمان کی کوئی لطیف حقیقت ہے جس سے وہ محروم ہے۔ ((وَاللّٰهِ لَا یُؤْمِنُ)) ''اللہ کی قسم وہ مؤمن نہیں!'' پوچھا گیا حضور کون؟

(۲۱) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب اثم من لم یأمن جارہ بوایقہ۔

آپؐ نے فرمایا: ''وہ شخص کہ جس کی ایذا رسانی سے اُس کا پڑوسی چین میں نہیں ہے۔''

اسلامی نظامِ حیات کے تین بنیادی اصول

قرآن وحدیث میں تین اصولوں کا ذکر ہے جن پر تمام انسانی معاملات (چاہے وہ معاشرتی ہوں، معاشی ہوں یا سیاسی) کو استوار کرنا چاہیے۔ سورۃ النساء میں فرمایا گیا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ﴾ (آیت ۵۸)

''اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔''

اس آیت میں دو اصولوں کا ذکر آیا: (۱) امانت داری (۲) عدل و انصاف۔ اب ایک حدیث ملاحظہ کیجیے:

((لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ)) (۲۲)

''اُس شخص کا ایمان نہیں جس میں امانت داری نہیں اور اُس شخص کا کوئی دین نہیں جس میں ایفائے عہد نہیں۔''

اس حدیث میں ایک تو اسی اصول کا ذکر ہے جو مندرجہ بالا آیت میں مذکور ہے یعنی امانت داری اور ایک تیسرے اصول کا تذکرہ ہے یعنی عہد کی پابندی۔

قرآن مجید کی اور بھی کئی آیات میں ان اصولوں کا تذکرہ ملے گا، مثلاً سورۃ المؤمنون اور سورۃ المعارج میں فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝﴾۔

ایفائے عہد، امانت داری اور عدل و انصاف، یہ تین اصول ہیں، ان پر اپنے تمام انسانی معاملات استوار کرو۔ پھر انہی اصولوں پر ایک صالح ریاست، صالح حکومت، اور ایک سیاسی نظام وجود میں آئے گا اور پھر آگے چل کر انہی اصولوں پر ہمارے معاشی نظام کی عمارت تعمیر ہوگی۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

---

(۲۲) مسند احمد، ح ۱۱۹۳۵ و ۱۲۱۰۸ و ۱۲۷۲۲ و ۱۳۱۴۵۔ الترغیب والترھیب للمنذری ۷۷/۴۔ راوی: انس بن مالک رضی اللہ عنہ۔

خطاب ④

اسلام کا سیاسی اور ریاستی نظام

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم - بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ﴾ (یوسف: ۴۰)

﴿وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ۝۲۶﴾ (الکہف)

﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ﴾ (بنی اسراءیل: ۱۱۱)

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ﴾ (البقرۃ: ۳۰)

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۱﴾ (الحجرات)

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝۵۹﴾ (النساء)

﴿يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ﴾

(آل عمران: ۱۵۴)

﴿وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳۸﴾ (الشوریٰ)

وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم:

((اِذَا كَانَ اُمَرَاؤُكُمْ شِرَارَكُمْ وَاَغْنِيَاؤُكُمْ بُخَلَاءَكُمْ وَاُمُوْرُكُمْ اِلٰى نِسَائِكُمْ فَبَطْنُ الْاَرْضِ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ ظَهْرِهَا)) (سنن الترمذی)

تمہیدی کلمات

''اسلام کے نظامِ حیات'' کے موضوع پر سلسلہ وار خطابات کے ضمن میں آج چوتھا خطاب ہے' جس کا عنوان ہے: ''اسلام کا سیاسی اور ریاستی نظام''۔ اس سے پہلے اس سلسلہ کے تین خطابات ہو چکے ہیں: (i) اسلامی نظام کی نظریاتی اساس: ایمان (ii) اسلام کا اخلاقی اور روحانی نظام (iii) اسلام کا سماجی اور معاشرتی نظام ـــــ آج کے موضوع پر اظہارِ خیال سے پہلے مَیں ایک بار پھر یہ وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام کے نظامِ حیات پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بات ہمیشہ پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ''نظامِ حیات'' ہی نہیں بلکہ ''نظام'' کی اصطلاح بھی ایک جدید اور حادث اصطلاح ہے۔ یہ قرآن وسُنّت کی اصطلاح نہیں ہے اور ''نظام'' کا لفظ قرآن وحدیث دونوں میں نہیں ہے۔ اسلام کی تعلیمات یقیناً انسانی زندگی کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتی ہیں اور قدیم ہیں' لیکن جہاں تک اس اصطلاح (نظام' نظامِ حیات) کا تعلق ہے تو یہ قدیم نہیں' بلکہ ایک جدید اصطلاح ہے' جو کچھ ہی عرصہ قبل استعمال ہونی شروع ہوئی ہے۔ میرے علم کی حد تک یہ اصطلاح سب سے پہلے شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے استعمال کی ہے جنہوں نے ایک نعرہ لگایا تھا کہ ''فَکّ کُلّ نظامٍ''۔

دوسری بات اس ضمن میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ہمیں دیا ہے وہ اوامر ونواہی اور احکامِ شریعت ہیں اور اصل اہمیت' دوام اور استقلال ان احکام ہی کو حاصل ہے۔ فقہاء کرامؒ ان احکام کی درجہ بندی کرتے ہیں کہ کیا فرض ہے' کیا واجب ہے' کیا سُنّت ہے' کیا مستحب ہے' اور دوسری طرف کیا مکروہ ہے اور پھر مکروہ کی مزید تقسیم کہ کیا مکروہ تنزیہی ہے' کیا مکروہ تحریمی ہے اور کیا حرامِ مطلق ہے۔ اس درجہ بندی کے لیے بڑے گہرے فہم اور تفقہ فی الدّین کی ضرورت ہے اور ہمارے ائمہ نے اس میں انتہائی محنت' لیاقت' مہارت اور قابلیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ درحقیقت دین میں اصل اہمیت ان ہی احکام کی ہے۔ ہم ان احکام کو جوڑ کر' مربوط کر کے اپنے فہم اور سمجھ کے مطابق ایک ''نظام'' بناتے ہیں۔ مثلاً وہ احکام اور اوامر ونواہی جو معاشرتی زندگی سے متعلق ہیں' انہیں ہم جمع کر کے کہیں گے کہ یہ اسلام کا معاشرتی نظام ہے۔ اسی طرح وہ احکام اور قواعد جو مالی امور

سے متعلق ہیں' ان کو جمع کر کے ہم اسے اسلام کا معاشی نظام قرار دیں گے۔ اس طرح مختلف احکام کی حکمت اور باہم مناسبت کو سمجھتے ہوئے' انہیں ترتیب دے کر ایک نظام کی شکل میں مرتّب کرنے میں کوئی حرج اور قباحت نہیں ہے' البتہ ایک بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ جو احکام میں ربط اور ترتیب قائم کی گئی ہے وہ ہمارے اپنے ذہن کی پیداوار ہے' اس لیے اس میں خطا کا امکان ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی شے جو اہم تر تھی ہم نے اسے کم اہم سمجھ لیا ہو اور کوئی چیز جو ثانوی درجے کی تھی اس کو اوّلیت دے دی ہو۔ پھر یہ کہ اس ترتیب میں ہماری سوچ' ہماری ترجیحات' ہمارا ذوق وشوق اور ہمارا مزاج لازماً اثر انداز ہوا ہے اور اس حوالے سے بھی اس میں غلطی کا امکان موجود ہے۔ چنانچہ جو کوئی بھی ان احکام کو جوڑ کر ایک نظام کی شکل دے گا اِس میں اُس کے ذاتی اجتہاد کا بھی دخل ہوگا۔ اس کے لیے ہمارے ذہن کھلے رہنے چاہئیں اور اسی سے تمدنی اور عمرانی ارتقاء کی راہیں کھلتی ہیں۔

انسانی اجتماعیت کی مختلف سطحیں

انسانی اجتماعیت کی مختلف سطحیں (stages) ہیں' جن کی ترتیب تاریخی اعتبار سے بھی ہے اور اہمیت کے اعتبار سے بھی۔ اس حوالے سے مَیں اشارتاً عرض کر دوں کہ میرے نزدیک انسانی اجتماعیت کی چار سطحیں ہیں۔ انسانی اجتماعیت کی بنیاد اور پہلی سطح ''عائلی نظام'' ہے جو ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان رشتۂ ازدواج سے شروع ہوتا ہے اور پھر اس سے ایک خاندان وجود میں آتا ہے۔ جب خاندان کا یہ سلسلہ وسیع ہوتا ہے تو اس سے معاشرہ اور ''معاشرتی نظام'' وجود میں آتا ہے' جو اجتماعیت کی دوسری سطح ہے۔ پھر یہ معاشرہ جب انتظامی سطح پر پہنچتا ہے اور زیادہ منظّم ہو جاتا ہے تو یہ منظّم معاشرہ ایک ریاست کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور پھر اس سے ''سیاسی نظام'' وجود میں آتا ہے' جو ہمارا آج کا موضوع ہے اور یہ اجتماعیت کی تیسری سطح ہے۔ اسی طرح ایک منظّم معاشرے میں معاشی معاملات بھی ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور انسانی معیشت کا معاملہ بھی ایک قدیم معاملہ ہے' اسی سے ''معاشی نظام'' وجود میں آتا ہے جو اجتماعیت کی چوتھی سطح ہے۔ اس معاملے میں تمدنی ارتقاء اور صنعتی انقلاب کے بعد جو تبدیلیاں اور نئے مسائل پیدا ہوئے ہیں اس

اعتبار سے معاشی امور میں اجتہاد کی بہت ضرورت ہے۔

انسانی اجتماعیت کی ان چار سطحوں میں سے جو پہلی سطح ہے' قرآن مجید میں سب سے زیادہ تفصیلی احکام اسی کے بارے میں آئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی معاشرت اتنی ہی قدیم ہے جتنا خود انسان قدیم ہے۔ مرد اور عورت کے حقوق و فرائض کے توازن کے حوالے سے مَیں نے گزشتہ خطاب میں جو مسئلہ بیان کیا' وہ نوعِ انسانی کا قدیم ترین مسئلہ ہے' جو آدم و حوا کی پیدائش اور نسلِ انسانی کے آغاز سے ہی وجود میں آ گیا تھا اور نزولِ قرآن کے بعد بھی اس مسئلے میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی —— وہی عورت ہے اور وہی اس کی نفسیات اور وہی مرد ہے اور وہی اس کی نفسیات۔

اسلام نے اجتماعیت کی ان سطحوں میں سے پہلی سطح یعنی معاشرتی و سماجی نظام کے بارے میں گویا مکمل قانون دیا ہے اور جتنی مفصّل بحثیں قرآن میں اس موضوع کے عملی معاملات سے متعلق آئی ہیں' کسی اور موضوع سے متعلق نہیں آئیں۔ تفصیلی احکام ہمیں اسی میدان میں ملتے ہیں کہ معاشرتی اقدار (social values) میں سے کون سی اقدار کو فروغ دیا جانا چاہیے اور کون سی اقدار ایسی ہیں جن کا استیصال مطلوب ہے۔ اسی طرح سماجی بُرائیوں (social evils) کی تفصیلات بھی موجود ہیں۔ اس کے برعکس قرآن مجید میں معاشی نظام کے بارے میں صرف چند گنے چنے احکام بیان ہوئے ہیں' البتہ کچھ بہت اہم اصول دیے گئے ہیں کہ ان کے امتزاج سے اور پھر اس میں اجتہادی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے انسان پیش قدمی کر سکتا ہے۔

جہاں تک سیاسی اور ریاستی نظام کا تعلق ہے اس ضمن میں تو میرے نزدیک قرآن میں حکم کوئی بھی نہیں آیا' کوئی ڈھانچہ سرے سے دیا ہی نہیں گیا' صرف اصول دیے گئے ہیں۔ قرآن و سُنّت میں غور و فکر کرنے سے آپ کو اسلامی ریاست کے صرف بنیادی اصول ملیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب قرآن نازل ہو رہا تھا اُس وقت اس میدان میں ارتقاء کا عمل جاری تھا اور اُس وقت تک انسان کا سیاسی شعور صرف حکومت کے تصوّر تک پہنچا تھا۔ ابھی یہ تصوّر وجود میں نہیں آیا تھا کہ حکومت صرف ایک انتظامی ادارہ ہے

جبکہ اصل ادارہ ریاست (state) ہے — کسی ریاست کے شہریوں کی اصل وفاداری ریاست کے ساتھ ہوتی ہے نہ کہ حکومت کے ساتھ — حکومت لوگوں کے منشا اور مرضی سے بنے گی بھی اور ٹوٹے گی بھی، لیکن اصل اہمیت، استحکام اور دوام ریاست کو ہے جس کے ساتھ وفاداری شہریت کا لازمی تقاضا ہے۔ یہ تصوّر اُس وقت تک نوعِ انسانی کے ذہن میں موجود نہیں تھا، اس لیے قرآن حکیم نے اس سطح پر صرف اصول دیے ہیں۔ اب ہمیں انہی اصولوں کی روشنی میں اسلام کے سیاسی اور ریاستی نظام کو سمجھنا ہے۔

موجودہ دور کے مسلم مفکّرین

موجودہ دور کے مسلم مفکّرین میں مَیں سب سے زیادہ علّامہ اقبال کی صحتِ فکر اور جامعیتِ فکر کا قائل ہوں۔ ایک طرف تو انہوں نے بڑے غامض فلسفیانہ مسائل سے بحث کی جس کا تعلق اس سلسلۂ خطابات کے پہلے دو خطابات: ''اسلامی نظام کی نظریاتی اساس: ایمان'' اور ''اسلام کا اخلاقی اور روحانی نظام'' سے ہے۔ دوسری طرف علّامہ اقبال نے اسلام کی ہیئت اجتماعیہ اور سیاسی و معاشرتی نظام کے بارے میں صحیح اور جامع ترین فکر دی۔ یعنی یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اقبال نے پوری ''مجدّدانہ'' شان کے ساتھ اسلام کے اصل انقلابی فکر کی از سرِ نو تدوین کا فریضہ سرانجام دیا اور اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے عطا کردہ نظامِ عدلِ اجتماعی کو عہدِ حاضر کی اعلیٰ ترین فکری سطح اور حقوقِ انسانی کے بلند ترین تصوّرات کے ساتھ ہم آہنگ کر کے پیش کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ علّامہ اقبال نے مغربی فکر کی گہرائی میں اُتر کر اس کا شعور و ادراک حاصل کر کے اس کی صحیح تشخیص کی اور اس میں صحیح اور غلط اجزاء علیحدہ علیحدہ کر کے اس کی تمیز کی۔ چنانچہ مَیں سمجھتا ہوں کہ اس اعتبار سے علّامہ اقبال کو فکرِ اسلامی کے ''مجدّد'' کی حیثیت حاصل ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ ان کی بعض آراء سے کسی کو اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ خود علّامہ اقبال نے ''Reconstruction of Religious Thought in Islam'' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ''مَیں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ جو کچھ مَیں نے کہا ہے وہ حرفِ آخر

ہے اور وہی حق ہے' بلکہ مَیں نے جو کچھ سمجھا ہے وہ پیش کیا ہے۔ ہمارا طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ ہمارا طالب علمانہ رویّہ برقرار رہے۔ ہوسکتا ہے کہ جیسے جیسے اس میدان میں کچھ کام کرنے والے لوگ آگے بڑھیں اس سے صحیح تر خیالات ظاہر ہوں۔'' (مفہوم) یہ ان کی طرف سے کسرِ نفسی کا اظہار ہے جو بجائے خود ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ البتہ مَیں ان لوگوں سے شدید اختلاف رکھتا ہوں جن کا مزاج یہ ہے کہ اگر کسی شخصیت سے عقیدت ہو تو اس کے بارے میں ایک غلو پیدا ہو جائے اور محبّت و عقیدت اس درجے کو پہنچ جائے کہ اس کی کوئی خامی نظر نہ آئے' بلکہ خامیاں بھی خوبیاں نظر آنے لگیں۔ اسی طرح اگر کسی سے کوئی اختلاف ہو تو پھر اس کی کوئی خوبی' کوئی خیر نظر ہی نہ آئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ((حُبُّکَ الشَّیْءَ یُعْمِیْ وَیُصِمُّ))(۱) ''تمہارا کسی سے محبّت کرنا تمہیں اندھا بہرا کر دیتا ہے۔'' مَیں سمجھتا ہوں کہ اس دورِ زوال میں ہمارے بزرگوں اور موجودہ دور کے فکری' عملی' دینی اور سیاسی رہنماؤں میں سے کسی نے اگر ہمارے دین کے کسی ایک گوشے میں بھی' مثلاً احیائے ملّت' احیائے دین' احیائے فکرِ اسلامی' احیائے عمل' احیائے تصوّف' احیائے احسان' میں کوئی خدمت کی ہے' کوئی کام کیا ہے تو اس کی عظمت کا اعتراف اور اقرار ہونا چاہیے' لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ آپ اندھے پیروکار بن جائیں اور اس کی کسی بات پر آپ کی ناقدانہ نگاہ نہ پڑے۔

تجدید فکرِ اسلامی میں علّامہ اقبال کے بعد دوسری اہم شخصیت مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ہے۔ میرے نزدیک اسلامی نظامِ حیات کے دو گوشوں یعنی معاشرتی اور سیاسی نظام کے بارے میں بنیادی فکر علّامہ اقبال کے ہاں موجود ہے' لیکن اسے مولانا مودودیؒ نے جس خوبصورتی' سلاست' وضاحت اور منفرد اسلوبِ نگارش سے عام کیا ہے یہ ان کا بہت بڑا حصّہ (contribution) ہے' بلکہ مَیں انہیں اس دور کا سب سے بڑا مسلم سیاسی مفکّر سمجھتا ہوں۔ جدید اسلامی ریاست کا تصوّر اور اس کی فلسفیانہ اساس کے علاوہ اس جدید اسلامی ریاست کا ڈھانچہ (structure) کیا ہوگا' اس کی ہیئتِ تشکیلی کیا بنے گی'

---

(۱) سنن ابی داؤد' کتاب الادب' باب فی الھوی۔

ان کے بارے میں جو وضاحت، تفصیل اور جامعیت مولانا مودودیؒ کے ہاں ملتی ہے اس اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ علّامہ اقبال سے آگے ہیں۔

اسلامی ریاست ایک نظریاتی ریاست

اس تمہید کے بعد اب مَیں اپنے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ اسلامی ریاست یا سیاسی نظام سے متعلق آج مَیں سات باتوں کے حوالے سے گفتگو کروں گا۔ ان میں سے سب سے پہلی بات اصل الاصول کا درجہ رکھتی ہے کہ اسلامی ریاست قومی ریاست نہیں، نظریاتی ریاست ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اس پر مجھے زیادہ تفصیل میں جانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اس بات کو علّامہ اقبال نے اشارات میں اور ان کے بعد مولانا مودودی اور دوسرے اہلِ قلم نے تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اسلامی ریاست قومی ریاست نہیں، بلکہ نظریاتی ریاست (Ideological State) ہے۔ اگرچہ یہ ریاست زمین پر قائم ہوگی اور اس کی حدود بھی ہوں گی اور ان حدود کی اسی طرح حفاظت بھی کی جائے گی جیسے ایک قومی ریاست اپنی سرحدوں کا دفاع کرتی ہے، لیکن وہ ان حدود پر مبنی نہیں ہوگی۔ اس حوالے سے یہ بنیادی بات سمجھ لیجیے کہ اس ریاست کی اساس اور بنیاد ان حدود پر نہیں ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر اللہ کا فضل ہوا اور خالص اسلامی ریاست قائم ہوئی (یہ اللہ کا وعدہ ہے جو پورا ہو کر رہے گا، لیکن کب اور کہاں؟ یہ مختلف بات ہے) تو چونکہ یہ قومی ریاست نہیں ہوگی لہٰذا potentially اس کی حدود ہمیشہ وسعت پذیر ہوں گی۔ یہ حدود ایسی نہیں ہوں گی جو بس دائم و قائم اور ہمیشہ کے لیے اٹل ہوں، بلکہ جس طرح نظریے میں اگر توانائی اور قوت ہو تو وہ حدود و قیود سے بالکل ماورا ہو کر پھیلتا ہے اسی طرح نظریاتی ریاست جو کسی نظریاتی انقلاب کی بنیاد پر قائم ہو، اس کی فطرت اور مزاج میں یہ بات شامل ہوتی ہے کہ وہ کسی حدود پر قانع نہیں رہتی بلکہ وسعت پذیر ہوتی ہے۔

اسلامی ریاست کی اگرچہ زمینی حدود ہوتی ہیں، لیکن اسلامی ریاست کی بنیاد کسی علاقے پر نہیں بلکہ ایک نظریے یعنی ایمان اور اسلام پر ہوتی ہے۔ اس حوالے سے یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ اصولاً تو بنیاد ایمان ہے لیکن قانونی اور دستوری طور پر ایمان نہیں،

اسلام بنیاد ہے۔ اس لیے کہ ایمان ایک مخفی حقیقت ہے جو قابلِ توثیق (verifiable) نہیں ہے۔ کسی کے دل میں ایمان ہے یا نہیں' کوئی منافق ہے' کوئی بہروپیا ہے' کوئی جاسوس بن کر آ گیا ہے (جیسے دو یہودی حضور ﷺ کے جسدِ اطہر کو قبر شریف سے نکال کر لے جانے کے لیے آئے اور انہوں نے ایسا بہروپ اختیار کیا کہ کسی کو شک بھی نہ ہوا) ہمارے پاس ایسا کوئی آلہ نہیں ہے کہ ہم کسی کے دل کا حال جان سکیں اور اس کے ایمان کی تصدیق و توثیق اور جانچ پڑتال کر سکیں۔ جبکہ ایک قانونی اور دستوری ڈھانچہ لازماً ایک ایسی اساس کا متقاضی ہے جو قابلِ تصدیق ہو' لہٰذا اصولاً تو اسلامی ریاست ایمان پر قائم ہے لیکن اس کی دستوری اور قانونی اساس ایمان نہیں اسلام ہے۔

اس ضمن میں ایک اور بات ملحوظِ خاطر رہے کہ خالص اسلامی ریاست تو دورِ نبوی ﷺ اور دورِ خلافت راشدہ میں اپنی کامل اور تکمیلی شکل میں دنیا میں بالفعل قائم رہی ہے اور اس کے بعد سے زوال شروع ہوا۔ اگرچہ دورِ بنو اُمیہ کو اس اعتبار سے ایک فضیلت حاصل ہے کہ اس میں اُمّت کی ایک وحدت تھی' ایک ہی حکومت' ایک ہی ریاست اور ایک ہی نظام تھا' لیکن جیسے ہی دورِ بنو اُمیہ ختم ہوا تو عالمِ اسلام دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک طرف خلافت بنو عباس قائم ہو گئی اور دوسری طرف سپین میں خلافت بنی اُمیہ جاری رہی۔ اس کے بعد تقسیم در تقسیم ہوتی گئی اور تقسیم کا یہ عمل جاری رہا۔ لیکن ایک بڑی اہم حقیقت پیش نظر رہے کہ اس پورے عرصے میں اور اس صدی کے آغاز تک مسلمانوں کی وحدتِ ملّی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اگرچہ حکومتیں جُدا تھیں لیکن ریاست ایک ہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان اس عالمی ریاست بلکہ صحیح تر الفاظ میں آفاقی اسلامی ریاست کا شہری تھا اور اسے کہیں بھی کسی پاسپورٹ یا ویزے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک شخص مراکش سے چل کر ہندوستان آ پہنچتا ہے اور یہاں وہ وزیر بن جاتا ہے' اسے کوئی نہیں پوچھتا کہ تمہاری قومیت کیا ہے' تمہاری نسلیت کیا ہے' تم زبان کون سی بولتے ہو' یہاں آئے کیسے ہو' داخل کیسے ہوئے ہو؟ مسلمان چاہے مشرق کا ہو یا مغرب کا وہ اس آفاقی اسلامی ریاست کا شہری تھا' البتہ حکومتیں اور انتظامی یونٹ الگ تھے۔ ان جداگانہ انتظامی یونٹس کے باوجود

مسلمانوں کی وحدتِ ملّی اس صدی کے آغاز تک برقرار رہی ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد جو سب سے کاری وار عالمِ اسلام اور ملّتِ اسلامیہ پر مغربی استعمار (imperialism) نے کیا وہ یہی ہے کہ مسلمانوں کی وحدتِ ملّی کے تصوّر کو پاش پاش کر دیا اور قومیّتوں کے تصوّر کو عام کیا۔ پہلے قوموں اور پھر قومیّتوں کی تقسیم در تقسیم کا عمل جو اس صدی میں دوسری دہائی کے بعد سے چلنا شروع ہوا ہے' وہ ابھی جاری ہے اور اگر اس میں کوئی انقلابی تبدیلی نہ آئی تو نمعلوم ابھی اور کیا شکلیں اختیار کرے گا۔

قومی ریاست (Nation State) کا تصوّر ایک جدید تصوّر ہے اور ہمارے جن علمائے کرام نے جدید نظریات اور جدید تصوّرات کا مطالعہ نہیں کیا' وہ سمجھ نہیں پائے کہ اس میں کتنا کچھ زہر گھلا ہوا ہے اور یہ تصوّر بنیادی طور پر اسلام کی جڑوں پر کس طرح تیشہ بن کر گر رہا ہے۔ اس کا صحیح صحیح ادراک اور شعور صرف علّامہ اقبال کو ہوا اور انہوں نے اسلامیانِ ہند کو متنبہ کیا کہ ؎

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
فرمانِ نبوّت میں وطن اور ہی کچھ ہے!

ان دونوں کے لفظی اشتراک کی وجہ سے دھوکہ نہ کھاؤ' یہ تو تہذیبِ جدید کا نوتراشیدہ بُت ہے۔ اس ضمن میں اقبال کے جذبات کی شدّت اس وجہ سے ہے کہ وہ خود مغرب میں گئے اور انہوں نے مغرب کے فکر اور فلسفہ کا براہِ راست مطالعہ ہی نہیں' مشاہدہ بھی کیا۔ ان کا اپنے بارے میں کہنا ہے ع ''کہ مَیں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ!'' واقعہ یہ ہے کہ وہ مغربی تہذیب کے آگ کے اس الاؤ کے اندر گئے ہیں اور وہاں جا کر انہوں نے اس کی شدّت وحدّت کا مشاہدہ کیا ہے۔ تو مغربی فکر و فلسفہ میں جو زہر گھلا ہوا ہے اس کو جتنا وہ سمجھ سکے ہیں' وہ ان لوگوں کے لیے ممکن ہی نہیں تھا جنہوں نے سرے سے مغربی فکر کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔ ان کا خلوص و اخلاص اور دین کا علم اپنی جگہ قابلِ قدر ہے' لیکن جدید گمراہ کُن تصوّرات کی صحیح طور پر جانچ پڑتال (evaluation) کہ یہ کس جگہ ہمارے دین اور ہمارے جسدِ ملّی پر زخم لگا رہے ہیں' اس کی اپنی ایک جداگانہ حیثیت ہے اور اس

کے تقاضے بھی مختلف ہیں جن کا پورا کیا جانا ضروری ہے۔ علّامہ اقبال کی نظم ''وطنیت'' (یعنی وطن بحیثیت ایک سیاسی تصوّر کے) اس ضمن میں حرفِ آخر ہے: ؎

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظّارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے!

مَیں جب بھی یہ اشعار پڑھتا ہوں، مجھے غالب کا یہ شعر بھی یاد آ جاتا ہے: ؎

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل اٹھا!

علّامہ کی اس نظم کا آخری شعر ملاحظہ کیجیے ؎

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے!

چنانچہ اسلام کے سیاسی نظام کے حوالے سے پہلی بات یہ نوٹ کر لیں کہ اسلامی ریاست ایک نظریاتی ریاست ہے جس کی بنیاد اصولاً ایمان پر اور دستوراً و قانوناً اسلام پر ہے۔ مَیں نے اپنے گزشتہ خطاب میں یہ عرض کیا تھا کہ اسلامی معاشرہ ایک نظریاتی معاشرہ ہے جس میں فرق و امتیاز رنگ و نسل، زبان اور علاقے کی بنیاد پر نہیں بلکہ ایک نظریے یعنی ایمان اور اسلام کی بنیاد پر ہوگا۔ اسلامی معاشرے میں غیر مسلم ثانوی حیثیت سے شریک ہیں، وہ اس معاشرے کا اصلاً جزو نہیں ہیں۔ ان میں سے جو غیر متحارب ہیں ان کے ساتھ بھلائی اور تالیفِ قلب کا معاملہ کرنا جائز ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝﴾ (المُمتحنة)

''اللہ تم کو منع نہیں کرتا ان لوگوں سے جو تم سے تمہارے دین کے بارے میں لڑتے نہیں ہیں اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالتے ہیں' کہ تم ان سے نیکی اور انصاف کا معاملہ کرو۔ یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔''

لیکن ان سے دوستی' مودّت اور محبّتِ قلبی نہیں ہو سکتی' اس لیے کہ اس کا دائرہ محدود ہے:

﴿اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ۝﴾ (المائدة)

''تمہارے ولی تو اصل میں اللہ' اُس کا رسولؐ اور اہلِ ایمان ہیں' جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں جھک کر۔''

یہ ہے ہماری ولایتِ قلبی کا دائرہ — اس اعتبار سے ہمارا معاشرہ مخلوط معاشرہ نہیں بلکہ اسلامی معاشرہ ہے۔ اس پر گزشتہ خطاب میں قرآن وحدیث سے حوالے پیش کیے جا چکے ہیں۔

اللہ کی حاکمیتِ مطلقہ

اسلام کے سیاسی نظام کے ضمن میں دوسری بحث یہ ہے کہ حاکمیتِ مطلقہ (sovereignty) کس کی ہے' اقتدارِ اعلیٰ کا مالک کون ہے؟ اور قانون کی تشکیل' اس کی تشریح اور اس کی تنفیذ کس کے ذریعے ہوگی؟ اس میں بھی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ الحمدللہ! یہ باتیں بہت عام ہیں کہ حاکمیتِ مطلقہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ مَیں نے خطاب کے آغاز میں آیاتِ قرآنیہ کے تین ٹکڑے پڑھے تھے:

(i) ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ﴾ (یوسف: ۴۰) ''حکم صرف اللہ ہی کے لیے ہے۔''

(ii) ﴿وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ۝﴾ (الکھف) ''وہ اپنی حاکمیت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔''

(iii) ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ﴾ (بنی اسرائیل: ۱۱۱) ''حاکمیت میں اس کا شریک کوئی نہیں ہے۔''

ایک لفظ ہے حکومت یا حاکم' یہ مجازاً استعمال ہوتا ہے' لیکن حاکم مطلق وہ ذات ہے جس کے پاس قانون بنانے' اس کی تشریح اور اس کی تنفیذ کا مکمل اختیار ہو۔ اسلامی ریاست میں حاکمیتِ مطلقہ کا حق صرف اور صرف اللہ جلّ جلالہ کے لیے ہے۔ یہ بات بھی علّامہ اقبال نے کس قدر سادگی اور سلاست کے ساتھ بیان کی ہے: ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بُتانِ آزری!

یہاں بھی علّامہ اقبال نے لفظ بُت استعمال کیا ہے۔ ایک تو قومیت کا بُت اور دوسرا غیر اللہ کی حاکمیت کا بُت۔ یعنی حاکمیتِ مطلقہ اللہ کے سوا کسی اور کے لیے تسلیم کرنا کفر و شرک ہے۔

ایک دور میں ہمارے بعض دانشوروں نے اس حوالے سے ایک بحث چھیڑی تھی کہ حاکمیت تو عوام ہی کے پاس ہوتی ہے' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اختیار دیا ہے۔ نظری اعتبار سے یہ بات صحیح ہے کہ اللہ نے انسان کو اختیار (choice) دیا ہے: ﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ۝۳﴾ (الدھر) ''ہم نے اس کو راہ دکھلائی (یہ جانچنے کے لیے) کہ یہ شکر کرتا ہے یا ناشکری''۔ یہ اختیار تو گویا اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تخلیق کا جزوِ لاینفک ہے کہ یہ دُنیا کی زندگی امتحان گاہ ہے۔ اب اگر اختیار نہ ہو' کوئی choice نہ ہو تو پھر امتحان کیسا؟ لیکن اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ یہ اختیار چاہے اِدھر استعمال ہو جائے چاہے اُدھر' نتیجہ برابر نکلے گا۔ نتیجے میں تو زمین و آسمان کا فرق واقع ہو جائے گا۔ سورۃ الدھر میں ہی فرمایا: ﴿اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا۠ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ۝۴ اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ۝۵﴾ ''ہم نے تیار کر دی ہے منکروں کے واسطے زنجیریں' طوق اور دہکتی آگ۔ البتہ نیک لوگ ایسی شراب کے جام نوش کریں گے جس میں کافور کی آمیزش ہوگی''۔ اگر آپ اللہ کے ودیعت کردہ اختیار کو اپنے ہی اختیار سے اللہ کے قدموں میں ڈال دیں کہ اے پروردگار! تُو نے ہی مجھے اختیار دیا تھا' مَیں اس اختیار سے دستبردار ہوتا ہوں' مَیں اپنے اس اختیار کو تیرے قدموں میں

ڈالتا ہوں' تو یہ اسلام ہے۔ یہ تو تھا فرد کا معاملہ' پھر یہی معاملہ ہوگا اجتماعی سطح پر۔ مسلمان قوم اور اسلامی ریاست حقیقت میں وہ ہوگی جو اللہ کی طرف سے عطا کردہ اس اختیار کو اپنے ایک اجتماعی فیصلے کے تحت اللہ ہی کے قدموں میں ڈال دے۔ یہی وہ کام ہے جو ہمارے ہاں ''قراردادِ مقاصد'' کے ذریعے ہوا اور یہ تسلیم کیا گیا کہ یہ اختیار اللہ کی طرف سے دی ہوئی ایک امانت ہے' اور چونکہ حاکمیتِ مطلقہ اس کی ہے اس لیے ہم اس اختیار کو اُس کی عائد کردہ حدود کے اندر استعمال کریں گے۔ گویا ہم نے بالفعل تسلیم کر لیا کہ حاکمیتِ مطلقہ اللہ تعالیٰ کی ہے۔

حاکمیتِ الٰہیہ کا منطقی نتیجہ: خلافت

اللہ کی حاکمیتِ مطلقہ کو تسلیم کر لینے کا جو منطقی نتیجہ نکلتا ہے اس کے لیے قرآن مجید میں ''خلافت'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا منطقی نتیجہ خلافت ہے۔ بعض لوگوں کا طرزِ عمل ایسا ہوتا ہے کہ وہ نئے علمی نکات پیدا کرنے کا خاص ذوق رکھتے ہیں اور خواہ مخواہ کے مباحث اٹھاتے رہتے ہیں۔ مثلاً یہ بحث چھیڑ دی گئی کہ اللہ کا خلیفہ نہیں ہو سکتا' کیونکہ اللہ تو زندہ ﴿اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ ہے اور ہر جگہ موجود ہے' خلیفہ تو اُس کا ہوتا ہے جو فوت ہو گیا ہو اور جو کہیں غائب ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ اس لفظ کا یہ استعمال بھی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہِ طور پر جا رہے تھے تو اپنے بھائی کو خلیفہ بنا گئے تھے کہ تم میری خلافت کا حق ادا کرو' میرے فرائض اور ذمہ داری ادا کرو: ﴿وَقَالَ مُوْسٰی لِاَخِیْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ﴾ (الاعراف: ۱۴۲) ''اور کہا موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہ میرا خلیفہ رہ میری قوم میں''۔ اور پھر کوتاہی کی صورت میں واپس آ کر شکایت بھی کی تھی: ﴿بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِیْ مِنْۢ بَعْدِیْ ۚ﴾ (الاعراف: ۱۵۰) ''تم نے میرے بعد میری بُری نیابت کی''۔ یعنی تم نے خلافت کا حق صحیح طور سے ادا نہیں کیا۔ یہ بھی خلافت کا ایک تصوّر ہے' لیکن خلافت کے اصل تصوّر کو سمجھنے کے لیے انگریزی دورِ حکمرانی کے وائسرائے کی مثال کو سامنے رکھیے۔ اُس دَور میں حاکمیت ملکہ برطانیہ یا شاہِ برطانیہ کی تھی اور دہلی میں ان کا وائسرائے ہوتا تھا جو ان کے احکامات کی تعمیل و تنفیذ کرتا تھا' البتہ جن

معاملات میں وہاں سے حکم نہ ملتا وہاں وہ حکمت اور حالات کے تقاضوں کو سمجھ کر اپنی صوابدید سے فیصلہ کر سکتا تھا۔ یہ خلافت (vicegerency) کا صحیح تصوّر ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ اُس وقت حاکم ملکہ برطانیہ یا شاہِ برطانیہ تھا جبکہ یہاں معاملہ شہنشاہِ ارض وسماء کا ہے اور انسان کی حیثیت خلیفہ (vicegerent) کی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلافت عطا فرمائی' اس کا تذکرہ قرآن حکیم کی متعدد آیات میں کیا گیا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۭ﴾ (آیت ۳۰)

''اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں سے کہ مَیں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔''

اسی طرح سورۃ الانعام کی آخری آیت اس موضوع پر قرآن حکیم کی نہایت اہم آیت ہے۔ اس میں یہ فلسفہ اپنی تکمیلی شان کے ساتھ بیان ہوا ہے: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰۗىِٕفَ الْاَرْضِ﴾ ''وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا''۔ یہاں ''خَلٰۗىِٕفَ'' جمع کا صیغہ آیا ہے۔ ﴿وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ﴾ ''اور تم میں سے بعض کو بعض پر فوقیت دی''۔ ﴿لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ۭ﴾ ''تاکہ تمہیں جانچے' پرکھے اس میں جو کچھ اُس نے تمہیں عطا کیا ہے''۔ یہ جو تمہیں اختیار دیا گیا' autonomy دی گئی' اسی میں ابتلا ہے۔ اس زمین کو تمہارے چارج میں دے کر اور تمہیں اس کی خلافت عطا فرما کر تمہارا امتحان لیا جا رہا ہے۔ ﴿اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ۡ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۶۵﴾ ''بے شک تیرا رب جلد سزا دینے والا ہے' اور وہ بخشنے والا' رحم کرنے والا ہے''۔ اب تمہارے پاس دونوں راستے ہیں' اُدھر جاؤ گے تو اللہ سزا دینے میں بھی دیر نہیں لگاتا اور وہ غفور ورحیم بھی ہے۔

تمدنی ارتقاء اور اجتماعیت کی مختلف صورتیں

خلافت کے حوالے سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ یہ خلافت کس کی ہے؟ ایک فرد کی ہے' ایک بادشاہ کی ہے' ایک قبیلے کی ہے' ایک قوم کی ہے یا عوام کی ہے؟ یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر

گہرے غور وفکر کی ضرورت ہے۔ اصل میں اس مسئلے کا تعلق ہمارے دین سے نہیں بلکہ عمرانی اور تمدنی ارتقاء (social evolution) کے عمل سے ہے کہ انسان اس ارتقاء کی کس سطح پر ہے۔ عمرانی اور تمدنی ارتقاء کی تین سطحیں (stages) ہیں:

ایک زمانہ تھا جب انسان صرف قبائلی اجتماعیت سے واقف تھا۔ یہ قبائلی نظام پوری دنیا میں تھا اور اب بھی کہیں کہیں اس کے باقیات موجود ہیں۔ ہمارے ہاں بھی بعض علاقوں میں قبائلی نظام پوری شدّت کے ساتھ موجود ہے۔ قبائلی نظام میں ایک شیخِ قبیلہ (قبیلے کا سردار) ہوتا ہے۔ وہاں پر لوگوں میں سیاسی شعور (political consciousness) ابھی اتنا نہیں ہے کہ انہیں معلوم ہو کہ ہمارے بھی کچھ حقوق ہیں' بلکہ سب شیخِ قبیلہ ہی کا حکم مانتے ہیں۔ سیاسی و عمرانی ارتقاء کی اس سطح پر اگر شیخِ قبیلہ خود اس تصوّر کو اختیار کر لے کہ مَیں حاکم مطلق نہیں ہوں' میرا اختیار محدود ہے' مَیں خود اللہ کا بندہ ہوں' اللہ ہی کے حکم پر چلوں گا اور اللہ ہی کے حکم کو نافذ کروں گا تو خلافت کا تقاضا' دین کا تقاضا' توحید کا تقاضا پورا ہو جائے گا۔ ☆

اس سے ذرا آگے چلیے تو عمرانی ارتقاء کے اگلے مرحلے میں بڑی بڑی حکومتیں اور مملکتیں (empires) قائم ہوئیں۔ اس دَور میں بھی اجتماعی شعور ملوکیت تک پہنچا تھا' اس سے آگے کا وہ اہل نہیں ہوا' اس لیے وہاں پر جمہوریت اور عوام کے حقوق کی بات قبل از وقت اور مالا یطاق کے درجے کی بات ہوتی۔ اس سطح پر بھی بادشاہ اگر خود کو اللہ کا بندہ تسلیم کر رہا ہے اور اللہ ہی کی مرضی کی تنفیذ کر رہا ہے تو خلافت کا حق ادا ہو گیا۔ مثلاً حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمان علیہما السلام کی بادشاہت۔ یہاں یہ بات بھی نوٹ کر لیں کہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام حقیقتاً خلیفہ تھے لیکن مجازاً انہیں بادشاہ اور ان کی خلافت کو بادشاہت کہا گیا۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

☆ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہی پوزیشن تھی' وہ کہیں کے بادشاہ نہ تھے' بس ایک گھرانے کے سردار تھے' لیکن اللہ کے نبی تھے' اللہ کا حکم نافذ کرنے والے تھے۔ گویا وہ اپنے خاندان میں اللہ کے خلیفہ تھے۔ (خلافت کی حقیقت اور عصرِ حاضر میں اُس کا نظام' از ڈاکٹر اسرار احمد' ص ۷۷) (حاشیہ از مرتّب)

﴿یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ﴾ (صٓ:۲۶)

''اے داؤد! ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔''

داؤد علیہ السلام کی بادشاہت کا تعلق درحقیقت انسان کے تمدنی ارتقاء کی اس سطح سے ہے جس تک ابھی انسان پہنچا تھا' اس سے آگے اس کی رسائی نہیں تھی۔ لہٰذا تھی تو بادشاہت' لیکن وہ بادشاہت جب ایک بندۂ خدا کی ہے جو خود اللہ کا بندہ ہے' جو اپنے کُل اختیار کو اپنی مرضی سے اللہ کے قدموں میں ڈال چکا ہے' اور اسے معاشرے میں جو بھی حیثیت حاصل ہے اس کو وہ اللہ کی مرضی کی تنفیذ میں بروئے کار لا رہا ہے تو یہ درحقیقت خلافت تھی۔

عمرانی ارتقاء کی اس سطح پر اگر کوئی بادشاہ حکمرانِ مطلق ہونے کا دعویٰ کرے کہ میرا اختیار ہے' میرے پاس authority ہے' مَیں جو چاہوں فیصلہ کروں تو یہ کفر اور شرک ہے۔ اس کی مثال فرعون اور نمرود کی بادشاہت ہے۔ ایک طرف ان کی بادشاہت اور دوسری طرف داؤد اور سلیمان علیہما السلام کی بادشاہت' سیاسی ڈھانچے کے اعتبار سے دونوں مشابہ ہیں' لیکن حضرات داؤد اور سلیمان علیہما السلام کی بادشاہت تو حق ہے اور توحید و خلافت کے تقاضے پورے کر رہی ہے' لیکن دوسری طرف فرعون و نمرود کی بادشاہت کفر ہے' جنہوں نے اقتدارِ مطلق کا دعویٰ کیا تھا۔ فرعون کا دعویٰ تھا: ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی ﴿۲۴﴾﴾ (النازعات) ''مَیں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں''۔ اُس کا ربّ ہونے کا دعویٰ اس معنی میں تو نہیں تھا کہ مَیں نے تمہیں پیدا کیا ہے' کیونکہ کوئی احمق ایسا نہیں تھا جو اس دعوے کو مان لیتا۔ وہاں ایسے بزرگ بھی موجود ہوں گے جن کے سامنے وہ خود پیدا ہوا تھا اور اس کا بچپن گزرا تھا۔ تو ظاہر بات ہے وہ خالق ہونے کا مدّعی نہیں تھا بلکہ اس کا دعویٰ حاکم اور مالک ہونے کا تھا۔ قرآن حکیم میں اس کے الفاظ نقل ہوئے ہیں: ﴿یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ﴾ ''اے میری قوم! کیا ملکِ مصر کی بادشاہت میری نہیں ہے؟'' ﴿وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ ۚ﴾ (الزخرف:۵۱) ''اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہیں؟'' یعنی یہ جو دریائے نیل اس ملک مصر کی معاشی لائف لائن ہے اور اس سے جو بھی آبپاشی کا نظام ہے' یہ میرے اختیار میں ہے' جس کو چاہوں پانی دوں اور جس کو

چاہوں نہ دوں، جس کا چاہوں موگھا کھلا کر دوں اور جس کا چاہوں بند کر دوں۔ لہٰذا میں نہیں جانتا کہ کوئی بالاتر اقتدار بھی ہے۔ یہ دعویٰ درحقیقت خدائی کا دعویٰ ہے اور یہ کفر اور شرک ہے۔ ☆

اس سے آگے اب تمدنی ارتقاء کا وہ دور آیا جس میں حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ اُس وقت بڑی بڑی حکومتوں کا دور اپنے پورے عروج کو پہنچ کر زوال سے دوچار ہو چکا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب انسان میں اپنے حقوق کا شعور پیدا ہوا اور بادشاہت کے خلاف ایک ردِّ عمل پیدا ہوا کہ یہ بھی انسان ہیں، ان کے پاس بھی دو ہاتھ، دو پاؤں، دو آنکھیں ہیں جو ہمارے پاس بھی ہیں، تو پھر یہ کیونکر خدائی حقوق (Divine Rights of the kings) کے مدّعی بن کر بیٹھ گئے ہیں؟ جیسے ان کے حقوق ہیں ویسے ہمارے حقوق بھی ہونے چاہئیں۔ یہ شعور کی وہ منزل ہے کہ جس پر آ کر اب معاملہ جمہوریت تک آیا ہے۔ اس جمہوریت کے حوالے سے یہ جان لیجیے کہ اگر جمہوریت میں حاکمیتِ مطلقہ عوام کی تسلیم کی گئی ہے تو یہ کفر اور شرک ہے۔ جس طرح بادشاہت مطلقہ کفر اور شرک ہے اسی طرح عوام کی مطلق حاکمیت بھی کفر اور شرک ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی خلافت اور حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت میں سولہ سو سال کا فصل ہے۔ اس میں انسان کی سوچ نے منزلیں طے کی ہیں، تمدن نے ارتقاء کا سفر طے کیا ہے، عوام میں اپنے حقوق کا شعور پیدا ہوا، چنانچہ اب شخص واحد کی حکومت نہیں چل سکتی۔ اقبال نے کس قدر پیاری بات کہی ہے کہ ابلیس کو بھی اپنی سٹریٹجی بدلنی پڑی اور اُس نے انسانی حاکمیت کے تصوّر کو اجتماعی حاکمیت (popular sovereignty) کی شکل دی تاکہ اس کی شیطنت برقرار رہے۔ ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں علّامہ اقبال ابلیس کے ایک مشیر کی زبان سے یہ کہلواتے ہیں: ؎

☆ ہم کہہ سکتے ہیں کہ شروع سے ہی حاکمیت اور خلافت کے درمیان معرکہ آرائی رہی ہے۔ گویا: ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی!

(مرتّب)

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خودشناس و خودنگر

یعنی عمرانی ارتقاء کے نتیجے میں اب آدم خودشناس اور خودنگر ہو گیا ہے' اسے اپنے بارے میں احساس اور شعور ہے کہ ہمارے بھی حقوق ہیں اور ان کی حفاظت کرنے کا اس میں داعیہ پیدا ہو گیا ہے' لہٰذا اب ہمیں یہ مشکل کام کرنا پڑا ہے۔ پہلے تو ہم ٹنوں کی مقدار میں گندگی ایک شخص کے سر پر رکھ کر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے تھے' جیسے فرعون اور نمرود کے سر پر حاکمیت کا تاج رکھ کر ہمارا کام ختم ہو گیا' مگر اب انسانی شعور کے بعد وہ حاکمیت کا تاج جو حقیقتاً ٹنوں کی مقدار میں گندگی اور نجاست ہے' اس کو ہم نے تولہ تولہ' ماشہ ماشہ عوام کے اندر تقسیم کر دیا ہے۔ اب وہ ایک شخص کی ملوکیت (monarchy) کے بجائے حاکمیت جمہور (democracy) کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ اس میں حاکمیتِ غیر اللہ جو اجتماعی حاکمیت (popular sovereignty) کی صورت میں موجود ہے' وہ کفر ہے' شرک ہے۔

اجتماعی خلافت کا تصوّر

اسلام میں حاکمیت کے بجائے خلافت کا تصوّر ہے اور جب تک نبوت کا سلسلہ جاری تھا تب تک خلافت شخصی تھی۔ نبی اکرم ﷺ بھی خلیفہ تھے' لیکن جب آپ ﷺ کا انتقال ہوا اور آپؐ کے ساتھ ہی وحی اور نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا تو خلافت میں ایک انقلاب برپا ہوا کہ شخصی خلافت ختم ہو کر اجتماعی خلافت وجود میں آ گئی۔ یعنی اسلام میں اجتماعی حاکمیت (popular sovereignty) کے بجائے اجتماعی خلافت یا خلافت عامہ (popular vicegerency) کا اصول کارفرما ہے۔ اس خلافت کا ہمارے سامنے کامل ترین نمونہ جس سے بہتر کسی ریاست کا تصوّر ممکن نہیں' خلافتِ راشدہ کا تصوّر ہے۔ حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے دور میں دین کامل ہوا اور واقعہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے نوعِ انسانی کو ناقابلِ یقین حد تک اونچی چھلانگ لگوائی ہے۔ ؎

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں' اللہ کی ہے یہ زمیں!

خلافتِ راشدہ جو زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکی، میرے نزدیک اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نوعِ انسانی کو جتنی بلند چھلانگ لگوادی تھی، ابھی بحیثیت مجموعی انسانی شعور اس سطح تک نہیں آیا تھا، اور وہ ابھی اس بار کو اُٹھانے کے قابل نہیں ہوا تھا۔ چونکہ نبوت و رسالت کا مقصد ہی اِتمامِ حُجّت ہے اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کا ایک نمونہ دکھا کر نوعِ انسانی پر ہمیشہ ہمیش کے لیے حُجّت قائم کر گئے۔

حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس وقت کے معاشرے اور ریاست کو بالفعل اعلیٰ ترین اخلاقی اقدار پر قائم کر کے دکھایا، جس کا اعتراف دشمنوں نے بھی کیا۔ گزشتہ خطاب میں ایچ جی ویلز کا حوالہ آیا تھا کہ اُس نے تسلیم کیا کہ:

> ''اگرچہ انسانی حریت، اخوت اور مساوات کے وعظ تو دنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان چیزوں کے بارے میں مسیح ناصری کے ہاں بھی بہت سے مواعظِ حسنہ ملتے ہیں، لیکن یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہ صرف محمدِ عربی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تھے جنہوں نے تاریخِ انسانی میں پہلی مرتبہ بالفعل ایک باضابطہ معاشرہ انہی اصولوں پر قائم کر کے دکھایا۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب ارشادِ گرامی ''سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُھُمْ'' آج بہت سے لوگوں کو ناقابلِ عمل محسوس ہوتا ہے اور وہ اسے شاعری قرار دیتے ہیں، لیکن محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بالفعل ایسا کر کے دکھایا۔ حضرات ابوبکر صِدّیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما بھی حکمران نہیں، بلکہ خادم تھے، ان کی زندگیوں کی پوری تصویر ہمارے سامنے موجود ہے۔

''جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے'' کے مصداق مَیں یہاں گاندھی کے مقالہ کا ذکر کرتا ہوں۔ ۱۹۳۷ء میں جب پہلی مرتبہ ہندوستان میں صوبائی وزارتیں بنیں، اُس وقت مسلم لیگ نے الیکشن کا بائیکاٹ کیا تھا، اس لیے کہیں بھی مسلم لیگ کی حکومت نہیں تھی اور پورے ہندوستان میں بیک وقت کانگریس کی حکومت تھی۔ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں یہ ایک بہت بڑا ٹرننگ پوائنٹ تھا۔ اُس وقت گاندھی کا ایک مقالہ ''ہریجن'' میں شائع ہوا تھا، جس میں اُس نے اپنے وزراء کے لیے لکھا: ''مَیں آپ لوگوں کے سامنے حضرت ابوبکر اور

حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کی مثال پیش کر رہا ہوں' ان کے پیچھے چلو'۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ گاندھی نے ایسا کیوں کہا' اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا ہندوستان کی تاریخ اتنی بانجھ رہی ہے کہ یہاں کبھی بھی عظمت کا کوئی مظہر نہیں رہا؟ کیا بکرماجیت جیسا عادل بادشاہ ہندوستان میں نہیں تھا؟ کیا اشوک جیسا درویش بادشاہ ہندوستان میں نہیں رہا؟ پھر گاندھی نے ان کا نام کیوں نہیں لیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بادشاہ تھے اور بادشاہت کا دور ختم ہو چکا۔ لہٰذا یہ لوگ عہدِ حاضر کے لیے قابلِ تقلید نہیں ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((اِذَا هَلَکَ کِسْرٰی فَلَا کِسْرٰی بَعْدَهٗ وَاِذَا هَلَکَ قَیْصَرَ فَلَا قَیْصَرَ بَعْدَهٗ)) (۲)

''جب کسریٰ (شاہِ ایران) ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں ہو گا اور جب قیصر (شاہِ روم) ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد کوئی قیصر دوبارہ نہیں ہو گا۔''

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دور کے فاتح (افتتاح کرنے والے) ہیں جس دور میں بادشاہت ختم ہو رہی تھی۔ اب بھی دنیا میں بادشاہت کہیں باقی رہ گئی ہے تو بدقسمتی سے صرف عالمِ اسلام کے اندر رہ گئی ہے۔ باقی مشرق و مغرب میں اگر کہیں بادشاہت موجود ہے تو صرف علامتی ہے' جو وہاں کے ''نیشنل میوزیم'' کی زینت ہے۔ مصر کے شاہ فاروق نے کہا تھا کہ عنقریب دنیا کے اندر صرف پانچ بادشاہ رہ جائیں گے' ایک انگلستان کی بادشاہت اور چار تاش کے بادشاہ' ان کے علاوہ اور کوئی نہیں رہے گا۔

بہرحال انسان کی خلافتِ عامّہ کا کامل ترین نمونہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قائم کر کے دکھا دیا تاکہ نوعِ انسانی کے اجتماعی ضمیر پر ہمیشہ ہمیش کے لیے حُجّت قائم ہو جائے۔ اس بات کو علّامہ اقبال نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نوعِ انسانی میں جتنا بھی فکری' تمدنی' ذہنی اور معاشرتی ارتقاء ہوا ہے وہ سب درحقیقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کا فیض ہے۔ ؎

ہر کُجا بینی جہانِ رنگ و بُو
آں کہ از خاکش بروید آرزو

(۲) صحیح البخاری' کتاب المناقب' باب علامات النبوۃ فی الاسلام۔ وصحیح مسلم' کتاب الفتن واشراط الساعۃ' باب لا تقوم الساعۃ حتی یمر الرجل بقبر الرجل...

یا ز نورِ مصطفیٰؐ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است☆

یعنی دنیا میں جہاں بھی کوئی خیر ہے، خوبی ہے، کوئی اعلیٰ قدر ہے، چاہے نظامِ عدالت کی ہو، نظامِ حکومت کی ہو، یا کسی اقتصادی نظام کی ہو، وہ درحقیقت یا تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے مستعار لی گئی ہے یا ابھی انسان گھسٹ گھسٹ کر اسی منزل کی طرف جا رہا ہے جس منزل پر آج سے چودہ سو برس قبل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انسانیت کو پہنچا دیا تھا۔

خلافتِ راشدہ دوبارہ قائم نہیں ہو سکتی!

سیاسی نظام سے متعلق میری بات غور طلب ہے اور میری یہ بات شاید بہت سے حضرات کو چونکا دے کہ خلافتِ راشدہ دوبارہ قائم نہیں ہو سکتی۔ پہلی مرتبہ جب مَیں نے یہ بات کہی تھی تو برادرم مجیب الرحمٰن شامی نے ''قومی ڈائجسٹ'' میں میرا انٹرویو شائع کیا اور اس کی تشہیر کے لیے پوسٹر شائع کیا جس میں جلی حروف سے میرے یہ الفاظ نمایاں کیے گئے: ''اب خلافتِ راشدہ دُنیا میں کبھی قائم نہیں ہو سکتی!'' یہ بات ذرا تفصیل سے عرض کی جائے تو سمجھ میں آئے گی۔ میرا موقف یہ ہے کہ خلافت راشدہ کا بعینہٖ وہی نقشہ دنیا میں اب قیامت تک نہیں آ سکتا۔ اس کی وجوہات درج ذیل ہیں۔

(ا) خلافتِ راشدہ، دورِ نبوت کا ضمیمہ: اگرچہ خلافتِ راشدہ کا دور ہماری تاریخ کے عہد زرّیں کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے ساتھ محبّت اور عقیدت کے رشتے کا استوار ہونا عین ایمان کا تقاضا ہے، لیکن دوسری جانب اس حقیقت کو ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ دورِ خلافتِ راشدہ کے بعض ایسے خصائص اور امتیازات ہیں جو اس کے نظامِ حکومت میں تو جزوِ لاینفک کے طور پر پیوست تھے لیکن اب دنیا میں دوبارہ کبھی وجود میں نہیں آ سکتے۔ مثلاً اوّلین اور اہم ترین یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ درحقیقت خلافت علیٰ منہاج النبوۃ ہے، وہ دورِ نبوت کا ضمیمہ، تتمہ اور تکملہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد اب نہ تو نبوت کا کوئی امکان ہے

☆ ''تم (آج) جہاں کہیں رنگ و بو کی وہ دنیا دیکھتے ہو جس کی خاک سے آرزو، نشوونما پاتی ہے، وہ یا تو نورِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے روشن ہے یا اب تک تلاشِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں سرگرداں ہے۔'' (مرتّب)

اور نہ کسی نبوت کے تکملہ اور تتمہ کا۔

(ب) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی درجہ بندی: حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نبوت ختم ہوئی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں اشخاص کے مابین ایک درجہ بندی (gradation) ہوگئی' بایں معنی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ۲۳ برس کی انقلابی جِدّ و جُہد میں کون السّابقون الاوّلون ہیں' کون بدری ہیں' کون وہ ہیں جنہوں نے محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت علی الموت یعنی بیعتِ رضوان کی تھی اور کون وہ ہیں کہ جو فتح مکّہ کے بعد ایمان لائے: ﴿لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ﴾ (الحدید:۱۰) ''برابر نہیں ہیں تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے فتح سے پہلے اِنفاق اور قتال کیا تھا۔ ان کے درجات بہت بلند ہیں اُن کے مقابلے میں جنہوں نے فتح کے بعد اِنفاق اور قتال کیا''۔ وقِس علیٰ ذٰلک۔ ظاہر ہے کہ اب انسانوں میں ایسی درجہ بندی نہیں ہوسکتی۔

دورِ نبویؐ اور دورِ خلافتِ راشدہ میں بدری ہونا بڑے اعزاز کی بات تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت حاتم بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ سے ایک بڑی خطا ہوگئی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکّہ مکرمہ کی طرف پیش قدمی کا ابھی پروگرام بنا رہے تھے کہ ان صحابی نے راز فاش کر دیا اور مکّہ والوں کو اطلاع پہنچا دی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم پر حملہ کرنے والے ہیں۔ جرم اتنا بڑا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: مجھے اجازت دیجیے کہ مَیں اس کی گردن مار دوں! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا: اے عمر! تمہیں معلوم نہیں ہے کہ یہ بدری ہیں اور اللہ نے اہلِ بدر کی ساری اگلی پچھلی خطائیں معاف کر دی ہیں۔

تو یہ وہ درجہ بندی ہے جو اِس زمانے میں نہ تو فی الوقت موجود ہے اور نہ آئندہ اس کا امکان ہے' اس لیے کہ یہ صرف نبوت کے ساتھ خاص ہے اور نبوت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم ہوگئی۔

(ج) سُنّتِ خلفاءِ راشدین کا اتّباع لازم: دورِ خلافت راشدہ میں جو فیصلے خلفاءِ راشدین نے کیے' ہمارے ہاں انہیں ایک ابدی حیثیت حاصل ہے اور وہ ہماری شریعت میں حُجّت ہیں۔ اُس دور میں جو اجماع ہوا وہ بھی ہمارے لیے حُجّت ہے۔ اجماع کے بارے میں

نظری طور پر ہم کہیں گے کہ اجماع درحقیقت ممکن ہی اُس وقت تھا' اس کے بعد تو اجماع ہو ہی نہیں سکتا' اس لیے کہ اس کے بعد اُمّت ایک وحدت نہیں رہی اور منقسم ہو گئی۔ اُس وقت اُمّت نہ صرف فرقہ بندی سے پاک تھی بلکہ اُمّت کے اندر کوئی سیاسی تقسیم بھی نہیں تھی' یعنی ہر اعتبار سے وحدتِ اُمّت تھی۔ اس بنا پر فقہاء کرام نے خلفاءِ راشدین رضی اللہ عنہم کے اجتہادات کو اجماع کا درجہ دے کر ہمیشہ کے لیے واجبِ التزام قرار دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

((فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ' عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ))(۳)

''پس تم میری سُنّت اور میرے ہدایت یافتہ خلفاءِ راشدین کی سُنّت کو لازم پکڑو' اسے مضبوطی کے ساتھ دانتوں سے پکڑے رکھو!''

یہ معاملہ اب کسی اسلامی حکومت کا نہیں ہو سکتا۔ نظری طور پر ایک امکان ہے کہ جب وہ آخری دور آئے گا' اُس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا اور پوری دنیا میں اسلام کا غلبہ ہوگا' اُس وقت یقیناً پورے کُرّۂ ارضی پر ایک ہی اسلامی ریاست اور ایک ہی حکومت ہوگی۔ نظری طور پر اگر اس نوعیت کا اجتہاد اور اجماع ممکن ہے تو وہ اُسی وقت ممکن ہے' ورنہ یہ اجماع اپنی کامل ترین صورت میں صرف دورِ خلافتِ راشدہ میں ہوا ہے۔

(د) قبائلی معاشرہ اور تمدنی ارتقاء: دورِ خلافتِ راشدہ کے ان مثبت خصائص کے ساتھ ساتھ اس امرِ واقعی کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ اُس وقت کا معاشرہ تمدنی ارتقاء کی اوّلین سطح پر تھا' یعنی خالص قبائلی بنیادوں پر قائم تھا' اور نظامِ مشاورت بھی لامحالہ اسی کی اساس پر استوار تھا کہ قبیلے کے سردار بیٹھ گئے اور فیصلہ ہو گیا۔ اُس دور میں اگر ہر ایک سے رائے لی جاتی تو یہ ایک بے مقصد کام ہوتا اور اسے پاگل پن سمجھا جاتا۔ اس لیے کہ اُس وقت نوعِ انسانی کا سیاسی شعور مجموعی طور پر اس سطح تک نہیں پہنچا تھا' اور نہ صرف اُس

---

(۳) سنن الترمذی' کتاب العلم' باب ما جاء فی الاخذ بالسنة واجتناب البدع۔ سنن ابی داؤد' کتاب السنة' باب فی لزوم السنة۔

وقت بلکہ بعد میں بھی طویل عرصے تک ''ریاست'' اور ''حکومت'' کے مابین کسی فرق و تفاوت کا فہم وشعور نوعِ انسانی کو حاصل نہ تھا۔ اب ظاہر بات ہے کہ تمدنی ارتقاء کا عمل بہت آگے جا چکا ہے۔

یہ دورِ خلافتِ راشدہ کے چار خصائص ہیں جن کا اعادہ اب نہیں ہوسکتا' لہٰذا مَیں اپنی رائے کے اندر تھوڑی سی لفظی ترمیم کر رہا ہوں کہ خلافتِ راشدہ تو قائم ہوسکتی ہے لیکن وہ خلافتِ راشدہ جو خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ تھی اور درج بالا خصائص پر مبنی تھی' وہ اب دوبارہ قائم نہیں ہوسکتی اور جو خصوصی حیثیت اس کو حاصل تھی وہ اب کسی حکومت کو حاصل نہیں ہوسکتی۔

''تھیوڈیموکریسی'' اسلامی نظامِ سیاست کی جامع اصطلاح

اسلامی نظامِ سیاست کے حوالے سے چوتھی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں علمِ سیاست میں حکومتوں یا ریاستوں کے لیے کچھ عنوانات معیّن ہیں' مثلاً ملوکیت (monarchy)' الٰہی حکومت (theocracy)' جمہوریت (democracy)۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ کی حاکمیت ہے تو اب سیاست کا ایک رشتہ مذہب کے ساتھ قائم ہوگیا۔ اسلام سے پہلے دنیا میں مذہب اور سیاست کے باہمی اشتراک کے لیے معروف عنوان ''پاپائیت'' یا ''الٰہی حکومت'' (theocracy) تھا۔ اس نظامِ سیاست میں ایک مخصوص مذہبی طبقہ خدا کے نام سے خود اپنے بنائے ہوئے قانون نافذ کرتا اور عملاً اپنی خدائی عوام پر مسلّط کر دیتا تھا۔ یہ تھیاکریسی آج کے دور کی گالی ہے۔ قائداعظم نے بھی بار بار تھیاکریسی کی بجا طور پر شدید مذمّت اور نفی کی۔ اس لیے کہ اسلام نہ منارکی ہے نہ تھیاکریسی ہے۔ اسلام ڈیموکریسی بھی نہیں' اس لیے کہ ڈیموکریسی اصلاً اجتماعی حاکمیت (popular sovereignty) کی بنیاد پر قائم ہے اور اجتماعی حاکمیت بھی کفر وشرک ہے۔

اس حوالے سے مَیں واقعتاً مولانا مودودیؒ کی ذہانت و فطانت کو خراجِ تحسین پیش کر رہا ہوں کہ انہوں نے اسلام اور سیاست کے باہمی اشتراک کے لیے ''الٰہی جمہوری حکومت'' (Theo-democracy) کی بہترین اصطلاح وضع کی ہے۔ اس اصطلاح

میں مذہب اور سیاست دونوں کے عناصر (elements) مل گئے ہیں۔ یعنی تھیا کریسی اور ڈیموکریسی دونوں کو جمع کرلیا جائے تو یہ Theo-democracy ہے، جس میں اجتماعی حاکمیت (popular sovereignty) کے بجائے خلافتِ عامہ (popular vicegerency) کا تصوّر ہے۔ یعنی خلافت بھی فرد کی نہیں رہی بلکہ عمومی ہوگئی ہے۔

''تھیوڈیموکریسی'' کی اصطلاح میں جو ''تھیو'' اور ''ڈیمو'' کے دو عناصر ہیں، ان کی آپس میں نسبت کیا ہے؟ یہ بھی ایک غور طلب مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کی وضاحت کے لیے مَیں نے منارکی اور تھیاکریسی کی اصطلاحات استعمال کیں۔ تھیاکریسی میں ایک مذہبی طبقے کی اجارہ داری ہوتی ہے اور وہ اپنی خواہشاتِ نفس کے مطابق قوانین بناتے ہیں۔ اسلام نے اس رویّہ کو شرک قرار دیا ہے۔ قرآن مجید نے یہود و نصاریٰ کے طرزِ عمل کا ذکر بایں الفاظ کیا ہے: ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (التوبۃ:۳۱) ''انہوں نے اپنے علماء، صوفیاء اور راہبوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا ہے''۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ جو عیسائیت چھوڑ کر اسلام لے آئے تھے، انہوں نے ایک دفعہ بہت ہمت کی اور اس آیت کے بارے میں دبے دبے انداز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرلیا کہ مَیں عیسائی رہا ہوں، لیکن ہم نے تو کبھی اپنے علماء، صوفیاء یا راہبوں کو خدا نہیں سمجھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا ایسا نہیں ہے کہ وہ راہب جس چیز کو حلال کہتے تم اسے حلال مان لیتے تھے اور جس چیز کو وہ حرام کہتے تھے تم اسے حرام مان لیتے تھے؟ یہ حلت و حرمت کا اختیار ہی خدائی اختیار ہے۔

عیسائیت تھیاکریسی کی راہ پر کیسے چل نکلی؟

حضرت مسیح علیہ السلام کوئی نئی شریعت نہیں لائے تھے۔ وہ شریعتِ موسوی ہی کے مجدّد تھے، یعنی ان کے کام کی نوعیت شریعتِ موسوی کی تجدید اور دینِ موسوی کی روح کو دوبارہ زندہ کرنا تھا، لیکن قانون کی حد تک وہی شریعتِ موسوی تھی۔ انجیل متی (Matthew) میں آپؑ کے یہ الفاظ آج بھی موجود ہیں:

"Don't think I have come to destroy Law."

یعنی یہ مت سمجھو کہ مَیں شریعت اور قانون کو ختم کرنے آیا ہوں' بلکہ قانون اور شریعت یہی لاگو رہے گی' اس کا ایک حرف نہیں بدلے گا۔ اب یہ بات کہہ کر حضرت مسیح علیہ السلام چلے گئے' لیکن سینٹ پال نے بیک جنبشِ قلم اس شریعت کو ساقط کر دیا تو خلا پیدا ہو گیا۔ اب یہ خلا کیسے پُر ہوگا؟ کون بتائے گا حلال کیا ہے' حرام کیا ہے' جائز کیا ہے' ناجائز کیا ہے؟ یہ سارا اختیار پوپ اور اس کے نائبین تک پہنچ گیا۔ اب ان کی مرضی اور ان کا اختیار ہے' جو چاہیں کریں۔ جیسے بادشاہ آرڈیننس نافذ کرتا ہے ایسے ہی پوپ کو آرڈیننس نافذ کرنے کا اختیار ہے۔ پوپ کو اختیار ہے' چاہے تو وہ یہودیوں کو حضرت مسیح علیہ السلام کا قاتل اور پھانسی چڑھانے والا شمار کرے اور چاہے تو انہیں ہر الزام سے بَری کر دے۔ کُل کا کُل اختیار اس کے ہاتھ میں ہے۔ یہی خدائی اختیار ہے اور اس کا دعویٰ شرک و کفر ہے۔

تھیوڈیموکریسی میں آزادی اور پابندی کا حسین امتزاج

Theo-democracy میں ''theo'' مذہبی عنصر اور ''demo'' سیاسی عنصر ہے۔ اب یہ دونوں عناصر کس تناسب سے آپس میں مربوط ہیں' یہ غور طلب مسئلہ ہے۔ قربان جایئے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر۔ آپؐ کا فرضِ منصبی تھا کہ لوگوں کو بات سمجھائیں۔ قرآن نے اس کے بارے میں فرمایا: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (النحل:۴۴) ''ہم نے آپؐ پر یہ ذکر نازل کیا ہے تاکہ آپؐ لوگوں کے لیے کھول کر بیان کریں جو ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے''۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذمے اس کی تبیین ہے' آپ اسے واضح کریں' اس کے مضمرات اور implications کو کھول کر بیان کریں۔

مذہب اور سیاست کا آپس میں تناسب کیا ہے' اس کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس قدر خوبصورت تشبیہہ دی ہے کہ مَیں سمجھتا ہوں کہ اس سے بہتر کوئی تشبیہہ ممکن ہی نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((مَثَلُ الْمُؤْمِنِ كَمَثَلِ الْفَرَسِ عَلٰى آخِيَتِهٖ يَجُوْلُ ثُمَّ يَرْجِعُ اِلٰى آخِيَتِهٖ))(۴)

(۴) مسند احمد' ح ۱۰۹۰۷' راوی : ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ۔

''مؤمن کی مثال اس گھوڑے کی سی ہے جو اپنے کھونٹے سے بندھا ہوا ہے' گھوم پھر کر اپنے کھونٹے کی طرف لوٹ آتا ہے۔''

فرض کیجیے آپ کے پاس ایک کُھلا میدان ہے' آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا گھوڑا اس میں چلے پھرے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ اسے باندھ کر بھی رکھنا چاہتے ہیں۔ تو آپ اسے سوگز کی رسّی کے ذریعے کھونٹے سے باندھ دیں۔ اس طرح سوگز نصف قطر کا ایک دائرہ وجود میں آ گیا' اس میں وہ گھوڑا آزاد ہے' جہاں چاہے جائے' شمال میں' جنوب میں' مشرق میں' مغرب میں' لیکن اس کی آزادی کی حد سوگز ہے اور وہ اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ یہ ہے پابندی اور اختیار کا حسین امتزاج یعنی آزادی بھی ہے اور پابندی بھی۔ (۵)

اس بات کو مَیں قرآن مجید کی دو آیات کے حوالے سے آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں' بظاہر ان آیات میں ایک تضاد نظر آتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ﴾ (آیت ۱۵۴) ''یہ کہتے ہیں کہ ہمارا بھی اختیار میں کوئی حصّہ ہے یا نہیں؟'' اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کو زک پہنچی اور ستّر صحابہ شہید ہو گئے۔ غزوۂ اُحد کے بارے میں جو پہلی مشاورت ہوئی تھی اس میں عبداللہ بن اُبی کا مشورہ یہ تھا کہ ہم کھلے میدان میں جنگ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں' اس لیے ہمیں مدینہ کے اندر رہ کر مقابلہ کرنا چاہیے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتی رائے بھی یہی تھی۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے رجحانِ غالب کو مدِنظر رکھا۔ خاص طور پر وہ لوگ جو بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے یا بعد میں ایمان لائے تھے اور جن میں ذوقِ شہادت' جوشِ شہادت حد سے زیادہ موجود تھا ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

---

(۵) گویا بقولِ اقبال ؎

ھنوز باغ میں آزاد بھی ہے پابگل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصلِ آزادی کو تُو کر لے!

ان صحابہؓ نے کہا کہ ہم بزدلی کیوں دکھائیں کہ اپنی گلیوں اور اپنے گھروں کے اندر محصور ہو کر مدافعت کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رجحانِ غالب کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کر لیا کہ مدینہ سے باہر جا کر جنگ ہو گی۔ اب جنگ کے دوران صحابہؓ میں سے بعض سے غلطی ہوئی' اطاعتِ نظم میں کوتاہی ہوئی تو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا' ورنہ اللہ نے تو فتح دے دی تھی:

﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ﴾ (آل عمران:۱۵۳)

''اور اللہ نے تو تم سے (تائید و نصرت کا) جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا جبکہ تم ان کو تہِ تیغ کر رہے تھے اللہ کے حکم سے' یہاں تک کہ تم ڈھیلے پڑ گئے اور امر میں تم نے جھگڑا کیا اور تم نے نافرمانی کی اس کے بعد کہ اللہ نے تمہیں وہ چیز دکھا دی جو تمہیں محبوب ہے۔''

جب ستّر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے اور جزوی طور پر مسلمانوں کو اس غزوہ میں نقصان ہوا تو اب چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ کچھ لوگوں نے کہا ہمارا بھی اختیار ہونا چاہیے' ہمارے ہاتھ میں بھی کوئی فیصلہ ہونا چاہیے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ کیا آمریت دکھائی ہے کہ جو چاہا فیصلہ کر دیا۔ یہ نظام اس طرح نہیں چلے گا' اس طرح تو روز روز حادثے ہوں گے' ستّر ستّر شہید ہوں گے' اس لیے ہمارا بھی اختیار ہونا چاہیے۔ اس کا جواب دیا گیا: ﴿قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ﴾ ''(اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہہ دیجیے! امر تو کُل کا کُل اللہ کے ہاتھ میں ہے۔'' یعنی تمہارا کوئی اختیار نہیں!

اس حوالے سے دوسری آیت سورۃ الشوریٰ کی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۸﴾﴾ (الشوریٰ)

''اور جنہوں نے حکم مانا اپنے رب کا اور قائم کیا نماز کو' اور کام کرتے ہیں آپس کے مشورے سے' اور جو رزق ہم نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

یہاں ﴿اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪﴾ اتنا اہم اور اتنا مرکزی نکتہ ہے کہ اسے صلوٰۃ اور

زکوٰۃ کے درمیان لایا گیا ہے' حالانکہ قرآن مجید کے بے شمار مقامات پر یہ دو اصطلاحات اکٹھی آئی ہیں: ﴿وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ﴾۔ یہاں ﴿اَمۡرُھُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَھُمۡ﴾ کی اہمیت واضح کرنے کے لیے ان دو کو پھاڑا گیا ہے' جیسے گٹھلی پھٹتی ہے اور درمیان سے دو پتیاں نکلتی ہیں' اور اس شان سے بات آئی ہے کہ ''ان کا معاملہ ان کے مابین باہمی مشورے سے ہوتا ہے۔''

اب بظاہر ان دو آیات میں تضاد ہے کہ سورۂ آلِ عمران کی آیت اختیار کی مطلقاً نفی کرتی ہے' جبکہ اس آیت میں اثبات ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں کو ہم آہنگ (reconcile) کیجیے کہ حقیقتاً' اصولاً' کلیتاً اختیار اللہ کا ہے' لیکن اللہ نے کچھ اختیار تمہارے حوالے بھی کر دیا ہے۔ جہاں اُس کا صریح حکم آ گیا وہاں تو آپ کا اختیار بالکل ساقط ہو گیا' وہاں صد فی صد لوگ بھی اسے بدلنا چاہیں گے تو اللہ کے کسی حکم کو نہیں بدل سکتے' لیکن جہاں اُس کا حکم نہیں ہے وہاں تمہارا اختیار ہے' وہاں ﴿اَمۡرُھُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَھُمۡ﴾ کا حکم کارفرما ہے۔ مثلاً تمام حدود امر اللہ ہیں' جن میں کوئی ردّ و بدل ممکن نہیں۔ حضور ﷺ نے ایک بڑی پیاری حدیث میں اس کی بھی تشبیہ دی ہے:

((اَلَا وَاِنَّ لِکُلِّ مَلِکٍ حِمًی اَلَا وَاِنَّ حِمَی اللّٰہِ مَحَارِمُہٗ)) (۶)

''آگاہ ہو جاؤ' ہر بادشاہ کی ایک محفوظ چراگاہ ہوتی ہے (جس میں کسی اور کو اپنے جانور چرانے کی اجازت نہیں ہے) جان لو اللہ کی بھی ایک محفوظ چراگاہ ہے اور وہ اُس کے محارم ہیں۔''

یعنی وہ چیزیں جو اُس نے حرام کر دیں ان کے قریب بھی مت پھٹکنا۔ اگر کوئی چرواہا اپنی بکریاں کسی بادشاہ کی چراگاہ کے آخری حد تک قریب لے جائے گا تو امکان ہے کہ کوئی بکری چھلانگ لگا کر اندر داخل ہو جائے گی اور وہ چرواہا گردن زدنی ہو جائے گا۔ چنانچہ اللہ کی جو چراگاہ ہے اس کے بھی قریب مت جاؤ' ذرا فاصلے پر رہو (keep at a safe distance)۔

---

(۶) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب فضل من استبرأ لدینہ۔ وصحیح مسلم' کتاب المساقاۃ' باب اخذ الحلال وترک الشبہات۔

اسی طرح ''امرُ اللّٰہِ'' میں احکامِ شریعت اور اوامر و نواہی ہیں جن کے بارے میں مَیں نے عرض کیا تھا کہ اصل اہمیت ان ہی کو حاصل ہے' البتہ مباحات کے دائرے کے اندر اندر ''اَمْرُھُمْ'' ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے کوئی حکم نہیں دیا' جہاں شریعت کا کوئی حکم ثابت نہیں ہے' وہاں اللہ ہی کا دیا ہوا حکم ﴿اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ﴾ ہے' یعنی اس میں وہ اپنے باہمی مشورے سے معاملہ طے کریں گے۔ یہ ہے تھیوڈیموکریسی۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے احکام' اِس کا مذہبی عنصر ہے کہ اس کا انسانوں کی کثرت و قلت پر' تعداد پر' رائے دہی پر کوئی دارومدار نہیں۔ باقی جہاں اللہ نے آزاد کیا ہے وہ سیاسی عنصر ہے کہ وہاں تم اپنے باہمی مشورے سے معاملات طے کرو۔ اسی کی نہایت خوبصورت تعبیر سورۃ الحجرات کی پہلی آیت ہے: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ﴾ ''اے اہلِ ایمان! اللہ اور اُس کے رسول سے آگے مت بڑھو''۔ یہاں تک تمہارے لیے اختیار ہے' اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اگر اللہ اور اس کے رسولؐ سے تجاوز کرو گے تو قرآن کی رو سے ظالم بن جاؤ گے: ﴿وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾﴾ (البقرۃ) ''اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا پس وہی تو ظالم ہیں''۔ یعنی پھر حقیقتاً اسلام ختم ہو گیا' صرف نام کا اسلام رہ گیا۔ یہ ہے معاملہ اسلام میں مذہب اور سیاست کے تناسب کا۔

تھیوڈیموکریسی کی عملی شکل

اسلام کے سیاسی نظام سے متعلق پانچویں بحث یہ ہے کہ اس کی عملی شکل کیا ہو گی' اس اصول کو ہم عملی زندگی میں کیسے نافذ کریں گے؟ میرے نزدیک آج تک انسان نے اپنے تمدنی ارتقاء کے نتیجے میں جتنے بھی اعلیٰ جمہوری معیارات (highest democratic norms) دریافت کیے ہیں ان تمام کو ﴿اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ﴾ کے اندر نافذ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے دائرہ میں رہتے ہوئے انسان کو پورا اختیار ہے کہ کوئی بھی ہیئت بنائے' چاہے صدارتی نظام بنائے یا پارلیمانی نظام' چاہے سنگل ہاؤس بنائے' چاہے دو ہاؤس یا تین ہاؤس بنائے' چاہے وحدانی نظام بنائے' اس کا دارومدار حالات پر ہے۔ اگر

ایسا ملک ہے جس میں ایک وحدانی حکومت چل سکتی ہے تو سب سے اچھی بات ہے' لیکن اگر ملک ایسا ہے جس میں وحدانی نہیں وفاقی طرزِ حکومت چل سکتی ہے تو وفاقی طرز کی حکومت بنائی جائے۔ ان میں سے نہ تو کسی طرزِ حکومت کو حرام قرار دیا گیا ہے اور نہ کسی کا حکم دیا گیا ہے۔ الغرض جتنے بھی اعلیٰ جمہوری معیارات اور اقدار جہاں تک ہم اب پہنچے ہیں اور جہاں تک نوعِ انسانی تمدنی ارتقاء کے نتیجے میں پہنچے گی' ان سب کا ﴿اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ﴾ کے دائرے میں بتمام وکمال نفاذ ہوسکتا ہے اور ان کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے' اس لیے کہ اس کا تعلق سیاسی عنصر (demo) سے ہے۔ اب یہ آپ کی سوچ پر منحصر ہے کہ آپ پارلیمانی اور صدارتی نظام سے بھی بہتر کوئی نظام لے آئیں۔ اس میں شریعت کہیں کوئی پابندی نہیں لگاتی' کہیں آپ کے اوپر کوئی قدغن نہیں ہے۔

قرآن حکیم میں سیاسی نظام کے حوالے سے صرف دو ہی اصول دیے گئے ہیں: (i) حاکمیت باری تعالیٰ' اور (ii) ﴿اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ﴾۔ ان دو کے تقاضے پورے کرنے آپ پر لازم ہیں۔ انہیں کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جائے گا' پسِ پشت نہیں ڈالا جائے گا۔ سورۃ الحجرات کی آیت میں پہلا اصول بیان کر دیا گیا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُقَدِّمُوۡا بَيۡنَ يَدَىِ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ۝۱﴾ (الحجرات)

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے آگے نہ بڑھو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ بے شک اللہ سننے والا' جاننے والا ہے۔''

لیکن اس کی تفصیلی اور عملی شکل سورۃ النساء کی آیت ۵۹ میں بیان فرمائی گئی:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ ۚ فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِىۡ شَىۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِيۡلًا ۝۵۹﴾

''اے اہلِ ایمان! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اور اپنے میں سے اولوالامر کی بھی۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں اختلافِ رائے ہو جائے تو اسے لوٹا دو اللہ اور رسول کی طرف اگر تم واقعتاً اللہ پر اور یومِ آخر

پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی طریقہ بہتر بھی ہے اور نتائج کے اعتبار سے بھی مفید۔''

اس آیت میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ﴾ ''اے اہلِ ایمان! اطاعت کرو اللہ کی''۔ کیونکہ مطاعِ مطلق وہی ہے' مطاعِ حقیقی وہی ہے' sovereign وہی ہے' حاکم حقیقی وہی ہے۔ ع ''سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے''۔ ساتھ ہی فرمایا: ﴿وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ ''اور رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو''۔ اس لیے کہ رسول کی اطاعت بھی درحقیقت اللہ کی اطاعت ہے: ﴿مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾ (النساء: ۸۰) ''جس نے رسول کی اطاعت کی پس اُس نے اللہ کی اطاعت کی''۔ اللہ کے نمائندے کی حیثیت سے رسولؐ مطاع ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ﴾ (النساء: ۶۴) ''ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اس لیے کہ اُس کی اطاعت کی جائے اللہ کے حکم سے''۔ یعنی رسول کی اطاعت کی جائے اللہ کے نمائندے کی حیثیت سے۔ اب اللہ اور رسولؐ دونوں کی اطاعتیں مستقل اور دائمی ہیں' یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کے ساتھ ''اَطِیْعُوا'' کا لفظ لایا گیا۔ آگے فرمایا: ﴿وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ﴾ ''اور اپنے میں سے اولوالامر کی بھی (اطاعت کرو)۔''

یہاں بہت عجیب اسلوب ہے کہ تین ہستیوں کی اطاعت کا حکم ہے: اللہ کی' رسول کی اور اولوالامر کی' لیکن پہلے دو کے لیے ''اَطِیْعُوا'' کا لفظ آیا ہے جبکہ تیسرے کے لیے نہیں ہے۔ یہاں دو اسلوب ہو سکتے تھے: (i) اَطِیْعُوا ایک مرتبہ آجاتا اور اس کا اطلاق سب پر ہو جاتا: ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ'' (ii) یا پھر تینوں کے ساتھ ''اَطِیْعُوا'' مذکور ہوتا: ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاَطِیْعُوا اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ'' لیکن قرآن نے ایک تیسرا اسلوب اختیار کیا کہ ''اَطِیْعُوْا'' دو کے ساتھ ہے' تیسرے کے ساتھ نہیں۔ اس اسلوب سے ان تین ہستیوں کی اطاعت کا مرتبہ (status) متعیّن ہو جاتا ہے۔ اللہ اور رسولؐ کے ساتھ ''اَطِیْعُوا'' مذکور ہے' اس لیے ان کی اطاعت مستقل' غیر مشروط و غیر محدود ہے اور ہمیشہ

ہو گی' یہ نہیں کہ کسی معاملے میں اطاعت ہو کسی میں نہیں' جبکہ اولو الامر کے ساتھ ''اَطِیْعُوا'' کا لفظ مذکور نہیں ہے' اس لیے اُس کی اطاعت مستقل بالذّات نہیں ہے بلکہ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے ساتھ مشروط ہے۔

یہاں ایک بات نوٹ کر لیجیے کہ پورے قرآن مجید میں اور میرے علم کی حد تک احادیث کے ذخیرہ میں بھی کہیں اولوالامر کے انتخاب کا کوئی طریقہ (process) معیّن نہیں کیا گیا۔ حضور ﷺ نے بھی کسی کو نامزد کرنے کی کوئی وصیت نہیں فرمائی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نامزد کیا' صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا گیا' پھر اس کا اعلان ہو گیا اور مسلمانوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چھ افراد کا بورڈ بنا دیا۔ اس بورڈ کے باہمی فیصلے سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے والیٔ امر بننے کا معاملہ طے ہوا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اولوالامر کے انتخاب کے معاملے میں ہمیں کوئی ایک معیّن راستہ نہیں ملتا۔ اس لیے اس کا انتخاب بھی ''اَمْرُھُمْ'' میں شامل ہے۔ اس معاملے میں باہمی مشورے سے جو بھی طے ہو جائے اس سے ﴿اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ﴾ کا تقاضا پورا ہو جائے گا۔ اگر بنیادی طور پر قبائلی نظام ہے تو اس کے مطابق یہ معاملہ طے کر لیں اور اگر جمہوری نظام ہے تو اس کے مطابق اولوالامر کا انتخاب کر لیں۔ اس معاملے کو ''لوہے کا جوتا'' نہیں پہنایا گیا بلکہ باہمی مشاورت پر آزاد چھوڑا گیا ہے۔ اگر اس معاملے میں کوئی معیّن صورت دے دی جاتی تو پھر تمدنی ارتقاء کے عمل سے جو نیا طریقہ وجود میں آتا' وہ اس میں سمویا نہ جا سکتا اور اسے اس کے اندر accommodate نہ کیا جا سکتا۔ لہٰذا قرآن میں اولوالامر کا ذکر تو کیا گیا ہے' لیکن اولوالامر کہاں سے آئے گا' اس کا انتخاب کیسے ہو گا' اس کا ذکر موجود نہیں۔ جب تک نبوت کا سلسلہ جاری تھا' ہر نبی اپنے دور کا اولوالامر ہوتا تھا' لیکن جب نبوت ختم ہو گئی' تو اب اولوالامر کہاں سے آئے گا' اس کو قرآن نے آزاد چھوڑا ہے۔ یہ آپ کی مرضی ہے کہ آپ اس کے لیے کیا نظام بناتے ہیں۔ آپ ہر بالغ کو ووٹ کا حق دیتے ہیں یا ووٹر کے لیے کچھ صفات معیّن کرتے ہیں۔

آپ کے بنائے ہوئے کسی بھی نظام سے اولوالامر منتخب ہو گیا' اس کے بعد بھی اس

کی اطاعت مطلق نہیں ہے۔ ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ﴾ ''پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں اختلافِ رائے ہو جائے''۔ یہ آپس کے اختلافات کی بات نہیں ہے' بلکہ آپ کا کسی معاملے میں اولو الامر سے کوئی اختلاف ہو جائے۔ مثلاً وہ کسی چیز کے بارے میں کہے کہ یہ اسلام کے مطابق ہے اور آپ کے نزدیک وہ اسلام کے خلاف ہو' تو ایسی صورت میں کہاں جائیں؟ فرمایا: ﴿فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾ ''تو اسے لوٹا دو اللہ اور رسول کی طرف''۔ اس لیے کہ مستقل اطاعتیں وہی ہیں۔ ﴿اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ﴾ ''اگر تم حقیقتاً اللہ پر اور یومِ آخر پر ایمان رکھتے ہو''۔ ﴿ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝۵۹﴾ ''یہی طریقہ بہتر بھی ہے اور نتیجے کے اعتبار سے بہت مفید ہے۔''

اسلامی نظامِ سیاست میں عدلیہ کی اہمیت

پاکستان میں دستور ساز اسمبلی کا جو ابتدائی عمل شروع ہوا تھا اس میں بڑی ردّوقدح اور بڑی محنت کے بعد قراردادِ مقاصد منظور ہوئی۔ جماعت اسلامی نے مطالبے کی زبردست تحریک چلائی اور بوریاں بھر بھر کے ٹیلی گرام' خطوط اور محضر نامے بھیجے جو دستور ساز اسمبلی کے میزوں پر نظر آنے لگے۔ اِدھر اندر اللہ کے فضل و کرم سے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مسلم لیگ کی تحریک کے مخلصین جو اسلام کے ساتھ ایک مخلصانہ ربط و تعلق رکھتے تھے' ان کی بھرپور جِدّوجُہد کے نتیجے میں قراردادِ مقاصد پاس ہو گئی۔ اس کے بعد علماء بورڈ بنا دیا گیا۔ اب یہاں دو چیزیں ٹکرا رہی ہیں۔ ایک طرف آپ کی پارلیمنٹ ہے اور دوسری طرف علماء بورڈ۔ اب قانون سازی کا اختیار کس کو ہے؟ اس میں بڑی پیچیدگیاں تھیں۔ اول تو یہ کہ علماء کون ہوں گے؟ کس مدرسے کے فارغ التحصیل ہوں' کس درجے کی ان کے پاس سند ہو' کس فرقے سے ان کا تعلق ہو؟ پھر اس کے بعد یہ سوال آئے گا کہ آیا علماء بورڈ کا فیصلہ فائنل ہو گا یا نہیں؟ اگر فائنل ہو گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پارلیمنٹ کے اوپر ایک اور پارلیمنٹ آ گئی ہے اور یہ یقیناً تھیاکریسی کی ایک صورت بن گئی کہ حاکمیت علماء کے ایک طبقے کے پاس آ گئی' جس طرح ایران کا نظامِ حکومت ہے۔ یہ وہ عقدۂ لاینحل ہے

کہ ہمارے ہاں کے سیاسی سمجھ بوجھ رکھنے والے اور دستوری مسائل پر سوچنے والے اس کا حل تلاش کرنے میں بے بس نظر آتے ہیں۔

اس کا حل سمجھ لیجیے! یہاں بھی تمدنی ارتقاء کے حوالے سے مَیں عرض کر رہا ہوں کہ آج ہم یہ جانتے ہیں کہ ریاست کے تین اعضاء (organs) ہیں: (i) مقنّنہ (Legislature)' (ii) انتظامیہ (Executive) اور (iii) عدلیہ (Judiciary)۔ ریاست کی بنیاد ہوتی ہے دستور (Constitution) پر اور دستور کی حفاظت کرنے والی (custodian) عدلیہ یعنی اعلیٰ عدالتیں ہیں۔

میرے نزدیک ہمارے دستور کی صرف ایک دفعہ' جو پاکستان کے دستوری خاکے میں ہمیشہ ''رہنما اصول'' (directive principle) کی حیثیت سے موجود رہی ہے:

"No legislation will be done repugnant to the Quran and Sunnah"

''یہاں کوئی قانون سازی قرآن وسُنّت کے منافی نہیں کی جاسکتی!''

اگر آپ اس ''رہنما اصول'' کو جوں کا توں نافذ العمل شق (operative clause) کا درجہ دے دیں تو میرے نزدیک اس دور میں اسلامی ریاست کا دستوری تقاضا صد فی صد پورا ہو جاتا ہے۔ اگر پارلیمنٹ کے اندر کوئی قانون زیرِ غور ہے جس کے بارے میں آپ کو شک ہے کہ وہ اس دفعہ سے ٹکرا رہا ہے اور اس میں کوئی شے قرآن وسُنّت کے خلاف ہے تو آپ کو حق حاصل ہے کہ آپ عدالت میں جائیں اور فیصلہ کرائیں۔ اگر آپ عالمِ دین ہیں تو خود بحث کریں اور اگر آپ خود عالمِ دین نہیں ہیں تو آپ کے پاس علماء موجود ہوں گے' ان سے دلائل معلوم کریں اور عدالت میں جا کر دلائل دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ملک کی اعلیٰ عدالتوں کو یہ اختیار حاصل ہونا چاہیے کہ وہ اس کے ضمن میں نفیاً یا اثباتاً فیصلہ صادر کر سکیں' اور اگر کوئی قانون جزوی یا کُلّی طور پر اس دفعہ کی زد میں آ رہا ہو تو اسے کالعدم قرار دے سکیں۔

ضیاء الحق مرحوم سے پہلے اس دفعہ کو صرف ''رہنما اصول'' (directive principle) کے طور پر رکھا گیا۔ ضیاء الحق صاحب نے اسے partially operative کر دیا' یعنی

اسے عملی طور پر کارگر تو بنایا لیکن کچھ قدغنیں لگا کر' یعنی ایسے نیم دلانہ سے بھی کم تر انداز میں اور اتنی اگر مگر کے ساتھ کہ پورا معاملہ ایک لاحاصل مشق (exercise in futility) ہی نہیں بلکہ باقاعدہ کھیل تماشے کی صورت اختیار کر گیا۔ میرے نزدیک یہ طرزِ عمل کفر سے بھی بدتر شے ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ﴾ (البقرۃ:۸۵)

''تو کیا تم (ہماری) کتاب کے کچھ حصے کو مانتے ہو اور کچھ کو نہیں مانتے؟ تو جان لو جو لوگ یہ روش اختیار کریں گے ان کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ دنیا کی زندگی میں ذلّت و رسوائی میں مبتلا کیے جائیں اور قیامت کے دن شدید ترین عذاب میں جھونک دیے جائیں۔''

اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ آپ شریعت کی بالادستی کو ایک حد تک' ایک دائرے میں قبول کرتے ہیں۔ یہی بات تھی جس پر مَیں نے ان کی مجلسِ شوریٰ سے استعفا دیا تھا۔ مَیں نے ان سے کہا کہ آپ نے قرآن وسُنّت کی بالادستی کی عملی تنفیذ کے ضمن میں پیش رفت کے لیے جو راستہ اختیار کیا وہ اصولاً تو درست تھا' لیکن ؎

''دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے
ورنہ کہیں تقدیر تماشا نہ بنا دے!''

کے مصداق آپ نے اس پورے معاملے کو فی الواقع ''تماشا'' بنا دیا۔ آپ نے الگ سے شرعی عدالتیں بنائیں جس سے دین و دنیا اور مذہب و ریاست کی ''دوئی'' اور علیحدگی کے سیکولر تصوّر کو تقویت ملی۔ یہ معاملہ درحقیقت ہمارے پورے عدالتی نظام کے ساتھ ہونا چاہیے تھا' لیکن چلیے آپ نے فیڈرل شریعت کورٹ بنائی' پھر اس میں اپنی مرضی کے چنیدہ علماء رکھے۔ لیکن آپ نے یہ کیا کیا کہ اس عدالت کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ کمال یہ کہ عائلی قوانین کے لیے بھی ان کے ہاتھ باندھ

دیے۔ مالی قوانین کے بارے میں تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ وقت درکار ہے' کچھ مہلت چاہیے' کیونکہ پورے ڈھانچے کو آنِ واحد میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا' لیکن یہ کیا تماشا ہے کہ آپ نے عائلی قوانین کے بارے میں بھی ان کورٹس کو پابند کر دیا۔

مَیں نے مولانا تقی عثمانی صاحب سے اس بارے میں مسجد نبوی کے باہر باب جبریل پر بات کی کہ آپ کی غیرتِ دینی کو کیا ہو گیا ہے کہ آپ ایسی عدالت میں بیٹھے ہوئے ہیں جس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں' جو عائلی قوانین کے بارے میں بھی کوئی فیصلہ نہیں دے سکتی۔ مَیں نے ضیاء الحق سے کہا تھا کہ مَیں یہ تو نہیں کہتا کہ جو مَیں کہہ رہا ہوں آپ وہ کریں' مَیں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ نے جو کورٹ بنائی ہے اس کے ہاتھ کھول دیجیے۔ کم از کم عائلی قوانین پر تو انہیں فیصلہ دینے کا اختیار دیجیے۔ میرے پاس دستاویزی ثبوت موجود ہیں کہ ان عائلی قوانین کی بعض شقوں کو تمام مکاتبِ فکر کے چوٹی کے علماء نے غیر اسلامی قرار دیا تھا۔ ان علماء میں مولانا مودودی' مفتی محمد شفیع' مولانا ابوالحسنات' مولانا داؤد غزنوی اور مفتی جعفر حسین وغیرہم شامل تھے۔ مَیں نے کہا تھا کہ ان عائلی قوانین کا خالق غلام احمد پرویز بھی شریعت کورٹ میں جائے اور علماء کرام کے روبرو اپنے دلائل پیش کرے اور پھر عدالت اس پر اپنا فیصلہ سنائے۔

آج یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ دستور کی محافظ و نگران (custodian) اعلیٰ عدالتیں ہیں۔ یہ ہے ہمارا تمدنی ارتقاء جہاں تک آج انسان پہنچا ہے۔ اس میں لوگوں کی بڑی محنت لگی ہے اور بڑے تجربات کے بعد انسان یہاں تک پہنچا ہے۔ دنیا میں جس طرح سائنسی ارتقاء ہوا ہے اسی طرح معاشرتی و تمدنی ارتقاء ہوا ہے۔ اس معاملے میں ہمارا رویّہ یہ ہے کہ ہم سائنسی ترقی کے تمام ثمرات سے تو متمتّع ہو رہے ہیں لیکن معاشرتی و تمدنی ارتقاء سے ہمیں کچھ الرجی ہے۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ ان میں جو چیزیں خلافِ اسلام ہوں ان کو ہم ردّ کر دیں' لیکن جو چیزیں اسلام کے نظام میں سموئی جا سکتی ہوں ان کو اُٹھا کر پھینک دینا اسلام دشمنی ہے۔ چنانچہ آپ اعلیٰ عدالتوں کو اختیار دیجیے کہ پارلیمنٹ جو قانون پاس ہو اس کے بارے میں فیصلہ کر سکیں کہ اس میں کہیں قرآن و سُنّت سے تجاوز تو نہیں ہوا!

اس ضمن میں ایک اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے جج اس قابل نہیں ہیں۔ اس حوالے سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں ہم اصولی بات کر رہے ہیں' جبکہ اسلامی ریاست تو ایک انقلاب کے نتیجے میں قائم ہوگی۔ جب انقلاب آئے گا تو سارا معاشرہ تبدیل ہوگا' پھر یہ پوری صورتِ حال تبدیل ہو جائے گی۔ اصولاً تو یہ بحث اسلامی ریاست سے متعلق ہو رہی ہے جو ایک انقلاب کے نتیجے میں برپا ہوگی' لیکن اِس وقت بھی یہ ناممکن العمل نہیں ہے۔ اس لیے کہ آپ کے جج صاحبان بہت ذہین ہوتے ہیں اور وکلاء ان کی معاونت کرتے ہیں۔ ایک ذہین آدمی' جو پڑھا لکھا بھی ہے' اس کے لیے یہ کام مشکل نہیں ہوتا کہ دو افراد کے دلائل سن کر یہ فیصلہ کر سکے کہ کس شخص کی دلیل وزنی ہے اور آیا واقعتاً یہ چیز کتاب وسُنّت سے تجاوز کر رہی ہے یا نہیں؟ اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ علماء بورڈ نہ تو قابلِ عمل ہے اور نہ ہی ممکن ہے' اور اگر ہو بھی جائے تو پھر وہ تھیاکریسی کی شکل بن جائے گی اور اس سے اسلام کی تھیوڈیموکریسی کا حق پورا نہیں ہوگا۔

اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ

علّامہ اقبال نے اپنے لیکچرز میں یہ بات کہی ہے کہ اس دور میں اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ ہوگا۔ اس بات پر علماء کو تو فطری طور پر بڑی ناراضی ہوتی ہے اور عام مسلمان بھی چونکتا ہے کہ پارلیمنٹ میں تو انگوٹھے لگانے والے بھی ہوتے ہیں' شرابی اور زانی بھی ہوتے ہیں' تو یہ اجتہاد کریں گے! میرے نزدیک اجتہاد کے بارے میں علّامہ اقبال کی یہ رائے صد فی صد درست ہے کہ اب اجتہاد پارلیمنٹ کے ذریعے ہوگا' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اجتہاد ارکانِ اسمبلی کریں گے' بلکہ اصل مراد یہ ہے کہ اس امر کا فیصلہ پارلیمنٹ کرے گی کہ کون سا اور کس کا اجتہاد قانون کا درجہ حاصل کرے گا۔ اجتہاد تو علماء ہی کریں گے' لیکن علماء کے اجتہاد میں اختلاف ہوتا ہے' جیسے امام مالک اور امام ابوحنیفہ میں اختلاف ہوا' امام ابوحنیفہ اور امام شافعی میں اختلاف ہوا' اسی طرح امام ابوحنیفہ' قاضی ابو یوسف اور امام محمد (رحمہم اللہ) میں اختلاف ہوا۔ اب کس کا اجتہاد نافذ ہوگا' یہ فیصلہ کون کرے گا؟ جب ملوکیت تھی تو اس کا فیصلہ بادشاہ کر سکتا تھا' کیونکہ اس کے پاس اختیار تھا۔

علماء کے پاس قوّتِ اجتہاد تو تھی لیکن قوتِ نافذہ ان کے پاس نہیں تھی۔ یہی وہ کام تھا جو اُس وقت کے خلیفہ نے امام مالکؒ سے چاہا تھا کہ ہم آپ کی ''موطا'' کو یہاں کا قانون بنا دیتے ہیں۔ انہوں نے اس پیشکش کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ اجتہاد صرف میرا ہی حق نہیں ہے' بلکہ یہ تمام اصحابِ علم' اصحابِ فکر اور دین پر غور کرنے والوں کا حق ہے۔ اگر میرے اجتہاد کو قانون کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے تو اجتہاد کا دروازہ بند ہو جائے گا اور یہ مجھے گوارا نہیں۔ یہی بات تھی جس کو امام ابوحنیفہؒ نے رد کیا۔ انہیں قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں' مشقتیں برداشت کرنی پڑیں ہیں لیکن انہوں نے قاضیٔ القُضاۃ کا عہدہ قبول نہیں کیا۔ اس لیے کہ جو شخص قاضیٔ القُضاۃ بن گیا تو ریاست میں اُس کا اجتہاد نافذ ہو گا' لیکن امام صاحب نے اس سے انکار کیا اور اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا۔ ان دونوں عظیم ترین ائمہ کا یہ طرزِ عمل ہمارے لیے بہت بڑا مینارۂ نور ہے کہ انہوں نے اجتہاد کے حق کو عام رکھا ہے۔ ایسا اگر ہوا ہے تو ہمارے دورِ زوال میں ہوا ہے۔ آج سے چند سو سال قبل اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے معتمد علیہ علماء کا ایک بورڈ بنایا' جنہوں نے فتاویٰ عالمگیری مرتّب کیا اور بادشاہ نے اسے نافذ کر دیا۔

اجتہاد کے بارے میں فیصلے کا حق اب کسی فرد کو نہیں بلکہ پارلیمنٹ کو ہے۔ جیسے حاکمیت (sovereignty) نے ملوکیت سے جمہوریت تک کا سفر طے کیا ہے اور شخصی خلافت سے خلافتِ عامّہ کی صورت اختیار کی ہے' اسی طرح اجتہاد کی تنفیذ کا حق بھی اب کسی فردِ واحد یا کسی ایک طبقہ کو نہیں ہے' بلکہ یہ حق پارلیمنٹ کو ہے کہ وہ کس کے اجتہاد کو نافذ کرے' لیکن اس میں خالص فنی اور عملی معاملے کو ملک کی اعلیٰ عدالتوں کے سپرد کیا جائے گا کہ اگر کہیں نص کی خلاف ورزی ہو تو آپ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایئے! اور اگر خلاف ورزی نہیں ہے' قرآن و سُنّت سے تصادم نہیں ہے اور اس کو آپ نے دستور میں معیّن کر دیا ہے تو اب اس کی پابندی ہم پر لازم ہے۔ اس لیے کہ اس کی گنجائش نصوص کے دائرے کے اندر ''اَمْرُھُمْ'' میں موجود ہے۔ اس میں قطعاً کوئی قباحت نہیں کہ اکثریت کی رائے کو مانا جائے' اور نہ ہی اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہے' کیونکہ علماء بورڈ کا

معاملہ تھیا کریسی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں یہ ہوگا کہ پارلیمنٹ میں غور وفکر ہوگا' سوچ بچار ہوگا اور اس کے بعد اکثریت کی رائے سے کوئی قانون نافذ ہوگا۔ اس process کے دوران بھی عدالت کا دروازہ کھلا ہوا ہے کہ اگر کوئی دستور سازی کتاب و سُنّت کے منافی ہو رہی ہے تو ہم عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے اور اسی سٹیج پر اس کو روکا جا سکتا ہے۔ اگر بالفرض پارلیمنٹ سے کوئی غلط فیصلہ ہو جاتا ہے' اگر کہیں کتاب وسُنّت سے تجاوز ہو گیا ہے' ﴿لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ کی خلاف ورزی ہوئی ہے تو جا کر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جائے اور اس کے خلاف حکم امتناعی لا کر اس قانون کا نفاذ معطل کرا دیا جائے۔ اور اگر کوئی قانون نصوص کے دائرے کے اندر بنتا ہے تو پھر آپ کو کیا اعتراض ہے؟ پھر آپ اکثریت کی رائے کو چلنے دیجیے۔ یہ ہے اصل مفہوم علّامہ اقبال کے اس جملے کا کہ ''اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ ہوگا۔''

اسلامی نظامِ سیاست میں علماء کا کردار

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اجتہاد پارلیمنٹ کے ذریعے ہوگا' تو پھر علماء کیا کریں گے؟ اس پورے پراسیس میں ان کا کیا کردار ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ اسلامی ریاست کے قیام کے بعد کی بات ہے۔ اُس وقت علماء بھی الیکشن میں حصّہ لیں گے۔ علماء تو اس دور میں بھی حصّہ لے رہے ہیں۔ مثلاً مفتی محمود صاحب بھٹو صاحب کو شکست دے کر پارلیمنٹ پہنچ گئے تھے۔ مولانا شاہ احمد نورانی بھی رکن پارلیمنٹ منتخب ہو گئے تھے۔ تو یہ راستہ علماء کے لیے بند نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ علماء کے کرنے کا جو اصل کام ہے' بدقسمتی سے اس کی طرف ہم نے توجّہ نہیں کی ہے' اس کام سے ہمیں ذہول ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا اسلامی ریاست کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو رہا۔ علماء اور خادمانِ دین کا اصل کام اسلامی نظامِ سیاست میں بلاواسطہ نہیں' بالواسطہ ہے کہ ان کے وعظ ونصیحت' ان کی تعلیم وتدریس اور ان کی دعوت وتبلیغ کے ذریعے سے معاشرے کے اندر دو چیزوں کا لیول بڑھتا چلا جائے اور پھر یہ برقرار رہے۔ ان میں سے ایک جذبۂ ایمانی ہے' یہ جذبہ اجتماعی سطح (collective

level) پر پہنچ جائے' جس کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام اس جذبے سے سرشار ہوں کہ ہمیں مسلمان جینا ہے مسلمان مرنا ہے۔ یہ جذبہ اصل شے ہے اور اس جذبہ کا پیدا کرنا علماء اور خادمانِ دین کا کام ہے۔ یہ جذبہ کسی آرڈیننس کے اجراء یا cosmatic treatment سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل ہمارا معاشرہ بنیادی طور پر سیکولر معاشرہ ہے جس میں مادّی اقدار عوام کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ میرا' آپ کا اور اچھے اچھے مذہبی لوگوں کا حال بھی یہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اصل کرنے کا کام تو اس جذبۂ ایمانی کی بیداری ہے اور یہ کام علماء اور خادمانِ دین کریں گے۔ یہ کام اپنی بے نفسی اور بے غرضی کے ساتھ' اپنے آپ کو خاک میں ملا کر کرنے کا ہے۔

علماء کے کرنے کا دوسرا کام یہ ہے کہ معاشرے میں علم دین کے فہم کا بھی ایک لیول اجتماعی سطح (collective level) پر برقرار رہے تا کہ کوئی مداری دھوکہ نہ دے سکے اور اسلام کے بجائے کسی اور شے پر اسلام کا لیبل نہ لگا سکے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ عوام کے اندر اجتماعی سطح پر ایک فہم ہو' انہیں معلوم تو ہو کہ اسلام کیا ہے' کیا چیز اسلام میں جائز ہے اور کیا چیز جائز نہیں ہے۔ علم دین کا یہ فہم اور جذبۂ ایمانی کی اونچے درجے تک اجتماعی سطح پر ترویج' یہ اصل دو کام ہیں جو علماء' خادمانِ دین اور خادمانِ قرآن کے کرنے کے ہیں۔ بلکہ ہر وہ شخص جس میں درج ذیل تین شرطیں پیدا ہو جائیں اس کے ذمے معاشرے میں فہم علم دین اور جذبۂ ایمانی کی ترویج کا کام ہے: (i) اسلام پسندی (ii) اسلام کی پابندی (iii) غلبۂ اسلام کی خواہش مندی۔ ان کے ذمے یہ کام ہے کہ دعوت و تلقین' تبلیغ' تعلیم اور ذرائع ابلاغ کا بھرپور استعمال کر کے لوگوں کے اندر ایک طرف جذبۂ ایمانی کو برقرار رکھا جائے' اسے نیچے نہ گرنے دیا جائے' بلکہ اس کی سطح زیادہ سے زیادہ بڑھائی جائے اور دوسرے فہمِ دین اور علمِ دین کو لوگوں میں عام کیا جائے۔ انہیں صحیح طور پر معلوم ہو کہ دین کیا ہے اور کیا کیا چیزیں دین میں شامل ہیں۔

علماء کے کرنے کا تیسرا کام یہ ہے کہ اگر وہ کسی قانون کے بارے میں شک میں ہوں تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ ہماری شریعت کورٹ کھلی دعوت دیتی رہی ہے کہ علماءِ

دین آئیں اور یہاں پر آ کر دلائل دیں، ہماری رہنمائی کریں۔ اگر وہ وہاں یہ کام نہیں کر سکتے تو بلاواسطہ انتخابات میں حصّہ لیں اور دستور سازی میں اپنا کردار ادا کریں۔ مَیں پھر عرض کر رہا ہوں کہ علماء کا اصل کام بالواسطہ ہے کہ وہ معاشرے کے اندر جذبۂ ایمانی اور فہمِ اسلام کی مقدار کو مسلسل بڑھائیں اور اس اجتماعی ارادے (collective will) یعنی ''مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کا عزمِ مصمّم'' کو برقرار رکھیں۔ جب تک یہ عزم اور ارادہ بحیثیتِ مجموعی قوم میں بیدار نہ ہو جائے اس وقت تک یہاں اسلام نہیں آئے گا۔ مداری کھیلتے رہیں گے اور اسلام کا نعرہ عوام سے ووٹ لینے یا اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے استعمال کرتے رہیں گے۔

اسلامی ریاست میں شرطِ شہریت: اسلام

اب مَیں اپنے موضوع کی چھٹی بحث پر آ رہا ہوں۔ یہ ایک بڑا مشکل مسئلہ ہے اور لوگوں کے ذہن میں اس کے بارے میں بہت سی الجھنیں اور ابہام ہیں۔ اس مسئلہ کا تعلق اسلامی ریاست کی ''شرائطِ شہریت'' سے ہے، کیونکہ ''حقوقِ شہریت'' تو سب کو حاصل ہوں گے۔ مَیں عرض کر چکا ہوں کہ آج تک جتنے بھی اعلیٰ ترین جمہوری معیارات دریافت ہوئے ہیں وہ سب ﴿اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ کے دائرے کے اندر نافذ ہو سکتے ہیں۔ اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ آج تک انسان نے اس میدان میں جو بھی کچھ حاصل کیا وہ ؎

یا ز نورِ مصطفیٰؐ او را بہاست یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است!

کے مصداق یا تو نورِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روشن ہے یا آج کا انسان اب تک تلاشِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سرگرداں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ابھی تو انسان وہاں پہنچا ہی نہیں جہاں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہنچایا تھا۔ اسلامی نظامِ سیاست میں کوئی صدر، کوئی حکمران، کوئی خلیفہ قانون سے بالاتر نہیں ہے، جب عدالت اسے طلب کرے گی وہ عدالت میں پیش ہوگا۔ آج اعلیٰ ترین جمہوری اقدار میں بھی صدر اور حکمرانوں کے لیے استثناءات رکھے گئے ہیں۔ قانون کی بالادستی کا مطلب تو یہ ہے کہ صدرِ مملکت کو یہ اختیار نہیں ہے کہ عدالت

نے کسی کو پھانسی کی سزا دی ہو اور وہ اپنے اندازِ خسروانہ اور التفاتِ مرحمانہ کو بروئے کار لا کر اسے معاف فرما دے۔ یہ تو سراسر اسلام کے خلاف ہے' کیونکہ صدرِ مملکت کی حیثیت انتظامیہ (Executive) کی ہے اور اسلامی جمہوری ریاست میں سربراہِ ریاست کا کام انتظامی حوالے سے ہوتا ہے کہ وہ ملک و معاشرے میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی راہ ہموار کرے۔ اس کو قطعاً یہ حق حاصل نہیں کہ وہ عدلیہ سے بھی بالاتر ہو جائے اور عدالت کی دی ہوئی سزا کو معاف کر سکے۔ یہ تو مَیں نے صرف ایک مثال دی ہے کہ اسلام نے نوعِ انسانی کو جہاں پہنچایا تھا وہاں تک تو معاملہ ابھی پہنچا نہیں' نہ امریکہ میں' نہ برطانیہ میں اور نہ زمین کے کسی اور کونے میں۔

اسلامی ریاست کی شہریت کے حوالے سے یہ بات نوٹ کر لیں کہ اساسِ شہریت اور شرائط شہریت کے اعتبار سے اسلامی ریاست کا مکمل شہری صرف مسلمان ہے' یعنی جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان کا اعلان و اقرار کرے وہ اسلامی ریاست کا مکمل شہری ہے۔ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی حیثیت ثانوی اور ''محفوظ اقلیت'' (protected minority) کی ہے۔ وہ اسلامی ریاست میں مسلمانوں کے ساتھ برابر کے شہری نہیں ہیں۔ یہ بھی کڑوی گولی ہے جسے نگلنا آسان نہیں ہے۔

میرے گزشتہ خطاب کے بارے میں ایک صاحب نے کچھ احتجاج کیا تھا کہ آپ نے بھی عورت کی ثانوی حیثیت کی بات کر دی۔ اصل میں مَیں نے پاکستان ٹائمز کے ایک دریدہ دہن مراسلہ نگار کے الفاظ نقل کیے تھے جس نے کہا تھا کہ ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ قرآن نے عورت کو ثانوی حیثیت دی ہے' لہٰذا اب ہمیں کچھ ایسے اصولِ اجتہاد وضع کرنے ہوں گے جو قرآن کو بھی اوور رول کر سکیں ـــــ اب کس کے اندر ہمت اور جرأت ہے کہ وہ ایسے اصول وضع کر سکے؟ ہم تو ایسی باتیں سن کر لرز جاتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تو یہ زندقہ ہے' ارتداد ہے' کفر ہے' شرک ہے۔ مَیں نے یہ کہا تھا کہ: ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ﴾ کڑوی گولی ہے' آسانی سے حلق سے نیچے نہیں اُترتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے سہج سہج' بڑے تدریجی انداز میں' اس سارے معاملے کو نافذ کیا۔

یہاں بھی معاملہ ویسا ہی ہے کہ اسلامی ریاست کا مکمل شہری صرف مسلمان ہے' اس لیے کہ اسلامی معاشرہ عقیدے اور نظریے پر قائم ہے۔ وہ نظریہ اصولاً ایمان اور قانوناً اسلام ہے۔ غیر مسلم اس معاشرے میں مکمل شریک نہیں۔ ان کے حقوق کا احترام اور ان کی جان و مال کا تحفظ اپنی جگہ پر ہے' ان کے ساتھ خیر ہوگی' بھلائی ہوگی اور خدمتِ خلق بھی۔ پھر چوٹی کی خدمتِ خلق یہ ہوگی کہ انہیں کفر و شرک کی گندگیوں سے نکال کر اسلام کی طرف لانے کی کوشش کی جائے۔ ان کی صرف دنیا کی بھوک نہ مٹائی جائے بلکہ انہیں قیامت میں جہنم کی آگ سے بچانے کی فکر کی جائے' یہ سب سے بڑی خدمتِ خلق ہے۔

اسلامی ریاست نظریاتی ریاست ہے' اس لیے اس کی بنیاد علاقے (territory) پر نہیں ہے کہ جو بھی اس میں آ گیا' چاہے پارسی' عیسائی' ہندو ہو یا مسلمان' وہ اس ریاست کا ''برابر'' کا شہری ہے۔ اگر برابری کا حق تسلیم کیا جائے تو پھر یہ قومی ریاست (Nation State) بن جائے گی اور یہ ریاست کا وطنی تصوّر ہے جو دنیا کی سب سے بڑی تمدنی لعنت ہے۔ اسلام کی رو سے یہ کفر اور شرک ہے' لہٰذا اقبال نے اسے بہت بڑا بُت قرار دیا ہے ؎

یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے!

چنانچہ اسلامی ریاست میں مکمل شہری صرف مسلمان ہے اور غیر مسلم کی حیثیت ثانوی ہے۔ البتہ یہاں غیر مسلموں کے حقوق' جان و مال' عزّت و آبرو اور ان کے عقیدے کو پورا پورا تحفظ دیا جائے گا۔ عقیدہ و عبادات اور عائلی قوانین سمیت پورے پرسنل لاء کے ضمن میں غیر مسلموں کو مکمل آزادی ہوگی' لیکن اسلامی ریاست میں اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب کی تبلیغ نہیں ہو سکتی۔ یہ کڑوی گولی ہے جسے بہرحال نگلنا ہوگا۔ اسلام پر آنے کے لیے اسلام کے مقصد (objective) کو سمجھنا ہوگا اور پھر یہ تمام چیزیں خود بخود ٹھیک ہوتی جائیں گی۔ یہ ایک مربوط حیاتیاتی اکائی (organic whole) اور ''منطقی کُل'' ہے جس کے اجزاء علیحدہ نہیں کیے جا سکتے۔

اسلامی ریاست ومعاشرہ کے اصول: سورۃ الحجرات کی روشنی میں

سورۃ الحجرات انتہائی جامع سورت ہے' یہ مسلمانوں کے ملّی اور سیاسی زندگی کے راہنما اصولوں پر مشتمل ہے۔ پہلا اصل الاصول دستوری اور قانونی ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ...﴾ (آیت ۱)

''اے ایمان والو! اللہ اور اُس کے رسولؐ سے آگے نہ بڑھو.....''

دوسری آیت میں آنحضور ﷺ کے ادب' محبّت اور تعظیم وتکریم کا ذکر ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ ...﴾ (آیت ۲)

''اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی (ﷺ) کی آواز سے بلند نہ کرو.....''

ریاست میں افواہوں کی روک تھام کے لیے فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا ...﴾ (آیت ۶)

''اے ایمان والو! جب تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تصدیق کرلیا کرو.....''

اگر مسلمانوں میں کسی قسم کا اختلاف ہوجائے تو ''Nip the evil in the bud'' کے مصداق ان میں فوری صلح کرادو:

﴿وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا ۚ﴾ (آیت ۹)

''اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کی صلح کرادو۔''

پھر اس سورۃ میں چھ ایسے کاموں سے منع کیا گیا ہے جو دلوں کو پھاڑنے والے ہیں:

(i) ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ ...﴾ ''اے ایمان والو! تم میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اُڑائے.....''

(ii) ﴿وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ ''اور ایک دوسرے پر عیب نہ لگاؤ۔''

(iii) ﴿وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ﴾ (آیت ۱۱) ''اور ایک دوسرے کے بُرے نام نہ ڈالو۔''

(iv) ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ

اِثۡمٌ﴾ ''اے ایمان والو! سوئے ظن سے بچتے رہو' بے شک بعض گمان گناہ ہیں۔''

(v) ﴿وَّلَا تَجَسَّسُوۡا﴾ ''اور کسی کا راز نہ تلاش کرو۔''

(vi) ﴿وَلَا یَغۡتَبۡ بَّعۡضُکُمۡ بَعۡضًا ؕ﴾ (آیت ۱۲) ''اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔''

اگلی آیت میں انسانی معاشرے کے اصول ''مساوات'' کا تذکرہ ہے' جس کی بنیاد وحدتِ آدم ہے۔ گزشتہ خطاب میں اس آیت پر تفصیل سے گفتگو ہوئی ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ وَّاُنۡثٰی وَجَعَلۡنٰکُمۡ شُعُوۡبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوۡا ؕ اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰىکُمۡ ؕ﴾ (آیت ۱۳)

''اے لوگو! ہم نے تم کو ایک نر اور مادہ سے پیدا کیا' اور بنائیں تمہاری ذاتیں اور برادریاں آپس کی پہچان کے لیے۔ یقیناً تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزّت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔''

پوری سورت میں ایک ہی آیت ہے جو ''یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ'' سے شروع ہوئی ہے جبکہ پانچ دفعہ ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا'' آیا ہے۔ اسلامی معاشرہ نہ نسلی معاشرہ ہے' نہ لسانی' یہ حقیقتاً ایمان والوں اور دستوراً و قانوناً اسلام کا اقرار کرنے والوں کا معاشرہ ہے۔ چنانچہ اگلی آیت میں ایمان و اسلام کا فرق واضح کر دیا گیا:

﴿قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَلٰکِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا وَلَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ؕ﴾ (آیت ۱۴)

''بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیں تم ایمان نہیں لائے' لیکن تم یہ کہو کہ ہم مسلمان ہوئے کیونکہ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔''

اسلامی ریاست میں تمام مسلمان برابر ہیں!

چونکہ ایمان ایک باطنی مخفی حقیقت ہے جس کا جانچنا ناممکن ہے اس لیے اسلامی ریاست کی شہریت کی قانونی اساس اسلام ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ریاست میں تمام مسلمان برابر ہیں اور کسی کے فاسق یا متقی ہونے سے اس کی شہریت پر کوئی فرق

نہیں پڑتا۔ اس اصول کو مدِنظر رکھتے ہوئے بات آگے بڑھاتے ہیں۔ ہمارے ذہنوں میں ایک شائبہ ہے کہ ووٹ کا حق فاسق و فاجر کو نہیں ہونا چاہیے۔ اب کسی کے فاسق و فاجر ہونے کا فیصلہ کون کرے گا؟ کیا مسجدوں میں رجسٹر کھول دیے جائیں' پنج وقتہ حاضری لگائی جائے اور جس کی کم سے کم پچاس فیصد حاضری ہو جائے اس کو ووٹ کا حق دے دیا جائے؟ اس طرح تو ایک تماشا بن جائے گا۔

مَیں اس حوالے سے عرض کر دوں: ''اَلْمُسْلِمُ کُفْوٌ لِمُسْلِمٍ'' کہ مسلمان مسلمان کا کفو (ہم سر) ہے۔ یعنی قانونی اور دستوری اعتبار سے فاسق' فاجر اور متقی برابر ہیں۔ حقیقت کے اعتبار سے تو ایمان کے درجات زمین سے آسمان تک ہیں۔ کہاں ایمان ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کا' کہاں ایمان آپ کا اور میرا! یہاں بات حقیقت کی نہیں بلکہ قانونی اور دستوری اعتبار سے ہو رہی ہے کہ سب مسلمان قانوناً برابر ہیں۔ بلکہ قانونی اعتبار سے تو منافق بھی مسلم شمار ہوگا۔ عبداللہ بن اُبی بھی قانوناً مسلم تھا' اس لیے وہ ریاست کا شہری بن گیا اور اس کی نمازِ جنازہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پڑھائی۔ اس حوالے سے یہ ذہن نشین کر لیں کہ دستور اور قانون مؤمن اور منافق میں کوئی فرق نہیں کرتا' اس لیے کہ قانونی و دستوری بنیاد ایمان نہیں اسلام ہے' اور منافق بھی مسلم ہے' بایں طور کہ وہ اسلام کے قانونی تقاضے پورے کر رہا ہے' ارکانِ اسلام کا اقرار کر رہا ہے اور ارکان پر عمل بھی کر رہا ہے۔ چلیے اگر وہ نماز نہیں پڑھتا تو اس کو سزا دیجیے' لیکن وہ کافر تو نہیں ہو جاتا' اس لیے کہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب کافر تو نہیں' مسلم ہے۔

''اَلْمُسْلِمُ کُفْوٌ لِمُسْلِمٍ'' کے اصول کو سادہ سی مثال سے سمجھئے۔ فرض کیجیے کہ ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن اُبی' اگر یہ دونوں کسی ایک باپ کے بیٹے ہوتے تو وراثت میں حصّہ برابر ملتا یا کم و بیش ہوتا؟ اسی طرح ایک شخص پانچ وقت کا نمازی' تہجد گزار ہے اور ایک شخص کبھی کبھار نماز پڑھتا ہے' تہجد کا تو خیر سوال ہی نہیں' تو کیا یہ دونوں مسلمان ہونے میں برابر نہیں ہیں؟ ان جیسے معاملات میں واقعتاً امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ ان کی بعض آراء کو متکلمانہ مباحث کا عنوان بنا دیا گیا ہے' اصل میں وہ متکلمانہ

مباحث نہیں ہیں' بلکہ دستوری اور قانونی مباحث ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اصلاً فقیہہ ہیں اور فقہ صرف نماز روزے کے مسائل کا نام نہیں' اجتماعی وملّی مسائل' حکومت و ریاست کے مسائل' یہ سب اسی میں آئیں گے۔ آپؐ نے فرمایا: اَلْاِیْمَانُ قَوْلٌ لَا یَزِیْدُ وَلَا یَنْقُصُ ''ایمان زبانی اقرار کا نام ہے' یہ نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے''۔ ایک عام آدمی بھی اٹھ کر کہہ دے گا کہ یہ کیسی بچگانہ بات ہے' قرآن میں تو آیا ہے: ﴿فَزَادَتْهُمْ اِیْمَانًا﴾ (التوبۃ:۱۲۴) ''تو ان کا ایمان بڑھ گیا''۔ ﴿وَمَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا ﴿۲۲﴾﴾ (الاحزاب) ''اس بات نے نہیں اضافہ کیا مگر ان کے ایمان میں اور تسلیم میں''۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہر شخص کا ذاتی تجربہ ہے کہ ایمان گھٹتا بھی ہے' بڑھتا بھی ہے۔ آپ اہلِ یقین اور اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھیں تو آپ کو خود محسوس ہوگا کہ آپ کے اندر ایمان بڑھ رہا ہے' اور آپ کہیں غافلوں کی صحبت میں بیٹھیں تو بھی خود محسوس ہوگا کہ جو رتّی برابر ایمان تھا اس میں بھی کچھ کمی ہوگئی ہے۔ عام آدمی بھی سوچتا ہے کہ امام صاحب نے اس یقینی بات کی کیسے نفی کر دی؟ امام صاحب کے کہنے کا اصل مطلب یہ ہے اِس ایمان کی بنیاد پر جو دستوری اور قانونی حیثیت اس دنیا میں حاصل ہوتی ہے' وہ نہ گھٹتی ہے نہ بڑھتی ہے۔ جب تک آپ کسی شخص کو مسلمان تسلیم کرتے رہیں گے تب تک اُس کے قانونی اور دستوری status میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ ریاست اس کی تکفیر کر دے تو اس کا یہ status ختم ہو جائے گا۔ اگر کوئی شخص اسلامی عقائد یا ارکانِ اسلام میں سے کسی کی نفی کر دے تو وہ اسلام سے نکل کر کفر کی تاریکیوں میں چلا گیا' جیسے ختمِ نبوت کے انکار کی بنیاد پر قادیانیوں کی تکفیر کر دی گئی اور وہ آپ کے دائرے سے نکل گئے۔

فزیالوجی کا ایک قانون ہے ''All or none law''۔ بعض phenomena ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں percentage نہیں چلتی۔ دین کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اس میں فی صد کا اطلاق نہیں ہوتا۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ۪﴾ (البقرۃ:۲۰۸) ''اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ''۔ اور دوسری آیت مَیں پہلے ہی آپ کو سنا چکا ہوں: ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ﴾ ''کیا تم کتاب کے بعض حصّوں پر ایمان

لاتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو؟'' یہ تو اتنا بڑا جرم ہے کہ دنیا میں ان کے لیے رسوائی ﴿خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا﴾ اور آخرت میں شدید ترین عذاب ﴿اَشَدِّ الْعَذَابِ﴾ ہے۔ یہاں بھی ''All or none law'' کا اطلاق ہوتا ہے کہ مانو تو پورا مانو' نہیں تو دفع ہو جاؤ' اللہ تعالیٰ کو تمہاری کوئی غرض' احتیاج نہیں ہے کہ سارا نہ مانو تو چلو تینتیس فیصد مان لو۔ ہاں اگر خطا ہو گئی' کوئی گناہ ہو گیا' تقصیر ہو گئی' پاؤں پھسل گیا تو یہ اور بات ہے' لیکن آپ اسے تسلیم کر رہے ہوں۔ اور اگر آپ نے کسی گناہ پر ڈیرہ ہی جما لیا ہو تو یہ چیز کفر کے مترادف ہے۔ ایک شخص جب تک مسلمان ہے اس کے تمام حقوق قائم ہیں اور جب مسلمان نہیں رہا تو اس کے جملہ حقوق' بیک جنبش قلم ختم ہو گئے۔ درمیانی راستہ کوئی نہیں ہے کہ یہ پچاس فیصد مسلمان ہے' اس لیے اس کے پچاس فیصد حقوق ہوں گے۔ میرے نزدیک امام اعظم ابوحنیفہؒ کے اس موقف ''لَا یَزِیْدُ وَلَا یَنْقُصُ'' کا یہ مفہوم ہے۔

اس ساری بحث سے دو باتیں ثابت ہوئیں:

(i) اسلامی ریاست میں شہریت کی بنیاد اسلام ہے۔

(ii) اس میں تمام مسلمان برابر کے شریک ہیں' فاسق اور متقی کی کوئی تقسیم نہیں ہے۔

اسلامی نظامِ سیاست میں ووٹر کی عمر

اسلام کے سیاسی نظام سے متعلق ساتویں بحث ووٹر کی عمر اور سیاست میں عورتوں کے عمل دخل کے بارے میں ہے۔ ووٹر کی عمر کے ضمن میں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ چالیس سال ہونی چاہیے۔ مجھے اس حوالے سے قرآن مجید سے اشارہ ملا ہے۔ مَیں اسے نص صریح نہیں کہتا کہ وہ لازم ہو' لیکن یہ ایک رائے ہے۔ اگر آپ کے اندر قرآن کو follow کرنے کا جذبہ پیدا ہو جائے گا تو قرآن کا اشارہ بھی آپ کے لیے کافی ہو گا۔ مَیں نے جس اشارے کا ذکر کیا ہے وہ مجھے سورۃ الاحقاف کی آیت ۱۵ سے ملا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿حَتّٰٓی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً﴾ ''یہاں تک کہ جب وہ اپنی قوت کو پہنچا اور اس کی عمر چالیس سال ہو گئی.....'' میرے نزدیک یہ آیت اشارہ کر رہی ہے کہ انسان کی ذہنی اور نفسیاتی بلوغت کی عمر چالیس برس ہے۔

ابھی حال ہی میں میری ملاقات ڈاکٹر ناصر صاحب سے ہوئی جو اینتھروپولوجسٹ ہیں اور انٹرنیشنل سطح کی باڈیز میں وہ صدر بھی رہے ہیں' انہوں نے کہا کہ یہ بات سائنسی طور پر ثابت ہے کہ انسانی زندگی کے تین علیحدہ علیحدہ سائیکلز ہوتے ہیں۔ ہماری ساٹھ برس کی جو زندگی ہے' اس میں بیس بیس برس کے تین ادوار ہیں' اور انسان کی ذہنی' فکری اور نفسیاتی بلوغت کی عمر چالیس برس ہے۔

ڈاکٹر ناصر صاحب کوئی زیادہ مذہبی آدمی نہیں ہیں۔ وہ اپنے کچھ نظریات کے بارے میں مجھ سے گفتگو کرنے آئے تھے کہ ان میں کہیں قرآن مجید سے کوئی تضاد تو نہیں ہے۔ ایک عجیب بات انہوں نے اور بتائی کہ ہم نے انسان کی اصل زندگی کو سائنسی طور پر calculate کیا ہے۔ مرد کا ایک تولیدی خلیہ (sperm) جو جسم انسانی کا ایک یونٹ ہے' حیات کے لیے سازگار ترین ماحول میں رکھا گیا اور پھر اس کی عمر کو calculate کیا گیا تو معلوم ہوا کہ انسان کی اصل عمر ۹۶۰ برس ہے۔ یہ تو ناسازگار ماحول کے باعث ہمارا زوال ہو رہا ہے' ہم گرتے جا رہے ہیں' ورنہ اگر حالات کو درست کیا جائے اور environments ٹھیک ہو جائیں تو ہو سکتا ہے کہ انسان کی عمر ۹۶۰ برس تک ہو جائے۔ مَیں نے ان کو بتایا کہ قرآن مجید میں حضرت نوح علیہ السلام کی ۹۵۰ برس کی عمر کا تذکرہ ہے: ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا﴾ (العنکبوت:۱۴) ''ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا' پس وہ ان میں پچاس کم ہزار سال رہے''۔ یہ حقائق سن کر وہ چونک گئے۔

اللہ کرے کہ ہم کوئی انقلاب لا سکیں! ابھی تو ہمارے اختیار میں نہیں ہے' ابھی تو سیکولر جمہوریت چل رہی ہے' کیونکہ آپ خود سیکولر ہیں' لیکن اگر یہاں اسلامی انقلاب آ جائے اور اسلامی ریاست قائم ہو جائے تو میری تجویز ہو گی کہ ووٹر کی عمر چالیس برس ہو۔

اسلامی نظامِ سیاست میں عورتوں کا کردار

اسلامی ریاست میں خواتین کا کیا عمل دخل ہے؟ یہ بھی ذرا کڑوی گولی ہے۔ میرے نزدیک خواتین رائے دہی میں شریک ہو سکتی ہیں لیکن امورِ مملکت میں ان کا کوئی حصّہ

نہیں ہوسکتا۔ اس بارے میں کوئی نص صریح میرے پاس نہیں ہے' لہٰذا میں اس کو حرامِ مطلق نہیں کہتا' لیکن یہ چیز روحِ دین' نظامِ دین اور مزاجِ دین کے خلاف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا كَانَ اُمَرَاؤُكُمْ شِرَارَكُمْ وَاَغْنِيَاؤُكُمْ بُخَلَاءَكُمْ وَاُمُوْرُكُمْ اِلٰى نِسَائِكُمْ فَبَطْنُ الْاَرْضِ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ ظَهْرِهَا))(۷)

''جب تمہارے حکمران بدترین لوگ ہوں اور تمہارے مالدار بخیل ہوں اور تمہارے امور تمہاری عورتوں کے ہاتھ میں آ جائیں تو زمین کا پیٹ تمہارے لیے زمین کی پیٹھ سے بہتر ہے۔''

یہاں بھی ''اُمُوْر'' کا لفظ آیا ہے' جیسے ﴿هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ﴾ اور ﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ میں ''الامر'' آیا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی امر سے مراد اختیار اور انتظامی امور ہیں۔ یعنی اگر تمہارے انتظامی اُمور تمہاری عورتوں کے ہاتھ آ گئے تو تمہارا مر کر دفن ہو جانا بہتر ہے بنسبت اس کے کہ زندہ رہو اور زمین کی پیٹھ پر چلو۔(۸)

یہی طرزِ عمل' یہی معاملہ آپ کے گھر میں بھی ہونا چاہیے کہ فیصلہ کُن امور عورتوں کے ہاتھ میں نہ آ جائیں۔ ؎

نے پردہ نہ تعلیم' نئی ہو کہ پرانی
نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد!

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ﴾ کے مصداق مرد کی حاکمیت گھر میں بھی ہونی چاہیے۔ ڈوب مرنا چاہیے ان لوگوں کو جن کی بات اپنے گھر میں نہیں چلتی: ((فَبَطْنُ

---

(۷) سنن الترمذی' ابواب الفتن' باب ما جاء فی النهی عن سب الرياح۔

(۸) رسول اللہ ﷺ کو جب یہ بتایا گیا کہ اہلِ فارس نے بادشاہ کی بیٹی کو اپنا حکمران بنا لیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا اَمْرَهُمُ امْرَاَةً)) (صحیح البخاری' کتاب المغازی' باب کتاب النبی ﷺ الی کسریٰ وقیصر) ''وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتی جو ایک عورت کو اپنا حاکم بنالے۔'' (مرتّب)

الْاَرْضِ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ ظَهْرِهَا))۔

میرے نزدیک اسلامی ریاست میں عورتوں کو امورِ مملکت اور امورِ ریاست میں بالفعل کوئی حصّہ دینا اس حدیث کی رو سے سرے سے جائز نہیں۔ یہ انتہائی منافقت ہے جس میں آج پوری قوم مبتلا ہے کہ عورتوں کو ووٹ کا بھی حق ہے' وہ الیکشن بھی لڑ سکتی ہیں' ان کو سب کچھ بنایا جا سکتا ہے' وہ اپوزیشن کی طرف سے بھی آ سکتی ہیں' وہ اسپیکر بھی بن سکتی ہیں۔[9] یہ سراسر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کی خلاف ورزی ہے۔ یہ منافقت درحقیقت پچھلے گیارہ سال (ضیاء الحق مرحوم کا دورِ حکومت) میں بہت شدّت کے ساتھ آگے بڑھی ہے۔ امورِ مملکت اور امورِ ریاست میں جتنا اس دور میں عورتوں کو آگے بڑھایا گیا' اس سے پہلے ایسا نہیں تھا۔ درحقیقت یہ ہمارے اپنے کرتوت ہیں۔ ہم نے ''ہر میدان میں شانہ بشانہ'' کی جورٹ لگا رکھی ہے اس کا نتیجہ اور کیا نکلے گا؟ بہرحال میری رائے یہ ہے کہ امورِ ریاست اور امورِ مملکت میں خواتین کو رائے دینے کی حد تک حق حاصل ہو سکتا ہے' لیکن اس سے آگے امورِ مملکت' تنفیذی امور' پالیسی بنانا' ان میں نہ غیر مسلموں کا حصّہ ہو سکتا ہے اور نہ خواتین کا۔ پالیسی بنانے والے مسلمان مرد ہوں گے اور امورِ مملکت بھی مسلمان مَردوں کے ہاتھ میں ہو گی۔ یہ کڑوی گولی بہرصورت نگلنی پڑے گی۔ بصورتِ دیگر ہم نہ اِدھر کے رہیں گے نہ اُدھر کے ـــــ اور مسلسل ؎

''ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے!''

کی تصویر بنے رہیں گے۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات oo

---

(۹) پھر چشمِ فلک نے یہ منظر بھی دیکھا کہ ایک خاتون دو مرتبہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی وزیر اعظم منتخب ہوئی۔ واضح رہے کہ محترم ڈاکٹر صاحبؒ کا یہ خطاب اس دور سے پہلے کا ہے۔ (مرتّب)

خطاب ⑤

اسلام کا معاشی اور اِقتصادی نظام

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم - بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝۴﴾ (المؤمنون)

﴿وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝۱۹﴾ (الذّٰریٰت)

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ قُلِ الْعَفْوَ ۭ﴾ (البقرة:۲۱۹)

﴿كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَاۗءِ مِنْكُمْ ۭ﴾ (الحشر:۷)

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۳۷ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۠ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۳۸ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۝۳۹﴾ (الروم)

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۲۷۸ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝۲۷۹﴾ (البقرة)

وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلّى اللّٰه عليه وسلّم:

((يَقُوْلُ الْعَبْدُ : مَالِيْ مَالِيْ ، وَاِنَّ مَالَهٗ مِنْ مَالِهٖ ثَلَاثٌ : مَا اَكَلَ فَاَفْنٰى اَوْ لَبِسَ فَاَبْلٰى اَوْ اَعْطٰى فَاقْتَنٰى ، وَمَا سِوٰى ذٰلِكَ فَهُوَ ذَاهِبٌ وَتَارِكُهٗ لِلنَّاسِ))

(رواه مسلم)

تمہیدی کلمات

''اسلام کا نظامِ حیات'' کے موضوع پر سلسلہ وار خطابات کے ضمن میں آج پانچواں اور آخری خطاب ہے' جس کا عنوان ہے: ''اسلام کا معاشی اور اقتصادی نظام''۔ اس سے پہلے اس سلسلہ کے چار خطابات ہو چکے ہیں: (i) اسلامی نظام کی نظریاتی اساس: ایمان (ii) اسلام کا اخلاقی اور روحانی نظام (iii) اسلام کا سماجی اور معاشرتی نظام (iv) اسلام کا سیاسی اور ریاستی نظام ـــــ آج ایک اعتبار سے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یہ سلسلہ بحمدِ اللہ تکمیل کو پہنچا۔ ع ''شکر صد شکر کہ جمّازہ بمنزل رسید!'' لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک خصوصی تشویش بھی ہے کہ آج ہم اسلامی نظامِ حیات کے جس گوشے سے متعلق گفتگو کرنے جا رہے ہیں وہ سب سے زیادہ پیچیدہ بھی ہے' اختلافی بھی' مشکل بھی اور سب سے زیادہ اہم بھی۔

ایک طرف تو یہ بات معروف اور مسلّم حقیقت کے طور پر لوگوں کے علم میں ہے کہ دورِ حاضر درحقیقت اقتصادیات کا دور ہے اور ساری بین الاقوامی سیاست اقتصادیات کے گرد گھوم رہی ہے۔ قومی اور عالمی سطح پر جتنے بھی معاملات ہیں ان میں سب سے بڑا اور فیصلہ کُن عامل معاشی اور اقتصادی ہے۔ الغرض خواہ ملکوں کے اپنے اندرونی معاملات ہوں' قومی مسائل ہوں' بین الاقوامی سیاست ہو یا بین الاقوامی معاملات' ان سب میں سب سے زیادہ مؤثر عامل اقتصادی اور معاشی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ایک مسلّم حقیقت ہے کہ آج کے انسان کو بنیادی طور پر معاشی یا اقتصادی حیوان قرار دیا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ ایک دور تھا جس میں عقلیات' فلسفہ اور منطق کا بڑا دور دورہ تھا اور لوگوں کی کثیر تعداد ادھر متوجّہ تھی۔ اُس دور میں یہ علوم سب سے اعلیٰ شمار ہوتے تھے اور ذہین ترین لوگ انہی کی طرف متوجّہ ہوتے تھے۔ اُس دَور میں انسان کو حیوانِ عاقل اور حیوانِ ناطق سے تعبیر کیا گیا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کا انسان ایک معاشی اور اقتصادی حیوان بن کر رہ گیا ہے۔

اس ضمن میں اسلامی تعلیمات کے کچھ پہلو بعض اسباب کی بنا پر دورِ خلافتِ راشدہ

کے فوراً بعد دورِ ملوکیت کے آغاز پر پس منظر میں چلے گئے اور عمومی طور پر لوگوں کی نگاہوں کے سامنے نہ رہے۔ آج معاشی اور اقتصادی مسئلے کی شدّت کا ایک مثبت اور خیر و برکت کا پہلو یہ ہے کہ اس دور میں وہ پوشیدہ پہلو از سرِ نو نمایاں ہو رہے ہیں اور ان کی طرف لوگوں کی توجہ مجبوراً ہو رہی ہے۔

اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

بیسویں صدی کے مسلم مفکّرین میں مَیں سب سے زیادہ علّامہ اقبال کی صحتِ فکر اور جامعیتِ فکر کا قائل ہوں۔ مَیں نے پچھلے خطابات میں بھی علّامہ اقبال کے درج ذیل اشعار پڑھے تھے اور آج بھی اُن کو دُہرا رہا ہوں' اس لیے کہ اُن میں بڑی عظیم حقیقت بیان ہوئی ہے ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو　　آں کہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰؐ او را بہاست　　یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است!

مَیں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ گمبھیر اور جامع تعبیر ممکن نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد نوعِ انسانی میں جتنا بھی معاشرتی' ذہنی اور فکری ارتقاء ہوا ہے اور اس ضمن میں جو بھی خیر انسان نے پچھلے ایک ہزار سال کے دوران حاصل کیا ہے' اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ درحقیقت اس ہدایتِ آسمانی سے مستعار ہے جو محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر اپنے نقطۂ عروج اور نقطۂ تکمیل کو پہنچ گئی تھی۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝﴾ (التوبۃ)

''وہ چاہتے ہیں کہ بجھا دیں اللہ کی روشنی (نور) کو اپنے مُنہ (کی پھونکوں) سے جبکہ اللہ اپنی روشنی کو پورا کیے بغیر نہیں رہے گا اگرچہ کافر ناپسند کریں۔ اُسی (اللہ) نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور سچّا دین دے کر تاکہ اس (دین) کو ہر دین پر غالب کر دے' اگرچہ مشرک اس کو ناپسند کریں۔''

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک تحدّی کا (challenging) انداز ہے اور ظاہر بات ہے کہ اللہ کے چیلنج کا کون مقابلہ کر سکتا ہے؟ چنانچہ وہ بات پوری ہو کر رہی: ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾﴾ (الاسراء) ''حق آ گیا اور باطل بھاگ (مٹ) گیا۔ یقیناً باطل ہے ہی بھاگنے (مٹنے) والا''۔ اور اس کا اعلان سورۃ المائدۃ میں یہ الفاظ کر دیا گیا:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ﴾ (المائدۃ:۳)

''آج کے دن مَیں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت کا اِتمام فرما دیا ہے اور تمہارے لیے مَیں نے پسند کر لیا ہے اسلام کو بحیثیت دین کے۔''

یہ معاملہ دَورِ نبویؐ اور دَورِ خلافتِ راشدہ میں ایک حقیقتِ واقعی کی صورت میں دنیا کے سامنے آیا۔ اسلام کے غلبے اور اسلامی نظام کے بالفعل قیام کی جو جھلک انسان نے اُس وقت دیکھی تھی، مَیں نے اس کے بارے میں بارہا کہا ہے کہ وہ ایک حسین خواب کی مانند ہے۔ ہم میں سے کوئی شخص کبھی بہت اچھا خواب دیکھے تو وہ بہت عرصے تک اس کی یادداشت میں محفوظ رہتا ہے اور اُس کی یاد بار بار آتی ہے۔ اسی طرح دورِ نبویؐ اور دورِ خلافتِ راشدہ پوری انسانیت کی اجتماعی یادداشت میں ایک حسین خواب کی یاد کی حیثیت سے محفوظ ہے اور نوعِ انسانی درحقیقت اسی کو realize کر رہی ہے۔

علّامہ اقبال نے بھی ان اشعار میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ دنیا میں جہاں بھی کوئی خیر یا خوبی ہے، کوئی اعلیٰ قدر ہے، چاہے نظامِ عدالت کی ہو، نظامِ حکومت کی ہو یا کسی اقتصادی نظام کی، وہ درحقیقت یا تو محمد مصطفیٰ ﷺ سے مستعار لی گئی ہے یا ابھی انسان گھسٹ گھسٹ کر اُسی منزل کی طرف جا رہا ہے جس منزل پر آج سے چودہ سو سال قبل حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے انسانیت کو پہنچا دیا تھا۔

موجودہ دور میں عمرانیات کا جو ارتقاء ہوا ہے اور حالات کی شدّت کے نتیجے میں

معاشی میدان میں خیر کے جو پہلو سامنے آنا شروع ہوئے ہیں' اس کا اظہار علّامہ اقبال نے اس طرح کیا ہے: ؎

جو حرفِ قُلِ الْعَفو میں پوشیدہ تھی اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ حقائق کبھی نمودار ہی نہیں ہوئے تھے بلکہ وہ پورے طور پر دورِ نبویؐ اور دورِ خلافتِ راشدہ میں جلوہ آرا ہوئے تھے' البتہ اس کے بعد اس پر پردے پڑ گئے اور وہ پس منظر میں چلے گئے۔ اب موجودہ حالات کا تقاضا ہے کہ وہ حقائق دوبارہ سامنے آئیں۔ اس حوالے سے میرے نزدیک علّامہ اقبال کی نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' کا خاص طور پر آخری حصّہ جامعیت کے اعتبار سے انتہائی اہم ہے۔

جہاں تک شعریت' جذبات اور سوز و ساز کا تعلق ہے اس اعتبار سے علّامہ کی دوسری نظمیں بہت بلند ہیں' لیکن علّامہ اقبال کا پیغام اُمّتِ مُسلمہ کے نام' کے موضوع پر میرے نزدیک حرفِ آخر اور کلائمکس یہ نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' ہے۔ اس میں علّامہ نے اپنی سوچ کا خلاصہ اور لُبِّ لُباب اُمّتِ مُسلمہ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔ ابلیس اپنی مجلسِ مشاورت کو اختتام پذیر (conclude) کرتے ہوئے کہتا ہے:

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں!
الحذر آئینِ پیغمبرؐ سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن' مَرد آزما' مَرد آفریں!

آپ نوٹ کیجیے کہ ایک مصرعہ میں اسلام کے عائلی اور معاشرتی نظام کا لُبِّ لُباب اور اس کا اہم ترین پہلو بیان ہو گیا ہے۔ اس مصرعہ میں تین معاشرتی پہلوؤں کا تذکرہ ہے:
(i) حافظ ناموسِ زن' یعنی اسلام کا معاشرتی نظام عورت کی عزّت اور عصمت کا محافظ ہے۔
(ii) مرد آزما' یعنی اسلام نے معاش کی ذمّہ داری مرد پر ڈالی ہے۔ (iii) مرد آفریں' یعنی ملکی دفاع بھی مَردوں کی ذمّہ داری ہے۔

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے
نے کوئی فغفور و خاقاں' نے فقیرِ رہ نشیں!

یہ اسلام کے سیاسی نظام کا لُبِّ لُباب اور خلاصہ ہے کہ ہر نوع کی غلامی ختم' یعنی نہ کوئی حاکم نہ محکوم اور نہ کوئی آقا نہ کوئی غلام۔ اسلام ''حریتِ کاملہ'' کا تصوّر دیتا ہے کہ انسان ہونے کے ناطے سب برابر ہیں ع ''تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے!'' انسان انسان کا غلام اور انسان انسان کے تابع ہو' اسلام اس تصوّر کی نفی کرتا ہے اور بندوں سے صرف اللہ کی عبدیت کا مطالبہ ہے۔

اس کے بعد دو اشعار میں معاشی اور اقتصادی نظام کا تذکرہ ہے جو ہمارا آج کا موضوع ہے:

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں!
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں' اللہ کی ہے یہ زمیں!

یعنی اسلام دولت کو تمام آلودگیوں سود' جوا اور سٹہ وغیرہ سے پاک کرتا ہے اور مالداروں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے تم اس کے مالک نہیں بلکہ امین ہو۔ دوسرے مصرعہ میں مسئلہ ملکیت زمین کا تذکرہ ہے کہ زمین اللہ کی ملکیت ہے۔ اس اعلیٰ نظامِ حیات کے بارے میں ابلیس کو اندیشہ ہے کہ کہیں دنیا کے سامنے دوبارہ آشکارا نہ ہو جائے۔ پھر ظاہر بات ہے کہ ابلیس اور ابلیسیت کے لیے اس دنیا میں کھل کھیلنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہے گا۔

اسلام کے معاشی نظام پر گفتگو کرنے کی اہلیت

ایک طرف تو اس موضوع کی اہمیت کا یہ عالَم ہے کہ موجودہ دور کو معاشیات کا دور کہا جاتا ہے۔ دوسری طرف میرے سامنے یہ حقیقت الحمدللہ پوری طرح واضح ہے کہ اصولاً اس موضوع یعنی اسلام کے معاشی اور اقتصادی نظام پر گفتگو کا حق اس شخص کو حاصل ہے

جس نے ایک تو جدید معاشیات اور اقتصادیات کا طالب علمانہ مطالعہ کیا ہو' اس میں مہارتِ تامّہ بہم پہنچائی ہو اور اس کی پیچیدگیاں جانتا ہو۔ دوسرے یہ کہ قرآن و حدیث' فقہ اور اسلام کے نظامِ فکر کی بڑی باریکیوں تک اس کی نگاہ پہنچی ہو۔ یہ دونوں چیزیں اگر کسی شخص میں نہیں ہیں تو اس کو اس موضوع پر گفتگو کا حق نہیں ہے۔ مَیں صاف اعتراف کرتا ہوں کہ مَیں ان دونوں اعتبارات سے بالکل تہی دست اور تہی دامن ہوں۔ مَیں کبھی بھی معاشیات کا طالب علم نہیں رہا اور مَیں نے باقاعدہ اس کی تحصیل نہیں کی' اس کے علاوہ جدید معاشیات و اقتصادیات کے جو پیچیدہ مسائل ہیں ان سے مَیں سرے سے نابلد ہوں۔ مالی (fiscal) معاملات' مانیٹری سسٹم' بینکنگ اور فنانس' بڑے پیچیدہ اور مشکل مسئلے ہیں۔ پوری پوری زندگیاں ان میں کھپائی جائیں تو پتا چلتا ہے کہ ان کی باریکیاں' نزاکتیں اور مشکلات کیا ہیں' ان کے مسائل کیا ہیں اور ان کا حل کیا ہے۔ مَیں اپنے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ مَیں قرآن حکیم کا طالب علم ہوں اور کسی حد تک حدیثِ نبویؐ کا' جبکہ فقہ کا مَیں نے باضابطہ مطالعہ کیا ہی نہیں۔ گویا ان دونوں شرائط کے اعتبار سے مَیں اس موضوع پر گفتگو کرنے کا اہل نہیں ہوں۔

پھر سوال پیدا ہو رہا ہے کہ اس کے باوجود مَیں اس موضوع پر لب کُشائی کی جسارت کیوں کر رہا ہوں؟ اس کی دو وجوہات ہیں۔ اوّلاً یہ کہ معاشیات اور اقتصادیات کے مبادی اور اسلام نے اُن کے لیے جو بنیادی ہدایات اور راہنمائی دی ہے' قرآن مجید کے طالب علم ہونے کے ناطے' الحمدللہ ثم الحمدللہ' اس میں اللہ تعالیٰ نے مجھے پورا انشراح عطا فرمایا ہے اور ثانیاً یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے عقلِ عام (common sense) سے بہرہ ور فرمایا ہے۔ یہ شاید ایک دعویٰ ہو لیکن بہرحال اس دعوے کی مَیں جرأت یا جسارت کر رہا ہوں۔ ان دو چیزوں کی بنیاد پر مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ لوگوں کے ذہنوں میں معاشیاتِ اسلامی سے متعلق جو بعض الجھنیں (confusions)' پیچیدگیاں اور خلطِ مبحث کی نوعیت کی جو چیزیں ہیں' شاید ان کے حل کرنے میں کسی حد تک مَیں بھی کچھ مدد کر سکوں۔ ظاہر بات ہے کہ اس کے بعد اس کو آگے بڑھانا تو ان حضرات کا کام ہے جو اس کے لیے پوری

زندگیاں لگائیں۔ ایک طرف کسی ایک یونیورسٹی سے نہیں بلکہ متعدّد یونیورسٹیوں سے معاشیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کریں اور دوسری طرف انہوں نے واقعتاً قرآن وسُنّت اور فقہ اسلامی کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہو۔

لاہور میں ہم نے جو قرآن اکیڈمی قائم کی ہے ابھی وہ ابتدائی مراحل میں ہے' لیکن یہ کام ہمارے پیشِ نظر ہے۔ آپ دعا کریں کہ کچھ نوجوان اس کے لیے کمرِ ہمّت کس لیں۔ اس ضمن میں اہم ترین کام تو یہ ہے کہ جن حضرات کی ساری عمر دین کے پڑھنے پڑھانے میں گزری ہے اب وہ جدید اقتصادیات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ دوسرے درجے میں جن لوگوں نے ساری عمر اقتصادیات کا مطالعہ کیا ہے اب وہ قرآن وحدیث اور فقہ کو بھی پڑھیں۔ یہ دوسری چیز بھی بہرحال مَا لَا یُدرک کُلُّہ لَا یُترک کُلُّہ کے درجے میں قابلِ قبول ہے۔ لیکن اصلاً یہ کام ان لوگوں کے ذریعے ہو سکے گا جو ابتدا ہی سے متوازن اور متوازی طور پر ان دونوں چیزوں کا مطالعہ کر رہے ہوں۔ اس سے درحقیقت ذہن کی وہ تربیت وجود میں آئے گی جو ہر سطح پر ذہنی وفکری توافق وہم آہنگی (integration) کے تمام تقاضوں کو پورا کر سکے گی۔ بہرحال کسی اعلیٰ مقصد کے لیے اگر ابتدا بھی کر دی جائے تو وہ بھی ایک کرنے کا کام ہے۔ ہم نے اس کا ارادہ کیا ہے' اللہ تعالیٰ اسے پورا کروائے۔

اس طرح کے عمومی اجتماعات میں پوری بحث کو بنیاد سے اٹھانا اور بنیادی تصوّرات (concepts) اور بنیادی اصطلاحات (terminology) کی وضاحت سے گفتگو شروع کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ آج مَیں نے خاص طور پر عرض کیا کہ مَیں اقتصادی اور معاشی نظام کے بارے میں تو گفتگو کرنے کا اہل بھی نہیں ہوں' اس لیے مَیں اس ضمن میں تفہیم کا آسان راستہ اختیار کروں گا۔ جیسے کہ مَیں نے اسلام کے سیاسی نظام پر گفتگو کرتے ہوئے بھی ایک آسان راستہ اختیار کیا تھا کہ سیاسی نظام سے متعلق بعض اصطلاحات ہمارے ذہنوں میں موجود ہیں اور ہمارا عام پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ ملوکیت (monarchy)' پاپائیت (theocracy) اور جمہوریت (democracy) کا کیا مفہوم ہے۔ چنانچہ اگر

کسی نے تھیوڈیموکریسی کی اصطلاح وضع کی تو اس کے حوالے سے بات سمجھانے میں آسانی ہوئی۔ اسی طرح اِس وقت بھی میرے سامنے آسان راستہ یہ ہے کہ معاشیات اور اقتصادیات سے متعلق وہ اصطلاحات جو معروف ہیں اور عام لوگ اس سے واقف ہیں' ان کے حوالے سے بات کروں تاکہ بات فوراً سمجھ میں آجائے' مثلاً سرمایہ داری (capitalism) ایک زندہ حقیقت اور ایک زندہ نظام کی حیثیت سے دنیا کے بہت بڑے رقبہ پر بالفعل قائم ہے اور ایک بڑی سپر پاور اس کی علمبردار ہے۔ وہ ایک جانی پہچانی حقیقت ہے اور اس کے اصول و مبادی لوگوں کے علم میں ہیں۔ دوسری طرف اشتراکیت (communism) بھی اس صدی کی ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ روس میں اس کا آغاز ہوا' اگرچہ اس میں کئی تبدیلیاں بھی آرہی ہیں' لیکن کمیونزم کیا ہے' اس کے معنی کیا ہیں' اس سے مراد کیا ہے' اس کے اصول و مبادی کیا ہیں' یہ بہرحال ہمارے عام پڑھے لکھے لوگوں کے علم میں ہے۔ اکثر و بیشتر لوگ جانتے ہیں کہ یہ دو نظام ہائے معیشت ہیں جو اس وقت بالفعل دنیا میں قائم ہیں۔ اگر ہم ان اصطلاحات کو مدِنظر رکھتے ہوئے گفتگو کریں گے تو' ان شاء اللہ' اسلام کے نظامِ معیشت کو سمجھنے میں سہولت ہوگی اور آسانی کے ساتھ ہم اسلامی نظامِ حیات کے آخری مرحلے کو طے کرسکیں گے۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت کا تقابلی جائزہ

میں نے اسلام کے معاشرتی نظام پر گفتگو کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ یہ دو معاشی نظام (سرمایہ داری اور اشتراکیت) جو دنیا میں موجود ہیں' ان دونوں میں سے ہر ایک کا ایک نمائندہ لفظ (catch word) ہے جو اس نظام کے مرکزی خیال کی نمائندگی کرتا ہے۔ یعنی سرمایہ دارانہ نظام کا نمائندہ لفظ آزادی (freedom) اور اشتراکیت کا مساوات (equality) ہے۔ یہ دونوں ہی اعلیٰ اقدار ہیں اور انسانی ضمیر دونوں ہی کو پسند کرے گا۔ زیادہ اونچ نیچ کسی کو بھی پسند نہیں اور اسی طرح قدغنیں اور پابندیاں بھی کوئی پسند نہیں کرتا۔ البتہ مشکل یہی ہے کہ خود ان دونوں نظاموں میں عدل و اعتدال اور توازن مفقود ہے۔ یہ وہ شے ہے جس کی تلاش میں انسان سرگرداں ہے' مختلف قسم کے

تجربے کر رہا ہے' افراط و تفریط کے دھکوں سے اِدھر سے اُدھر جا رہا ہے' لیکن بہر حال انسان اس نقطۂ اعتدال کا متلاشی ہے کہ جس میں یہ دونوں چیزیں (آزادی اور مساوات) سمو دی جائیں۔ ان ہی کوششوں کا ایک نتیجہ سوشلسٹ ویلفیئر سٹیٹ کا تصوّر ہے' جس کی سب سے بڑی نمائندگی سیکنڈے نیوین ممالک کر رہے ہیں جہاں وہ نظام ان دونوں کے ملاپ (synthesis) کی شکل میں سامنے آیا ہے۔

ان دونوں نظاموں کی بدبختی یہ ہے کہ ایک میں آزادی ہے مساوات نہیں اور دوسرے میں مساوات ہے آزادی نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ میں آپ بحری جہاز سے ساحل پر اتریے یا ہوائی جہاز سے ایئرپورٹ پر اتریے' آپ کو فوراً محسوس ہوگا کہ یہاں آزادی ہے' اس کی فضا میں آزادی رچی بسی ہے۔ وہاں حکومت تقریباً غیر مرئی (invisible) محسوس ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم پاکستانیوں کے لیے ایک مصیبت امیگریشن کی ہے' اس کے بعد آپ وہاں گھومیں پھریں تو اس کی فضا میں آزادی محسوس کریں گے۔ لیکن یہ آزادی مساوات کی قیمت پر حاصل ہوئی ہے۔ ایک قوم تہذیب و تمدن اور آزادی کے اعتبار سے اتنی بلندی پر ہے' لیکن دوسری طرف آپ کو نظر آ جائے گا کہ مین ہیٹن میں ایسے اقلیتی محلے (ghettos) موجود ہیں جہاں انسان حیوانی سطح پر زندگی گزار رہے ہیں' حالانکہ اسی کے جنوبی کنارے پر وہ وال سٹریٹ ہے کہ جہاں دُنیا کی دولت کا بہت بڑا حصّہ مرتکز ہے۔ وہاں پر آپ کو یہ فرق و تفاوت بالکل نمایاں نظر آ جائے گا کہ ایک طرف وہ لوگ ہیں جن کی دولت کا کوئی اندازہ ہی نہیں' انہیں خود نہیں معلوم کہ ان کے پاس کتنی دولت ہے اور ایک طرف اسی مملکت کے وہ شہری ہیں جو خاص طور پر رات کے وقت زیرِ زمین راستوں اور ٹرینوں میں کیا کیا حرکتیں کرتے پھرتے ہیں اور شراب کی ایک بوتل کے لیے انسانی جان کے ساتھ کھیل جاتے ہیں۔ آپ کو یہ فرق و تفاوت عام نظر آئے گا' البتہ وہاں آزادی ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ دوسری بات یہ کہ ایسی کامل مساوات کہ سب بالکل برابر ہو جائیں' یہ انہونی سی بات ہے جس کا کوئی تصوّر ممکن ہی نہیں ہے۔ بہر حال یہ ماننا پڑے گا کہ کمیونزم نے اس فرق و تفاوت کو بہت حد تک کم کیا ہے'

لیکن یہ مساوات آزادی کی قیمت پر حاصل ہوئی ہے۔ آزادی کی وہ چڑیا ہاتھ سے جاتی رہی ہے جس کے لیے سفر کبھی شروع کیا گیا تھا۔

اس تمدنی ارتقاء کے سفر کو اگر ہم پچھلی دو تین صدیوں میں تلاش کریں تو اس کی ابتدا اور شروعات کا پتا چلے گا۔ پہلے ملوکیت اور جاگیرداری کا دور تھا۔ پوری دنیا میں' یورپ اور ہندوستان سمیت' بادشاہت اور جاگیرداری ایک عالمگیر نظام کی حیثیت سے رائج تھی۔ ہمارے ہاں بھی بادشاہ سلامت کے نیچے بیس ہزاری' تیس ہزاری منصب دار ہوتے تھے اور برطانیہ عظمیٰ میں بھی بادشاہ معظم کے نیچے لارڈز اور بیرنز (barons) ہوا کرتے تھے' جو عوام کا خون نچوڑتے تھے۔ انسان نے اس محکومی سے اور اس ''تمیز بندہ و آقا فسادِ آدمیت'' سے نکلنے کے لیے چھلانگ لگائی اور اس کے لیے بڑی محنت کی۔ بادشاہوں کے خدائی حقوق (Divine Rights of the Kings) اور جاگیرداروں کے تسلط سے آزادی حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ انسان نے اس کے لیے بڑی محنت کی' قربانیاں دیں' تب جا کر آزادی حاصل ہوئی اور پھر جمہوریت آئی۔ آزادی کا سورج طلوع ہوا' لیکن اس آزادی نے اقتصادیات کے راستے سے سرمایہ داری (capitalism) کی شکل اختیار کر لی اور پھر آزادی ختم ہو گئی' بایں معنی کہ پہلے جاگیردار مسلّط تھا اب سرمایہ دار مسلط ہو گیا۔ اس طرح آزادی کی چڑیا پھر بھی ہاتھ نہ آئی۔ اسی کے ردِّ عمل کے طور پر کمیونزم نے آزادی کے حصول اور اس سرمایہ دارانہ نظام کی لعنت سے نجات پانے کے لیے چھلانگ لگائی۔ ان کو تھوڑی بہت کامیابی ملی اور کسی درجے میں اس سرمایہ داری کی لعنت سے نجات مل گئی' لیکن پارٹی ڈکٹیٹر شپ اور یک جماعتی ریاست (totalitarian state) سے وہ آزادی کی چڑیا پھر ہاتھ سے نکل گئی۔ یہ اس پورے افراط و تفریط کے دھکوں کے سفر کا خلاصہ ہے جس سے پوری نوعِ انسانی گزری ہے۔

ہمارے ہاں آزادی کا یہ سفر ابھی چل رہا ہے۔ مَیں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ نظریۂ ارتقاء کی رو سے نوعِ انسانی کا ''unicellular organism'' سے ''homo sapiens'' تک کا جو سفر لاکھوں کروڑوں سالوں میں طے ہوا ہے' رحمِ مادر

میں وہی سفر نو مہینے میں طے ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ پورا پراسیس جو یورپ اور مغرب میں صدیوں میں طے ہوا' اب ہمارے ہاں جس کو آپ ''تیسری دنیا'' (third world) کہتے ہیں' وہی سفر چند سالوں کے اندر طے ہو رہا ہے۔ ہم بھی اسی مرحلے سے گزر رہے ہیں' ہمارے ہاں بھی جاگیرداری اور وڈیرہ شاہی نظام اب ٹوٹ پھوٹ رہا ہے اور اس کی جگہ پر جمہوریت اُبھر رہی ہے' اور پھر جمہوریت کی اگلی منزل وہی آزادی و مساوات کا نقطۂ اعتدال ہے جو اسلامی نظام کا مرکزی خیال ہے۔ اس پراسیس کو اگر آپ نے اسلام کے رُخ کی طرف نہ موڑا تو پھر آپ کا سفر بھی مغرب کی طرح طویل ہوتا جائے گا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں ابھی تک اسلامی معیشت کی طرف رُخ کی تبدیلی کا معاملہ کہیں ہو نہیں پایا۔ یہ ہمارے ذہنوں میں' ہماری تحریروں میں' ہمارے دعووں میں' ہمارے مقالات میں اور ہمارے نعروں میں تو ہے' لیکن زمین پر کسی جگہ بالفعل اس کی حقیقت کا کوئی ظہور موجود نہیں ہے۔

یہاں یہ بات بھی نوٹ کر لیں جو مَیں نے اپنے گزشتہ خطاب ''اسلام کا سماجی اور معاشرتی نظام'' میں بڑے مفصّل اور مدلّل انداز میں بیان کی تھی کہ اگر ہم اسلامی نظام کا مرکزی خیال (basic theme) معیّن کرنا چاہیں تو وہ ہے عدل و قِسط' انفرادی اخلاق میں بھی اور اجتماعی نظام میں بھی۔ یوں سمجھئے کہ اسلام آزادی اور مساوات کے درمیان بھی عدل قائم کرتا ہے تاکہ نہ آزادی اتنی بڑھ جائے کہ مساوات کو بالکل ہڑپ کر جائے اور نہ ہی مساوات کا ہوّا اتنا بڑھ جائے کہ وہ آزادی کو بالکل نگل جائے۔ اسلام کا مرکزی تصوّر عدل ہے اور وہ اس عدل کو زندگی کے ہر گوشہ میں نافذ کرتا ہے۔

اسلام کے نظامِ معیشت کو بیان کرنے سے پہلے ہم قدیم نظامِ معیشت سرمایہ داری اور اشتراکیت کے فرق کو واضح کرتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں ذاتی ملکیت (private ownership) کا تصوّر ہے' جو نہ صرف زیر استعمال اشیاء (articles of use) بلکہ ذرائع پیداوار (means of production) کو بھی محیط ہے۔ جبکہ کمیونزم کا آغاز تو اس عزم سے ہوا تھا کہ انفرادی ملکیت سرے سے ہونی ہی نہیں چاہیے'

سب کچھ قومی ملکیت ہو' لیکن انتہا پر پہنچنے کے بعد رفتہ رفتہ وہ اپنے نشاناتِ قدم پر واپس پلٹے ہیں اور وہ بھی زیر استعمال اشیاء کی ذاتی ملکیت کے قائل ہو گئے ہیں۔ بلکہ وہ تو کچھ اور ترغیب (incentive) بھی دے رہے ہیں' کسی حد تک انٹرسٹ بھی دوبارہ وہاں آ رہا ہے۔ لیکن کمیونزم کا اصل الاصول یہ ہے کہ ذرائع پیداوار (means of production) جن سے نفع حاصل کیا جائے' چاہے وہ کھیت ہو' دکان ہو یا کارخانہ ہو' انفرادی ملکیت میں نہیں' بلکہ قومی ملکیت میں ہوں گے۔

اب اس کا جو نتیجہ نکلتا ہے' اس پر غور کریں۔ انسان کی ایک جبلّت ہے کہ جو شے اُس کی ذاتی ملکیت ہو' اُسے معلوم ہو کہ یہ میری شے ہے وہ اس میں ترقی کے لیے محنت اور کوشش کرتا ہے۔ اس کو آپ ذاتی حوصلہ مندی (personal incentive) کا نام دیتے ہیں کہ میں محنت کر رہا ہوں' بھاگ دوڑ کر رہا ہوں' مجھے اُمید ہے کہ اس سے مَیں جو کچھ بھی حاصل کروں گا وہ میرا ہوگا اور پھر میرے بعد میری اولاد کو بھی منتقل ہو جائے گا۔ چنانچہ انفرادی ملکیت کے تصوّر سے انسان میں کام کرنے کا جذبہ زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ وہ جبلتیں (animal instincts) ہیں جن کو ہمیں تسلیم کرنا چاہیے۔ لہٰذا انفرادی ملکیت میں پیداوار (production) زیادہ ہے' اقتصادی ترقی تیز ہے' البتہ اس کا نتیجہ عدم مساوات کی صورت میں نکلتا ہے اور امیر و غریب کے مابین فرق بڑھتا چلا جاتا ہے۔ سرمایہ داری کا اصول یہ ہے کہ ملازموں کو رکھنے یا فارغ کرنے (hire and fire) کا پورا اختیار سرمایہ دار (capitalist) کے پاس ہونا چاہیے' نہیں تو وہ نظام نہیں چل سکتا۔ یہ جو بیچ بیچ کا نظام ہے اس میں سوائے تصادم کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ سرمایہ دار کہتا ہے کہ میرا کارخانہ ہے' آپ کام کرنا چاہتے ہیں تو مَیں اتنی اُجرت دوں گا۔ آپ اس اجرت پر کام کرنا چاہتے ہیں تو کیجیے اور اگر آپ اپنا کام ٹھیک نہیں کر رہے تو مجھے اختیار ہونا چاہیے کہ مَیں فوراً اسی وقت آپ کو گیٹ سے باہر نکال دوں۔ اس نظام میں یقیناً پیداوار زیادہ ہوگی' لیکن مترفین (haves) اور محرومین (have-nots) کا فرق و تفاوت بڑھتا چلا جائے گا۔

دوسری طرف اگر ہر چیز قومی ملکیت میں ہو تو پیداوار کم ہوگی' کیونکہ آدمی کی ذاتی

ملکیت نہیں ہے، ذاتی مفاد نہیں ہے تو وہ کیوں زیادہ کام کرے؟ وہ تو مارے باندھے کو کام کرے گا۔ اس کے اوپر سپرویژن ہوگی یا کوئی کم از کم معیار مقرر کر دیا جائے گا کہ اس سے کم کام کیا تو جرمانہ یا سزا ہوگی، تو جرمانہ یا سزا کے خوف سے تو کام کرے گا، لیکن خود اس میں جذبہ نہیں اُبھرے گا کہ وہ زیادہ محنت اور مشقت کرے، تاکہ زیادہ پیداوار ہو۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس قومی ملکیت کے تصوّر میں haves and have-nots کا فرق و تفاوت بہت کم ہوگا جو سرمایہ دارانہ نظام میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصدقہ اَعداد و شمار کے حوالے سے اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ زرعی رقبہ اشتراکیت کے علمبردار روس کے پاس زیادہ ہے لیکن پیداوار سرمایہ دارانہ نظام کے علمبردار امریکہ میں زیادہ ہوتی ہے۔ امریکہ غذائی اجناس برآمد کرتا ہے جبکہ روس درآمد کرتا ہے۔ اگرچہ سائنسی تحقیق کے میدان میں تو روس نے کندھے سے کندھا ملا رکھا ہے لیکن باقی ہر میدان میں اور خاص طور پر معیشت میں اس کا برا حال ہے۔ تو یہ درحقیقت سرمایہ داری اور اشتراکیت کا منطقی نتیجہ ہے۔ ان دونوں نظاموں کے اس فرق کو سمجھ کر ہمیں اسلام کے معاشی و اقتصادی نظام کو سمجھنے کی طرف آگے بڑھنا ہوگا۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت میں مماثلت

ان نظاموں کے حوالے سے ایک بنیادی بات اور سمجھ لیں کہ یہ دونوں نظام اگرچہ اقتصادی طور پر ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں، لیکن بعض چیزیں ان میں قدرِ مشترک کے طور پر بھی موجود ہیں۔

(ا) مادّہ پرستی: ان نظاموں کی نظریاتی اور فکری اساس ایک ہی ہے، یعنی مادہ پرستی اور سیکولرزم۔ یہ مادّیت (materialism) ہی تھی جس نے ایک قدم اور آگے بڑھا کر جدلی مادّیت (dialectical materialism) کی شکل اختیار کر لی۔ مادہ پرستی کی اس آخری منطقی انتہا جدلی مادّیت میں مذہب، اخلاقیات اور روحانیت کا سرے سے انکارِ محض ہے، جبکہ مادیت بھی بہرحال انسانی زندگی میں یہ دو خانے ضرور بنا دیتی ہے کہ مذہب کو اپنی ذات کی حد تک رکھو، جو چاہو عقیدہ رکھو، جس چیز کو چاہو پوجو۔ سماجی رسومات

(social customs) کی حد تک بھی تمہیں تھوڑی بہت آزادی ہے' جبکہ باقی پوری اجتماعی زندگی سے مذہب کا کوئی تعلق نہیں۔ گویا مذہب اگر وہاں ہے بھی تو برائے نام اور ایک علامت (symbol) کی حیثیت سے' اس سے زیادہ نہیں۔ ان دونوں نظاموں میں درحقیقت دین' مذہب' خدا یا کسی خالقِ کائنات اور مدبّرِ کائنات کا کوئی تصوّر' کسی آسمانی ہدایت کا کوئی تصوّر' سرے سے خارج از بحث ہے۔

(۲) جمہوریت: دوسری چیز جو ان دونوں کے نزدیک متفق علیہ ہے وہ جمہوریت ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ ہے کہ ہمارا جمہوری (democratic) نظام ہے' چاہے انہوں نے یک جماعتی نظام کی جمہوریت اختیار کی ہے یا دو جماعتی نظام کی' چاہے وہ جمہوریت صدارتی نظام کی ہو یا وفاقی نظام کی۔ اس ضمن میں یونین آف سوویت سوشلسٹ ری پبلک (USSR) کو بھی حالات کے جبر کے تحت کچھ آگے بڑھنے پر مجبور ہونا پڑ گیا ہے۔ ☆

یہ دونوں چیزیں ان میں قدرِ مشترک کے طور پر موجود ہیں' فرق صرف کیفیت کا (qualitative) ہے۔ جمہوریت' انسانی حاکمیت اور انسانی خود مختاری کا تصوّر ان دونوں کے ہاں ہے' پھر یہ کہ مذہب کی کوئی علامتی حیثیت ہو تو ہو لیکن ان کے ہاں اصل شے مادیت ہے اور ان کے نزدیک کائنات کی اساس مادہ ہے۔ آپ یوں کہہ لیجیے کہ ان دونوں نظاموں کی بنیاد اور اساس ایک ہے اور فرق صرف واجبی سا ہے۔ باقی یہ دونوں ''اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ'' کا مصداق ہیں — کفر کے کتنے بھی رنگ (shades) اور کتنی ہی مختلف صورتیں ہوں وہ درحقیقت ایک ہی شے اور ایک ہی ملّت ہے۔ یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ اسلام کا معاملہ ان دونوں سے بنیادی طور پر جدا ہے۔ اسی لیے ہم نے ''اسلام کا نظامِ حیات'' کے موضوع پر سلسلہ وار خطابات کا آغاز ایک تمہیدی خطاب ''اسلامی نظام کی نظریاتی اساس: ایمان'' سے کیا تھا۔ اب مَیں چاہتا ہوں کہ اس تمہید کے پسِ منظر میں سمجھا جائے کہ ''اسلام کا معاشی اور اقتصادی نظام'' ہے کیا!

☆ واضح رہے کہ یہ خطاب سوویت یونین کی تحلیل سے پہلے کا ہے۔

اسلام کے دو معاشی نظام

اسلام کے معاشی نظام کے ضمن میں پہلی بات جو مَیں عرض کر رہا ہوں وہ آپ میں سے اکثر حضرات کے علم میں ہوگی' لیکن شاید یہ اندازِ تعبیر کسی اور نے اختیار نہ کیا ہو۔ مَیں یہ اندازِ تعبیر' بات کو سمجھانے کے لیے اور چونکانے کے لیے استعمال کر رہا ہوں تاکہ ذہن بیدار ہو جائیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس سے بہت بڑی الجھنیں (confusions) حل ہو جاتی ہیں۔ وہ یہ ہے کہ اسلام کا اقتصادی نظام ایک نہیں دو ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ از ابتدا تا انتہا مکمل ہیں۔ دونوں کا اپنا اپنا فلسفہ ہے' دونوں کا مختلف نظریۂ ملکیت' نظریۂ حقوق اور نظریۂ قدرِ زائد (surplus value) ہے اور یہ تمام چیزیں کسی بھی معاشی نظام میں بنیادی اہمیت کی حامل ہوا کرتی ہیں۔ چنانچہ اسلام کا ایک اقتصادی تصوّر ایمان کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے اور یہ بات ذہن میں مستحضر رہے کہ یہ ایمانِ حقیقی ہے' نہ کہ ایمانِ قانونی' جس پر ہم گزشتہ خطابات میں تفصیل سے گفتگو کر آئے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ اسلام کا ایک ایمانی' اخلاقی' روحانی یا احسانی نظامِ معیشت ہے اور دوسرا اسلام کا قانونی اور فقہی نظامِ معیشت ہے۔ ان دونوں میں خاصا فرق و تفاوت ہی نہیں بلکہ تضاد بھی موجود ہے۔

بہرحال یہ ایک اندازِ تعبیر ہے۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی نظام کے دو رُخ یا دو پہلو ہیں' اور یہ دونوں بہت حد تک ایک دوسرے پر منحصر (interdependent) بھی ہیں اور باہم مربوط (interconnected) بھی۔ اور اسلام کی اصل برکات و ثمرات کا کامل ظہور ان دونوں کے اتصال و اجتماع ہی سے ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ کہنا ہرگز غلط نہ ہوگا کہ اگر ان میں سے ایک پہلو نگاہوں سے اوجھل رہ جائے اور توجّہ صرف ایک ہی پر مرتکز ہو جائے تو اس سے جو تصویر سامنے آئے گی وہ بہت بعید از حقیقت ہوگی۔ ان دونوں کے تقاضے بسا اوقات مختلف ہی نہیں متضاد ہوتے ہیں' تاہم ان دونوں کے امتزاج ہی سے اسلام کا کامل نظامِ معیشت وجود میں آتا ہے۔ آپ چاہیں تو ان دونوں پہلوؤں کو ''دعویٰ'' (thesis) اور ''جوابِ دعویٰ'' (anti-thesis) سے تعبیر فرما لیں اور اسلام کے مجموعی اقتصادی نظام کو ان دونوں کا امتزاج (synthesis) قرار دے لیں۔

بہر حال ان کے وجود سے انکار ممکن نہیں ہے!

اسلام کی قانونی اور اخلاقی تعلیمات میں فرق: اسلام کی قانونی اور اخلاقی تعلیمات کے مابین جو فرق و تفاوت بہت سے معاملات میں موجود ہے' اس کے لیے مَیں ایک سادہ سی مثال قصاص اور عفو کی پیش کیا کرتا ہوں۔ دونوں اعلیٰ اخلاقی اقدار ہیں۔ فرض کیجیے کسی شخص نے آپ پر ظلم کیا' زیادتی کی اور آپ کو تھپڑ بھی مارا۔ اب اگر آپ مجبور ہیں' بدلہ نہیں لے سکتے تو ظاہر بات ہے کہ ''قہرِ درویش بر جانِ درویش'' کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس صورت میں آپ نے صبر کیا ہے تو اس میں کوئی روحانی ترفّع' کوئی اخلاقی بلندی نہیں ہے۔ اور اگر آپ بدلہ لینے پر قادر ہیں لیکن آپ معاف کر دیتے ہیں تو اس معاف کرنے سے آپ کے اندر ایک روحانی ترفّع پیدا ہوگا' آپ کو روحانی ترقی نصیب ہوگی۔ یہ اسلام کا اخلاقی اور روحانی نظام ہے جو عفو و درگزر کی تلقین کرتا ہے:

﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝۴۳﴾ (الشوریٰ)

''البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے تو بے شک یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔''

دوسری جانب اسلام کا قانونی اور فقہی نظام ہے جو بدلے اور قصاص کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ آپ بدلہ لینا چاہتے ہیں تو بدلہ لیں' تھپڑ کا جواب تھپڑ سے دیں:

﴿وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ﴾ (المائدۃ:۴۵)

''اور ہم نے لکھ دیا تھا ان پر اس (تورات) میں کہ جان کے بدلے جان' آنکھ کے بدلے آنکھ' ناک کے بدلے ناک' کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں کا بدلہ ان کے برابر زخم۔''

قصاص کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا گیا: ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ (البقرۃ:۱۷۹) ''اے ہوشمندو! قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے۔''

عفو اور قصاص دونوں ہی اعلیٰ اخلاقی اقدار ہیں۔ عفو میں انفرادی اعتبار سے روحانی ترقی ہے اور قصاص میں اس دُنیا کے نظام کی درستگی ہے۔ اگر سبھی عفو کرنے لگ جائیں تو

نتیجہ یہ نکلے گا کہ مجرموں' ظالموں اور شریروں کی حوصلہ افزائی ہوگی' وہ اور کھل کھیلیں گے۔ ایک شخص نے آج آپ کو تھپڑ مارا ہے' کل کسی اور کو مارے گا' لیکن اگر اس کو جوابی تھپڑ مل گیا تو اس کے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔ اسلام کا پورا نظامِ حدود و تعزیرات اسی بنیاد پر ہے کہ جرائم اور مظالم کی حوصلہ افزائی نہیں بلکہ روک تھام کرنی ہے تاکہ مجرموں کے ہوش ٹھکانے آ جائیں۔ اسلام نے اس قسم کی سزائیں تجویز کی ہیں کہ ایک آدمی کو سزا ملے اور ہزاروں کے اوپر لرزہ طاری ہو جائے' اس لیے کہ اس کے بغیر معاشرہ درست نہیں ہوگا۔ اب عفو روحانی انفرادی ترقی کے اعتبار سے اعلیٰ قدر ہے اور قصاص اس پورے دنیوی انتظامی معاملات کو درست رکھنے کے لیے اعلیٰ قدر ہے۔ بظاہر عفو و قصاص ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ انسانی معاشرہ ان دونوں میں سے صرف ایک پر استوار ہو سکتا ہے۔ دونوں اپنے اپنے مقام پر لازم اور ناگزیر ہیں اور حسن معاشرت ان دونوں کے امتزاج سے وجود میں آتا ہے۔

اس پر قیاس کر کے سمجھ لیجیے کہ اسلام کے معاشی نظام کے بھی دو پہلو ہیں' چنانچہ ایک جانب اسلام کا قانونی اور فقہی نظامِ معیشت ہے جس کے بارے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ ایک نوع کی محدود سرمایہ داری (controlled capitalism) ہے' اس لیے کہ اس میں انفرادی سرمایہ کاری کی اجازت موجود ہے' اگرچہ اسے ''سرمایہ دارانہ نظام'' بننے سے بعض تحدیدی اقدامات نے روک دیا ہے —— دوسری طرف اسلام کا روحانی اور اخلاقی نظامِ معیشت ہے' جس کے بارے میں مَیں پورے انشراحِ صدر سے عرض کرتا ہوں کہ وہ نہایت اعلیٰ قسم کی روحانی اشتراکیت (spiritual socialism) ہے اور ایسا کامل ''سوشلزم'' ہے کہ اس کے آگے کا تصوّر بھی ممکن نہیں ہے۔

اسلام کے روحانی معاشی نظام کے چار اصول

اسلام کے روحانی معاشی نظام کے چار اصول ہیں جنہیں اچھی طرح ذہن میں مستحضر کر لینا چاہیے:

(i) انسانی ملکیت کی مطلق نفی: اسلام کے روحانی معاشی نظام کا سب سے پہلا اور اہم

اصول یہ ہے کہ انسان کسی شے کا مالک نہیں ہے' حتیٰ کہ وہ خود اپنا اور اپنے وجود کا مالک بھی نہیں ہے۔ اس کے اعضاء' ہاتھ پاؤں' جسم و جان اور اس کی کُل توانائیاں سب اللہ کی ملکیت ہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ مَیں ان کا امین ہوں۔ یہ سب کچھ اس کے پاس امانت ہے جبکہ ملکیت تو صرف اللہ کی ہے۔ قرآن پاک میں بار بار یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ اور ﴿لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس سب کا مالک صرف اللہ ہے۔

اسلام کے سیاسی نظام پر گفتگو کرتے ہوئے مَیں نے تفصیل سے بیان کیا تھا کہ حاکمیت صرف اللہ کے لیے ہے جبکہ انسان کے لیے خلافت ہے۔ اللہ کے علاوہ کسی اور کے لیے حاکمیتِ مطلقہ تسلیم کرنا کفر ہے' شرک ہے۔ اللہ کی حاکمیتِ مطلقہ کا منطقی نتیجہ انسان کی خلافت کی صورت میں نکلتا ہے۔ بالکل اسی طرح اسلام کے روحانی معاشی نظام میں بھی ملکیتِ مطلقہ اللہ کی ہے اور انسان کی حیثیت امین کی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام کے حوالے سے یہ تصوّر تو خاصا عام ہو گیا ہے اور سب کو معلوم ہے کہ اسلام میں حاکمیتِ مطلقہ اللہ کی ہے اور انسان کے لیے خلافت ہے' جبکہ اسلام کے معاشی نظام کے حوالے سے یہ پہلو بدقسمتی سے ابھی بہت مخفی ہے کہ حقیقتاً ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہے جبکہ انسان کو صرف ملکیتِ مجازی حاصل ہے' یعنی انسان کو ان اشیاء میں حقِّ تصرّف (صرف استعمال کرنے کا حق) حاصل ہے اور یہ حقِّ تصرّف وراثتاً منتقل بھی ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے لیے حقیقتاً ملکیت کا تصوّر کفر اور شرک ہے۔ مالک صرف اللہ ہے اور انسان زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ مَیں اس مال کا امین ہوں۔ بقولِ اقبال ع ''بندۂ مؤمن امیں حق مالک است!'' اور بقولِ شیخ سعدیؒ ؎

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست　　درحقیقت مالکِ ہر شے خدا ست

اقبال نے اس کی بہت صحیح تعبیر کی ہے ؎

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست　　ایں متاعِ بندہ و مِلکِ خدا ست

اسی طرح اقبال کا جو شعر مَیں نے ابتدا میں آپ کو سنایا تھا ؎

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں!

یعنی کسی کی ملکیت نہیں، نہ تمہاری ملکیت نہ بادشاہ کی ملکیت، جیسے نہ تمہاری حاکمیت ہے نہ بادشاہ کی اور نہ فردِ واحد کی ـــــ لہٰذا ملوکیت بھی کفر و شرک ہے اور اجتماعی حاکمیت بھی۔ اسی طرح ملکیت بھی نہ تمہاری ہے نہ قوم کی۔ یعنی قومی ملکیت بھی نہیں ہے، ریاست کی ملکیت بھی نہیں ہے، ملکیت صرف اور صرف اللہ کی ہے۔

(۲) انسان کی کمائی کسب نہیں، فضلِ خداوندی ہے: روحانی معاشی نظام کا دوسرا اصول ایک بہت اہم ایمانی حقیقت ہے کہ جو کچھ انسان کو اس دنیا میں ملتا ہے وہ اس کی کمائی، اس کا کسب نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ گو انسان نے اس کے لیے محنت کی ہے، ہل چلایا ہے، بیج ڈالا ہے، کھیتی کو سینچا ہے، فصل کو کاٹا ہے، غلّہ گھر میں لے کر آیا ہے، دُکان میں بیٹھ کر یا کارخانے میں محنت کی ہے، الغرض محنت اُس نے کی ہے، لیکن ایمان کا تقاضا ہے کہ جو تمہیں ملا ہے اس کو اپنا کسب نہیں بلکہ اللہ کا فضل سمجھو۔ رزق کے لیے قرآن مجید کی اصل اصطلاح ''فضل'' ہے۔ صرف ایک جگہ رزق کے لیے یعنی دُنیاوی معاشی جِدّ و جُہد اور کوشش کے لیے ''کسب'' کا لفظ آیا ہے، ورنہ قرآن مجید میں کسب صرف اعمالِ حسنہ یا اعمالِ سیئہ کے لیے آتا ہے۔ اسلام کے عائلی اور معاشرتی نظام کے ضمن میں ایک آیت آئی تھی: ﴿لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ﴾ (النساء:۳۲) یہاں کسب سے مراد معاشی کسب نہیں بلکہ نیکی کا کسب ہے۔ اسی طرح: ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۗ﴾ (البقرۃ:۲۸۶) میں بھی اعمالِ حسنہ اور اعمالِ سیئہ کے لیے کسب کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

معاشی جِدّ و جُہد کے لیے قرآنی اصطلاح کسب نہیں فضل ہے اور فضل اسے کہتے ہیں جو بلا استحقاق ملے۔ لہٰذا اللہ نے جو کچھ تمہیں دیا ہے، یہ اللہ کا فضل ہے۔ اس کے لیے سب سے آسان اور لوگوں کے ذہنوں میں پہلے سے موجود یہ آیت حوالے کے لیے کافی ہے: ﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ

اللہِ﴾ (الجمعۃ:۱۰) ''پھر جب تم فارغ ہو جاؤ نماز سے (یعنی نماز ادا کر چکو) تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو''۔ اگر انسان اپنی کمائی کو اپنی محنت کا ثمرہ سمجھے گا تو اس پر اپنا حقِ ملکیت جتائے گا' لیکن اگر اسے اللہ کا فضل سمجھے گا تو اس میں تصرّف بھی اصل مالک اور عطا کنندہ کی مرضی کے مطابق کرے گا۔

(۳) فضلِ خداوندی میں انسان کا جائز حق بقدرِ ضرورت ہے: تیسرا اصول یہ ہے کہ اس فضلِ خداوندی میں انسان کا جائز حق صرف اُس کی ضروریات کے بقدر ہے' اور ان بنیادی انسانی ضرورتوں کو بھی بعض احادیث میں معیّن کر دیا گیا ہے۔ یعنی (ا) انسان کو اگر دو وقت کا کھانا مل گیا ہے۔ (ب) پہننے کے لیے اگر دو جوڑے کپڑوں کے موجود ہیں۔ (ج) سر چھپانے کے لیے اگر ایک چھت موجود ہے۔ (د) اور اپنے کردار' اخلاق اور عفت کی حفاظت کے لیے اگر بیوی بھی موجود ہے (اور بیوی کے لیے شوہر موجود ہے) تو انسان کو اس کا بنیادی حق مل گیا۔ یہ انسان کی کُل ضروریاتِ زندگی ہیں جو اس کو اس دنیا کے اندر درکار ہیں۔ مرزا عبدالقادر بیدل کا بڑا پیارا شعر ہے' جو اورنگ زیب عالمگیر کو بہت پسند تھا اور وہ ہر وقت پڑھتے رہتے تھے۔

حرص قانع نیست بیدلؔ ورنہ در کارِ حیات
آنچہ ما در کار داریم اکثرش درکار نیست!

یعنی یہ تو ہماری حرص ہے جو ہمیں قناعت نہیں کرنے دیتی' ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے جن چیزوں کو اپنے لیے دنیا کی زندگی میں لوازمات اور ضروریات کی فہرست میں شمار کر لیا ہے' ان میں سے اکثر ضروریاتِ زندگی نہیں ہیں۔ بہرحال تیسرا اصول یہ ہے کہ انسان کا اصل حق صرف اس کی ضروریات کی حد تک ہے۔

(۴) ضروریات سے زائد دوسروں کا حق ہے: انسانی ضرورت سے جو کچھ زائد ہے اس کے بارے میں اخلاقی اور روحانی سطح پر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ وہ خواہ قانونی اعتبار سے تمہارا ہے' لیکن حقیقت کے اعتبار سے تمہارا نہیں دوسروں کا حق ہے' جو تمہارے مال میں رکھ کر تمہیں آزمایا جا رہا ہے۔ یہ تمہارے پاس امانت ہے اور اس میں تمہارا امتحان

ہے کہ تم یہ امانت دوسروں تک پہنچا کر سبکدوش ہوتے ہو یا اس پر قبضۂ غاصبانہ جما کر بیٹھے رہتے ہو اور ''مَالِیْ مَالِیْ'' (میرا مال' میرا مال) کی رٹ لگائے رکھتے ہو۔ یہ حدیث کے الفاظ ہیں۔ پوری حدیث اس طرح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((یَقُوْلُ الْعَبْدُ : مَالِیْ مَالِیْ' وَاِنَّ مَالَهٗ مِنْ مَالِهٖ ثَلَاثٌ : مَا اَکَلَ فَاَفْنٰی اَوْ لَبِسَ فَاَبْلٰی اَوْ اَعْطٰی فَاَقْتْنٰی' وَمَا سِوٰی ذٰلِکَ فَهُوَ ذَاهِبٌ وَتَارِکُهٗ لِلنَّاسِ))(۱)

''بندہ کہتا رہتا ہے کہ میرا مال' میرا مال! اور حقیقت یہ ہے کہ اس کو اس مال و دولت میں سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ فی الجملہ تین چیزیں ہیں: ایک وہ چیز جس کو اس نے کھا کر ختم کر دیا' دوسری وہ چیز جس کو اس نے پہن کر بوسیدہ کر دیا اور تیسری وہ چیز جس کو اُس نے (اللہ کی راہ میں) دیا اور (آخرت کے لیے) ذخیرہ کر لیا۔ ان تینوں کے سوا جو کچھ ہے اس کو وہ لوگوں کے لیے چھوڑ کر (اس دُنیا سے) چلا جانے والا ہے۔''

قرآن حکیم نے بھی واضح الفاظ میں فرمایا کہ یہ جو عفو (زائد مال) تمہارے ساتھ چمٹا ہے یہی نجاست ہے' یہی روح کے لیے سب سے بڑی گندگی ہے' اور یہی تمہارے روحانی ارتقاء کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اسے خرچ کر کے اپنے آپ سے دور کر دو۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ آخر کہاں تک خرچ کریں' اس کی حد کیا ہے؟ تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَیَسْئَلُوْنَکَ مَا ذَا یُنْفِقُوْنَ ط قُلِ الْعَفْوَ ط﴾ (البقرۃ:۲۱۸) ''اور یہ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کتنا خرچ کریں۔ کہہ دیجیے' جو بھی ضرورت سے زائد ہو''۔ یعنی جو بھی ضرورت سے زائد ہے اسے دے ڈالو اور کوئی شے بھی اپنے پاس ضرورت سے زیادہ نہ رکھو۔

اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام معیشت کے مذکورہ بالا چار بنیادی اصول اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے۔

اسلام کا روحانی و اخلاقی نظامِ معیشت: ایک مکمل معاشی نظام

اسلام کا روحانی و اخلاقی نظامِ معیشت ایک مکمل معاشی نظام ہے۔ اس میں ملکیت

(۱) صحیح مسلم' کتاب الزھد والرقائق۔ عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ۔

اور قدرِ زائد کا اپنا جداگانہ تصور ہے اور اس قدرِ زائد کا مصرف بھی طے شدہ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے خود اسی اخلاقی نظام کے مطابق زندگی بسر کی ہے۔ چنانچہ یہ بات بہت سے لوگوں کے لیے حیران کن ہوگی کہ نبی اکرم ﷺ نے تمام عمر ''زکوٰۃ'' ادا نہیں کی۔ اس لیے کہ زکوٰۃ تو صاحبِ نصاب پر عائد ہوتی ہے جبکہ آپ ﷺ نے کبھی کوئی درہم و دینار اپنے پاس رکھا ہی نہیں کہ زکوٰۃ کی نوبت آتی۔

مَیں نے ایک صاحب کو ذرا روکھے (crude) انداز میں سمجھایا تھا کہ ایک ہے زکاتی دین' کہ آپ حلال ذریعے سے کمائیں' پھر جو جمع ہو گیا اس میں سے صرف زکوٰۃ دے دیں' باقی جو بچ جائے وہ آپ کا ہے' آپ اس کو کھائیں' پئیں' عیش کریں' جمع کریں — لیکن یہ بات یاد رکھیے کہ اس زکاتی دین پر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے عمل نہیں کیا۔ وہ چونک گئے اور میرا یہ انداز بھی چونکانے کے لیے تھا تاکہ بات سمجھ آ جائے۔ جیسے حضور ﷺ پوچھا کرتے تھے: ((اَتَدْرُوْنَ مَنِ الْمُفْلِسُ؟)) ''تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہوتا ہے؟'' حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ مفلس کسے کہتے ہیں' لیکن یہ انداز چونکانے کے لیے ہے تاکہ لوگ غور کریں اور پھر سمجھیں۔ مَیں نے بھی اس شخص سے کہا کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے اس زکاتی دین پر عمل نہیں کیا' اس لیے کہ زکوٰۃ تو تب واجب الادا ہو گی جب کچھ مال جمع ہو گا' جب مال ہی جمع نہیں ہو گا تو زکوٰۃ کہاں فرض ہو گی؟ گویا محمد رسول اللہ ﷺ نے ساری عمر زکوٰۃ ادا نہیں کی' اسلام کے ایک رکن پر عمل نہیں ہوا' لیکن دوسری طرف ہر دم زکوٰۃ ادا کی ہے۔ وہ زکوٰۃ اور ہے — مَیں نے ابتدا میں سورۃ المؤمنون کی ایک آیت تلاوت کی تھی: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝۴﴾ (المؤمنون) ''اور وہ جو زکوٰۃ پر مستقل کاربند رہتے ہیں''۔ رسول اللہ ﷺ یہ زکوٰۃ ہر دم ادا کرتے تھے اور ضرورت سے زائد مال کبھی اپنے پاس نہیں رکھتے تھے۔ آپؐ اس نجاست کو لگنے ہی نہیں دیتے تھے۔ آپ نے وہ واقعہ سنا ہو گا کہ ایک روز نبی اکرم ﷺ فجر کی نماز کے بعد بے چین ہو کر اچانک صفوں کو پھلانگتے ہوئے اپنے حجرے میں تشریف لے گئے۔ لوگ حیران ہوئے' کیونکہ یہ بڑی غیر معمولی بات تھی۔ جب آپؐ واپس آئے تو فرمایا: مجھے

اچانک یاد آیا تھا کہ رات کے وقت کہیں سے سونے کی ایک ڈلی آئی تھی' رات گزر گئی اور مَیں نے وہ تقسیم نہیں کی' بھول گیا۔ اب مجھے خیال آیا تو مَیں نے فوری طور پر جا کر اسے تقسیم کر دیا۔ نبی مکرم ﷺ اپنے رب سے اس کیفیت میں نہیں ملنا چاہتے تھے کہ انہیں اپنے ربّ پر اعتماد نہ ہو۔ مال و دولت اپنے پاس جمع رکھنا اپنے ربّ سے بے اعتمادی ہے۔

یہ اسلام کا روحانی اور اخلاقی نظامِ معیشت ہے اور اسی پر فقراءِ صحابہ رضی اللہ عنہم کاربند تھے۔ ''فقراء صحابہ'' ایک خاص اصطلاح ہے' یعنی وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنہوں نے ''اختیاری فقر'' کے نظام کو عملاً اختیار کیا' جن کے سرخیل حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ تھے۔ بقیہ تمام صحابہؓ (جن کے پاس سرمایہ جمع بھی ہوتا) جو اس فہرست میں نہیں آتے وہ بھی بِالقُوّۃ اسی اصول پر عمل پیرا تھے کہ جب مطالبہ آئے گا سارا مال پیش کر دیں گے۔ جیسے حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر اپنا سب کچھ لا کر دے دیا' حالانکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا شمار فقراءِ صحابہ میں تو نہیں ہے' لیکن آمادگی ہر وقت تھی کہ یہ امانت ہے' جب بھی وقت آئے گا' حاضر کر دیں گے۔ انہوں نے اس مال و دولت کو اپنے دل کے ساتھ چپکایا نہیں تھا۔ چنانچہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور فقراءِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بالفعل جبکہ بقیہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بِالقُوّہ جو دین تھا وہ درحقیقت ''زکاتی دین'' نہیں تھا۔

اسلام کا روحانی نظامِ معیشت' اعلیٰ قسم کی روحانی اشتراکیت

اسلام کے روحانی اور اخلاقی نظامِ معیشت کے ان اصولوں کو جمع کر کے مَیں پورے انشراحِ صدر سے کہوں گا کہ اسلام کا اخلاقی نظامِ معیشت نہایت اعلیٰ اور خالص ترین روحانی اشتراکیت (Highest and purest form of spiritual socialism) ہے۔ یہ ایک ایسا کامل ''سوشلزم'' ہے کہ اس سے بلند تر سوشلزم کا تصوّر ممکن ہی نہیں۔ اس لیے کہ سوشلزم میں تو انسانی ملکیت کا اثبات موجود ہے' اگرچہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی' لیکن اسلام اپنی اخلاقی و روحانی اور صحیح تر الفاظ میں ایمانی تعلیم کی رو سے انسانی ملکیت کی کُلّی نفی کرتا ہے — یعنی نہ انفرادی ملکیت نہ قومی ملکیت' بس ہر چیز اللہ کی ملکیت — معلوم ہوا کہ یہ اعلیٰ قسم کی روحانی اشتراکیت ہے۔ روحانی (spiritual) اس لیے کہ اس میں

جبر نہیں ہے' یعنی اس اخلاقی نظام کی ساری خوبی اور اس کا کُل حسن اس کے ''رضا کارانہ'' (voluntary) ہونے میں مضمر ہے۔ اور اگر ''قُلِ الْعَفْوَ'' کے فلسفے کو ادنیٰ درجے میں بھی بالجبر نافذ کرنے کی کوشش کی گئی تو روح والی بات ختم ہو جائے گی۔ یہ صرف اور صرف انسان کے اپنے اختیار اور اپنی مرضی پر منحصر ہے۔ جیسے جیسے ایمان میں ترقی ہو' جیسے جیسے یقین بڑھے' جیسے جیسے اللہ سے محبّت میں اضافہ ہو' جیسے جیسے آخرت ہی انسان کا مطلوب بنتی چلی جائے اور ''اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشَ الْآخِرَۃ'' پر یقین بڑھتا جائے اور اس حقیقت کا شعور انسان کے قلب و ذہن میں راسخ ہوتا جائے' اتنا ہی وہ اس کے اوپر عمل پیرا ہو جائے۔ اس کے لیے آپ کو کوئی قانون مجبور نہیں کرے گا' کوئی خارجی دباؤ اثر انداز نہیں ہو گا۔ اگر کہیں بھی کسی بھی درجے میں خارجی جبر آ گیا تو اس کی ساری خوبصورتی ختم ہو گئی۔ یہ وہ آبگینہ ہے جو ذرا سی ٹھیس لگنے سے چکنا چور ہو جائے گا۔

اسلام کا قانونی اور فقہی نظامِ معیشت

اس کے بالکل برعکس اسلام کا ایک قانونی اور فقہی نظامِ معیشت ہے۔ اس میں مجازاً انسانی ملکیت کا اثبات ہے۔ یہ گھر آپ کا ہے' یہ سامان آپ کا ہے' یہ کھیت آپ کا ہے' یہ زمین آپ کی ہے' یہ دُکان آپ کی ہے' یہ مال آپ کا ہے یعنی ملکیت تو ہے لیکن مجازاً — اس معنی میں کہ آپ اس کو خود استعمال کریں گے' دوسرا استعمال نہیں کر سکے گا۔ جب دوسرے کو اس کے استعمال سے روک دیا گیا تو یہ ایک طرح کی ملکیت بن گئی۔ مزید برآں یہ وراثتاً بھی منتقل ہو جائے گا' چنانچہ بات ملکیت کے بہت حد تک قریب آ گئی' لیکن ذہن میں ہمیشہ یہ رہنا چاہیے کہ مَیں اس کا مالک نہیں' امین ہوں۔ اسلام میں قانونی سطح پر ملکیت کا اثبات موجود ہے اور نبی اکرم ﷺ نے جو نظام برپا کیا تھا اس میں کہیں جبر نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس آزاد معیشت کے مواقع دیے گئے کہ تم حلال و حرام کی حدود کا خیال رکھتے ہوئے اپنی محنت سے جو کماؤ گے وہ تمہارا ہو گا' اس میں تمہارا حقِ تصرّف تسلیم کیا جائے گا اور اسے وراثتاً منتقل بھی کیا جائے گا۔ اس طرح اس میں سرمایہ دارانہ نظام کے تینوں بنیادی اصول (cardinal principles) آ گئے:

(i) private ownership (نجی ملکیت)

(ii) personal incentive (ذاتی مفاد)

(iii) free enterprise (آزاد معاشی جِدّ و جُہد)

اسلام کے فقہی نظام میں یہ تینوں چیزیں بتمام و کمال موجود ہیں جن کی بنیاد پر آج مغربیت فتح مند ہے۔ البتہ اسلام نے اس قانونی نظام کو بھی ایک حد کے اندر رکھا ہے تاکہ یہ سرمایہ داری کی لعنت کی صورت اختیار کر کے انسانی معاشرے پر مسلّط نہ ہونے پائے۔

اس ضمن میں اسلام نے چند عملی تدابیر اختیار کی ہیں اور کچھ قدغنیں بھی لگائی ہیں۔ اوّلین قدغن تو یہ ہے کہ حرام ذرائع سے نہیں' حلال سے کماؤ گے۔ دوسرے یہ کہ اگر کچھ مال تمہارے پاس جمع ہو گیا تو اس میں سے ایک حد کے بعد کچھ معیّن حصّہ لیا جائے گا اور ان کو دیا جائے گا جو لوگ معاشی میدان میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ یہاں یہ بات نوٹ کر لیں کہ آزاد معاشی جِدّ و جُہد کا معاملہ جہاں بھی ہوگا' چاہے کتنی ہی تھوڑی آزادی ہو' اس میں یقیناً کچھ لوگ آگے نکلیں گے اور کچھ لوگ پیچھے رہ جائیں گے' کچھ اونچ نیچ لازماً پیدا ہوگی۔ مَیں اس کی مثال دیا کرتا ہوں کہ اگر آپ نے لوگوں کو دوڑانا بھی ہے اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ نہ کوئی آگے نکلے اور نہ کوئی پیچھے رہ جائے تو اس کے لیے آپ سب کو ایک رسّی سے باندھ دیجیے۔ اگر آپ رسّی نہیں باندھیں گے تو پھر کوئی نہ کوئی آگے جائے گا اور کوئی نہ کوئی پیچھے رہ جائے گا۔ جہاں کسی نہ کسی درجے میں آزادی ہوگی وہاں معاشی جِدّ و جُہد کی دوڑ میں فرق و تفاوت سے بچنا ممکن نہیں۔ اس دوڑ میں لوگوں کے درمیان فرق بہرصورت آئے گا اور کچھ لوگ آگے نکل جائیں' کچھ لوگ پیچھے رہ جائیں گے۔ اسلام کے قانونی اور فقہی نظامِ معیشت میں اس بات کا بھی اہتمام کیا گیا ہے کہ معاشرے میں پیدا ہونے والے مالی فرق و تفاوت کو کسی حد تک کم کیا جائے۔ اس کے لیے اسلام نے زکوٰۃ کا نظام قائم کیا ہے۔ اسلام کا قانونی اور فقہی نظامِ معیشت ایک نوع کی محدود اور منضبط سرمایہ داری (managed and controlled capitalism) ہے' جیسے مَیں نے اس کے روحانی نظام کے بارے میں کہا تھا کہ وہ نہایت اعلیٰ اور خالص ترین روحانی اشتراکیت ہے۔

اسلام کے روحانی اور قانونی نظامِ معیشت میں ظاہری تفاوت

اسلام کے نظامِ معیشت میں ایک طرف روحانی اعتبار سے اشتراکیت موجود ہے اور دوسری طرف قانونی اعتبار سے سرمایہ داری۔ اس اعتبار سے ہمارے ہاں بڑا کنفیوژن پایا جاتا ہے کہ یہ دونوں تعلیمات اسلام میں بیک وقت موجود ہیں۔ ایک طرف ''قُلِ الْعَفْوَ'' کا فلسفہ ہے کہ جتنا ضرورت سے زائد ہے اسے اللہ کی راہ میں دے ڈالو اور دوسری طرف قانونِ وراثت بھی اسی قرآن میں موجود ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کچھ رکھنا ہی نہیں ہے تو وراثت کس شے کی ہوگی؟ تو یہ ایک طرح کا ظاہری تضاد (contradiction) ہے ـــــ ایک طرف سورۃ التوبہ کی آیت ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝﴾

''جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے دیجیے۔ اُس دن ان (سونا اور چاندی) کو جہنّم کی آگ میں تپایا جائے گا' پھر ان سے ان کی پیشانیاں' ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی (اور کہا جائے گا:) یہ ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا' تو جو کچھ تم جمع کرتے رہے (آج) اس کا مزا چکھو۔''

اب سونا تو سونا ہے چاہے کسی نے ایک تولہ ہی گھر کے اندر رکھا ہوا ہے۔ جبکہ دوسری طرف نصابِ زکوٰۃ معیّن کیا گیا ہے کہ ساڑھے سات تولے سونے کی زکوٰۃ کی فرضیت کا حکم ہے اور سورۃ النساء کا ایک پورا رکوع قانونِ وراثت سے متعلق ہے۔ اس اعتبار سے اسلامی تعلیمات میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے۔ اس ظاہری تضاد کی بنیاد پر سوشلسٹ ذہن رکھنے والے حضرات اسلام کے نظامِ معیشت کو کامل سوشلزم سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کے دوسرے پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ اسے کامل سرمایہ دارانہ نظام قرار دیتے ہیں اور اس میں موجود ''روحانی اشتراکیت'' کی سرے سے نفی کر دیتے ہیں۔

اس ظاہری تضاد کی بنا پر پورے خلوص کے ساتھ محض غلط فہمی کی بنیاد پر بھی مغالطہ لاحق ہوسکتا ہے' جس کی سب سے بڑی مثال صحابیٔ رسول حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی ہے۔ اتنے متقی' اتنے مخلص اور اتنے زاہد انسان کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا:

((مَنْ سَرَّهُ اَنْ يَنْظُرَ اِلٰى تَوَاضُعِ عِيْسٰى فَلْيَنْظُرْ اِلٰى اَبِيْ ذَرٍّ)) (۲)

''جو شخص یہ پسند کرے کہ حضرت عیسیٰؑ کی عاجزی و انکساری اپنی آنکھوں سے دیکھے تو وہ ابوذر کو دیکھ لے۔''

ان کو بھی اس ظاہری تضاد کی بنا پر ایک مغالطہ ہو گیا۔ ان کے مزاج میں غلبۂ زہد و ورع' دُنیا سے کنارہ کشی اور لذّاتِ دُنیاوی سے بالکل لاتعلقی اس شدّت کے ساتھ تھی کہ انہوں نے آیتِ کنز کو بالکل اس کے ظاہری الفاظ پر محمول کرتے ہوئے یہ رائے قائم کر لی کہ سرے سے اپنے پاس پیسہ رکھنا حرام ہے اور کسی بھی مقدار میں سونا چاندی اپنے پاس رکھنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے' اس لیے کہ اس پر عذابِ الیم کی وعید ہے۔ یہ معاملہ اتنا بلند ہوا کہ ایک شورش کی شکل بن گئی' ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ دُنیا کا نظام چونکہ قانون پر چلتا ہے نہ کہ روحانیت پر' لہٰذا خلافتِ راشدہ کا جو اجتماعی فیصلہ تھا وہ بالکل صحیح تھا کہ اس آیت کا یہ مفہوم نہیں ہے' یہ آپ غلط تعبیر کر رہے ہیں۔ لیکن وہ اپنی رائے پر بضد رہے تو ان کی رائے کو انتہا پسندانہ موقف قرار دیا گیا اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں انہیں مدینہ سے باہر چلے جانے کی ہدایت بھی کی گئی یا وہ خود چلے گئے۔ لہٰذا انہوں نے ایک بیابان میں جھونپڑی ڈالی اور وہیں اُن کا انتقال ہوا۔

آیات کی غلط تعبیر کی ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے۔ یہ معاملہ بھی عین دورِ صحابہؓ میں شروع ہو چکا تھا۔ حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ نے ایک خطبہ دیا: لوگو مَیں دیکھ رہا ہوں کہ تم یہ آیت پڑھتے ہو اور اس کے غلط معانی نکال رہے ہو: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۭ﴾ (المائدۃ:۱۰۵) ''اے ایمان والو! تم پر صرف اپنی ہی ذمہ داری ہے' جو کوئی گمراہ ہو جائے وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اگر تم ہدایت پر ہو''۔ تم اس کے یہ معانی نکال رہے ہو کہ دعوت و تبلیغ اور

(۲) الجامع الصغیر للسیوطی : ح ۸۷۴۸۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے؟ اس آیت کا یہ مفہوم نہیں ہے' یہ غلط تعبیر ہے۔ اسی طرح آیتِ کنز کے معاملہ میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو مغالطہ ہوا اور اسلام کے روحانی اور قانونی نظام کے مابین جو فرق وتمیز کرنی چاہیے تھی' وہ اپنی ایک خاص زاہدانہ کیفیت میں اس تمیز کو برقرار نہ رکھ سکے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے کسی بدنیتی سے یہ رائے قائم کر لی تھی۔ اس لیے مَیں کہہ رہا ہوں کہ اس معاملے میں مغالطہ خالص نیک نیتی کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔ اگر ابوذر رضی اللہ عنہ کو ہو گیا تو تا بہ دیگراں چہ رسد!

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے معاملے کو اس دَور میں کچھ لوگوں نے کمیونزم اور سوشلزم کی دلیل بنانے کے لیے بڑی بدنیتی کے ساتھ بھی استعمال کیا ہے۔ انہیں قرآن کی یہ آیتیں تو نظر آ گئیں کہ اسلام انسانی ملکیت کی کُلّی نفی کرتا ہے اور قُلِ الْعَفْوَ کے الفاظ میں ضرورت سے زائد کو اپنے پاس رکھنے سے منع کرتا ہے' لیکن دوسری طرف انہیں آیتِ میراث نظر نہیں آتی؟ زکوٰۃ کا نظام نظر نہیں آتا؟ اگر کسی کے پاس کوئی شے ہے ہی نہیں تو زکوٰۃ کا پورا نظام کیا ہے؟ چلیے مان لیتے ہیں کہ زکوٰۃ قرآن مجید میں نصاب اور مقداروں کے ساتھ نہیں ہے اور جہاں زکوٰۃ کا لفظ ہے وہاں زکوٰۃ کے معنی وہی لیے جا سکتے ہیں جو مَیں نے پہلے بیان کیے ہیں کہ مسلسل نجاست کو دھوتے رہنا اور اس کا کوئی ذرّہ اپنے قریب آنے نہ دینا' لیکن احادیثِ نبویؐ میں تو پورا نظام ہے مقادیرِ زکوٰۃ کا۔ معلوم ہوا کہ یہ مغالطہ نیک نیتی سے بھی ہوسکتا ہے اور بدنیتی سے بھی' اور یہ اس دور میں ہو رہا ہے۔

اخلاقی اور قانونی نظامِ معیشت: لازم وملزوم

ایک اور بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اسلامی معاشرے میں اگر صرف اسلام کا قانونی معاشی نظام بتمام وکمال قائم بھی ہو جائے تو اس سے مطلوبہ مقاصد اُس وقت تک حاصل نہیں ہوں گے جب تک کچھ نہ کچھ لوگ' خواہ بہت ہی قلیل تعداد میں' ایسے نہ ہوں جو اس روحانی معیار پر زندگی بسر کر رہے ہوں۔ اس لیے کہ وہ pace-makers بنتے ہیں' دوسروں کے لیے معیار اور نمونہ بنتے ہیں' وہ اقدار کو معیّن کرتے ہیں' عوام ان کو دیکھتے ہیں کہ ایسے بھی لوگ ہو سکتے ہیں اور ہیں! اس سے معاشرے کی اخلاقی روایات بنتی ہیں کہ

اصل عزّت نیکی، تقویٰ اور خدا ترسی کی ہے، دولت کی نہیں ہے ☆۔ ورنہ رفتہ رفتہ وہ صورت ہو جاتی ہے جو آج ہمارے معاشرے میں ہے کہ لوگ دولت کی بنیاد پر عزّت کے مستحق سمجھے جاتے ہیں اگرچہ معلوم بھی ہے کہ یہ بالکل حرام ذرائع سے کمائی گئی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک دولت کے ساتھ عزّت تو تھی، لیکن حرام ذریعے سے کمائی گئی دولت کے ساتھ عزّت نہیں تھی، جبکہ موجودہ دور میں ہم بہت ہی پستی کی طرف پہنچ گئے۔ ہمارے معاشرے میں عزّت و احترام کی بنیاد صرف دولت و ثروت اور حکومت و اقتدار بن کر رہ گئے ہیں، حالانکہ لوگوں کو خوب معلوم ہوتا ہے کہ یہ دولت حرام اور ناجائز ذرائع سے کمائی گئی ہے اور یہ اقتدار بھی دھن، دھونس اور دھاندلی کے ذریعے سے حاصل کیا گیا ہے۔ اگر معاشرے میں pace-makers موجود ہوں تو وہ معاشرے کے اندر ایک معیار قائم کر کے لوگوں کے لیے ایک مثال بنیں گے اور وہ درحقیقت اسلام کی اس اعلیٰ روحانی تعلیم کا بھی ایک نمونہ اور مظہر لوگوں کے سامنے پیش کریں گے۔ تب اس قانونی نظام کی برکات صحیح طور پر ظاہر ہو سکیں گی۔

اس کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے، جو کوئی بہت زیادہ پرانی نہیں ہے، ابھی تقریباً دو سو سال ہوئے ہوں گے۔ امیر خان والیٔ ٹونک نے چند دیہات کا ایک وثیقہ اور دستاویز بنا کر پانی پت کے ایک درویش سلسلہ مجددیہ نقشبندیہ کے بزرگ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کو بھیجی کہ یہ چند گاؤں آپ کی خانقاہ کے نام لگاتا ہوں، ان کی آمدنی آپ کی خانقاہ میں آتی رہے گی اور آپ کے ہاں جو مسترشدین ہیں اور جو رشد و ہدایت کا سلسلہ ہے، اس کی مالی کفالت ہوتی رہے گی۔ انہوں نے اسی دستاویز کی پشت پر ایک شعر لکھ کر اسے واپس بھجوا دیا ؎

ما آبروئے فقر و قناعت نہ باختیم　　با میر خان بگوئے کہ روزی مقدّر است!

☆ حقیقی معنی میں تعظیم و تکریم ان ہی فقراء کی ہوتی ہے نہ کہ صاحبانِ تخت و تاج اور اصحابِ دولت و ثروت کی، بلکہ بسا اوقات بڑے بڑے بادشاہ ان بوریا نشین اور خرقہ پوش فقیروں کے در پر حاضری کو اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتے ہیں۔ علّامہ اقبال نے کہا ہے:

یقیں پیدا کر اے ناداں، یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری (مرتّب)

''ہم یہ جاگیر قبول کر کے اپنے فقر اور درویشی کی عزّت و آبرو کا سودا کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ امیر خان سے کہہ دو کہ ہماری روزی ہمارے پروردگار کی جانب سے مقرر ہے۔''

یہ اسی طرح کا واقعہ ہے جیسے حج کے موقع پر ایک صاحبِ علم و فضل کے اردگرد لوگوں کا رجوع عام اور خلقت کا اژدہام دیکھ کر ملکہ زبیدہ نے ہارون الرشید سے کہا تھا: ''اصل حکومت تو ان کی ہے نہ کہ تمہاری''۔ یعنی اصل بادشاہ تو یہ درویش ہے جس کے گرد لوگ عقیدت کے ساتھ جمع ہیں جبکہ تمہارے ساتھ تو یہ تنخواہ یافتہ پہرے دار ہیں۔ معاشرے کے اندر روحانی نظامِ معیشت پر عمل پیرا فقراء اور درویش ضرور موجود ہونے چاہئیں' خواہ وہ لاکھوں کروڑوں میں ایک دو آدمی ہوں' اس لیے کہ وہ اس معاشرے کے اندر رجحان اور اقدار کا تعین کرتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام میں مالی فرق و تفاوت کم کرنے کی کوششیں

مَیں نے اسلام کے قانونی نظامِ معیشت کو منضبط اور محدود سرمایہ داری (managed and controlled capitalism) سے تعبیر کیا ہے' لہٰذا اسی کے حوالے سے مَیں اس کی وضاحت کروں گا۔ آج کل اس مفہوم کو داخلی منضبط سرمایہ داری (internally managed capitalism) کے الفاظ سے ادا کیا جا رہا ہے۔ اصل سرمایہ داری (capitalism) تو یہ ہے کہ میرا سرمایہ ہے اور میرے یہ شرائط و ضوابط (terms and conditions) ہیں' آپ کام کرنا چاہیں تو کیجیے' نہیں کرنا چاہتے تو مت کیجیے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ یہ میرا آزادانہ اختیار ہے کہ جب چاہوں کارخانہ بند کر سکتا ہوں۔ آپ کو بھی کام کرنے یا نہ کرنے کی آزادی ہے۔ اب اس نظام سے ''مترفین'' یعنی haves اور ''محرومین'' یعنی have-nots کے درمیان تقسیم بڑھنی شروع ہوئی تو سرمایہ داروں کو خود بخود ایک خطرے کا احساس ہوا کہ یہ پریشان بے روزگار زیادہ بپھر گئے تو کہیں ہماری تجوریوں پر نہ ٹوٹ پڑیں اور ہمارے محلات پر حملہ آور نہ ہو جائیں۔ لہٰذا ان کو کچھ نہ کچھ خیرات دی جائے اور یہ جو haves and have-nots کا فاصلہ ہے اسے کسی نہ کسی درجے میں کم کیا جائے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی اس ناگزیر ضرورت کے تحت مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام

نے مترفین اور محرومین کے اس فاصلے کو کم کرنے کے لیے مختلف کوششیں کیں۔ چنانچہ ایک طرف ٹریڈ یونینز قائم ہوئیں کہ مزدوروں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے اور دوسری طرف بے روزگاری (unemployment) الاؤنس کا اجرا کیا گیا کہ کم سے کم گزارہ (subsistance) الاؤنس تو آدمی کو ملے تاکہ وہ معاملہ طے کرنے (bargaining) کی پوزیشن میں ہو اور وہ کارخانہ دار اور سرمایہ دار کے ساتھ پاؤں جما کر تو بات کر سکے کہ تم میری صلاحیت اور محنت کے بقدر صحیح اجرت دو گے تو کام کروں گا ورنہ نہیں کروں گا۔ مجھے یہ خطرہ نہیں ہے کہ کل میرے بچے کو فاقہ آ جائے گا' اس لیے کہ مجھے بے روزگاری الاؤنس مل جائے گا جو ریاست کے ذمے ہے۔ اسی کو امریکہ اور بعض یورپی ممالک میں اجتماعی بہبود (ویلفیئر) کے نام سے جاری کیا گیا ہے کہ بے گھروں کو گھر دینا اور بنیادی ضروریات کی فراہمی حکومت کے ذمے ہے۔ اس کا بھی بنیادی مقصد یہی ہے کہ آپ مزدور کو ایک bargaining پوزیشن دے دیں کہ اگر آپ کو صحیح اجرت پر صحیح کام مل رہا ہے تو کریں' اگر نہیں مل رہا تو انکار کر دیں۔ اس پر آپ سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ کم پر کیوں کام نہیں کرتے؟ ہم سرمایہ داروں کے سرمائے پر ٹیکس لگا کر اتنا جمع کر لیں گے کہ تمہاری بنیادی ضروریات پوری کر سکیں۔

"Give the devil his due" کے مصداق ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ سیکنڈے نیوین سوشلزم میں ویلفیئر سٹیٹ کا یہ تصور اپنی اعلیٰ ترین شکل کو پہنچ گیا ہے اور واقعتاً ایک اعتبار سے انسان معراجِ انسانیت پر پہنچ گیا ہے۔ ایک طرف کروڑوں اربوں کا مالک ہے جو لاکھوں ڈالرز میں ٹیکس دے رہا ہے اور ایک طرف ایک آدمی ویلفیئر الاؤنس پر زندگی بسر کر رہا ہے' لیکن ان دونوں کی اولاد ایک سطح پر تعلیم پائے گی' علاج دونوں کا ایک لیول کا ہوگا' یعنی علاج اور تعلیم ریاست کے ذمے ہے اور وہ بچے ایک فرد کے نہیں بلکہ قوم کی امانت اور ملکیت ہیں۔ اس اعتبار سے تو یہ بہت اعلیٰ نظام معلوم ہوتا ہے مگر بعض پہلوؤں سے اس میں انتہائی درجے کی پستی ہے۔ اس معاشرے میں عائلی اور معاشرتی نظام درہم برہم ہو گیا ہے اور خاندان کا ادارہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا ہے۔ عورت

کی حرمت جس طرح وہاں پامال ہوئی ہے پوری دنیا میں کہیں نہیں ہوئی۔ جنسی بے راہروی کا جو طوفان وہاں آیا ہے اور کہیں نہیں آیا۔ پھر یہ کہ خودکشیاں سب سے زیادہ وہاں ہو رہی ہیں جہاں ویلفیئر کا نظام اپنی اس انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ اس کا سبب وہی ہے کہ ان کا عائلی نظام درہم برہم ہو گیا ہے۔ قرآن مجید نے عائلی نظام کا ایک ہدف یہ بھی بتایا ہے: ﴿لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا﴾ (الروم:۲۱) یعنی یہ ازدواجی نظام ذہنی تسکین کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اگر وہاں سکون ہو، اطمینان ہو، باہمی اعتماد ہو، تو پھر کسی سکون آور یا خواب آور دوائی کی بھی ضرورت نہیں ہو گی۔ جب وہاں تسکین نہیں ہے تو خودکشیاں تو ہوں گی، کیونکہ یہی چیز ہے جو انسان کے لیے سب سے زیادہ سوہانِ روح بنتی ہے۔ یہ پستی کی انتہا ہے۔ بہرحال یہ تسلیم کیا جانا چاہیے کہ سیکنڈے نیوین ممالک میں ایک بار یہ نظام اپنی ناقابلِ یقین حد تک پہنچ گیا تھا، تاہم چونکہ یہ معاملہ غیر فطری اور غیر طبعی تھا اس لیے کسی قدر نیچے اترنے پر مجبور ہو گیا۔ امریکہ اس اعتبار سے بہت دُور ہے، اس لیے کہ امریکہ میں تو آپ کو علاج بھی خریدنا پڑتا ہے اور تعلیم بھی خریدنی پڑتی ہے، بڑی بھاری فیسیں دینی پڑتی ہیں۔ یہ ہے سرمایہ دارانہ نظام کا اندرونی انضباط (internally management)۔

اسلام میں زکوٰۃ کا نظام اور اس کی برکات

اسلام کے قانونی معاشی نظام میں مذکورہ بالا management زکوٰۃ کے نظام کے ذریعے سے قائم ہوتی ہے۔ یعنی اسلام نے یہی شے اس سے بہتر انداز میں عطا کی ہے۔ اسلام نے ایک حد قائم کر دی کہ جو اس حد سے آگے نکل جائیں وہ دینے والے (doners) ہیں اور جو اس حد سے پیچھے رہ جائیں وہ لینے والے (recipients) ہیں۔ دینے والوں کو haves اور لینے والوں کو have-nots شمار کریں یا دین کی اصطلاح میں ان کو بالترتیب ''صاحبِ نصاب'' اور ''مسکین'' شمار کریں۔ حضور ﷺ نے زکوٰۃ کے بارے میں فرمایا: ((تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَاءِهِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَاءِهِمْ)) (۳) ''وہ (زکوٰۃ)

(۳) صحیح البخاری، کتاب الزکاۃ، باب وجوب الزکاہ۔ و صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدعاء الی الشھادتین و شرائع الاسلام۔

مسلمانوں کے مالداروں سے وصول کی جائے گی اور غرباء میں تقسیم کی جائے گی''۔ معاشرے میں معاشی اعتبار سے پیدا ہونے والی ناہمواری کو کم کرنے کے لیے اسلام نے زکوٰۃ کا مکمل نظام قائم کیا ہے۔ اس میں نصاب کی حد مقرر کی گئی ہے اور پھر اس میں مقداریں ہیں۔ یوں سمجھئے کہ چودہ سو برس قبل معاشی فرق و تفاوت کو کم کرنے کی ضرورت اسلام نے زکوٰۃ کے نظام سے پوری کر دی تھی۔ اس لیے کہ اسلام میں بھی آزاد معیشت ہے اور جہاں بھی آزادی ہوگی وہاں کچھ نہ کچھ فرق ضرور آئے گا۔ اس فرق کو زکوٰۃ اور عُشر کے نظام کے ذریعے کم کیا گیا ہے۔

اسلامی نظامِ معیشت کے ''اندرونی انضباط'' اور سرمایہ دارانہ نظام کے اندرونی انضباط (internally management) میں بہت فرق ہے۔ ایک فرق یہ ہے کہ صاحبِ نصاب اور مسکین کی تقسیم الل ٹپ (arbitrary) نہیں ہے۔ اسے آپ اپنے اختیار سے آگے پیچھے نہیں کر سکتے۔ ''فقیر'' کے لفظ سے ذرا مغالطہ ہو جاتا ہے کہ فقیر شاید وہی ہے جو ہاتھ پھیلا رہا ہو، مانگ رہا ہو اور جسے فاقہ آ رہا ہو۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ اسلام میں نصاب کی ایک لائن کھینچ دی گئی ہے کہ جس کے پاس ساڑھے سات تولے سونا یا باون تولے چاندی ہے وہ اس لائن سے اوپر ہے اور زکوٰۃ کا ادا کنندہ ہے، اور جس کے پاس اتنا سونا یا چاندی نہیں ہے وہ اس لائن سے نیچے ہے اور زکوٰۃ کا وصول کنندہ ہے۔ اسی طرح اونٹ، گھوڑے اور بھیڑ بکریوں کا نصاب ہے۔ اب جو اس سے اوپر ہیں وہ غنی ہیں، اور جو نیچے رہ گئے ہیں وہ فقیر ہیں۔

ان دونوں نظاموں میں دوسرا اور اہم ترین فرق یہ ہے کہ اسلام کی اخلاقی تعلیم جہاں انفاق یعنی خرچ کرنے پر زور دیتی ہے وہاں اس کا ایک تکمیلی جزو (counter part) یہ ہے کہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے اور سوال کرنے کو انتہائی مذموم اور صدقات کو ''اَوْسَاخُ النَّاسِ''☆ (لوگوں کا میل کچیل) قرار دے کر نہ صرف لوگوں کو ترغیب دی ہے بلکہ غیرتِ

☆ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اِنَّ هٰذِهِ الصَّدَقَاتِ اِنَّمَا هِيَ اَوْسَاخُ النَّاسِ، وَاِنَّهَا لَا تَحِلُّ لِمُحَمَّدٍ وَلَا لِاٰلِ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم)) (رواہ مسلم) ''یہ صدقات درحقیقت لوگوں کی میل کچیل ہوتے ہیں اور یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آلِ محمد کے لیے حلال نہیں۔''

انسانی کو بھی جھنجھوڑا گیا ہے کہ زکوٰۃ وصدقات کو مت قبول کرو ؎

غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اُس نے یہ ہے میری خدائی کی زکوٰۃ!

ایک غیرتِ فقر بھی ہے کہ محنت اور کوشش کر کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو، روکھا سوکھا کھاؤ مگر سوال مت کرو اور لوگوں کے ہاتھوں کی میل کچیل سے اپنے پیٹ مت بھرو۔ ہم نے اس طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ یہ اصل فرق ہے جس کی وجہ سے آج سیکنڈے نیوین سوشلزم اپنی بربادی تک پہنچ گیا ہے۔ اس لیے کہ جب بنیادی ضروریاتِ زندگی بغیر محنت کے حاصل ہو رہی ہوں تو کام کا محرک (incentive) کیوں رہے گا؟ انسان کو حیرت ہو سکتی ہے کہ ویلفیئر کا ایسا نظام ہے تو ان کی آمدنی کیا ہے؟ یہ ملک کیسے چل رہے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ملک اس لیے قائم چلے آ رہے ہیں کہ وہ اپنے دفاع پر ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کر رہے۔ جب جرمنی نے وہاں قدم جمانے چاہے تھے تو انہوں نے بالکل کھلم کھلا کہہ دیا تھا کہ آیئے اور ہمارا ملک سنبھالیے۔ ان کا پورے کا پورا ڈیفنس امریکہ کے ہاتھ میں ہے۔ امریکہ پوری تھرڈ ورلڈ کا پیسہ چوس رہا ہے اور اس کے بل بوتے پر وہ اپنی اکانومی کی بساط بچھائے بیٹھا ہے۔ ان ممالک میں اگر دفاع کے اوپر اس طرح کا خرچ ہونے لگے جس طرح باقی ممالک میں ہوتا ہے تو ان کا ویلفیئر سٹیٹ کا نظام کبھی بھی چل نہیں سکتا۔

اسلام نے معاشرے میں مالی فرق وتفاوت کو کم کرنے کے لیے ایک طرف زکوٰۃ کا نظام رائج کیا ہے تو دوسری طرف لوگوں کو اس سے دور رہنے کی تلقین کی ہے۔ ایک طرف قرآن نے فرمایا: ﴿وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿٢٤﴾ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿٢٥﴾﴾ (المعارج) ''ان کے مالوں میں معیّن حق ہے سائل کے لیے بھی اور محروم کے لیے بھی''۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ﴿١٠﴾﴾ (الضحیٰ) ''کسی سائل کو مت دھتکارو، مت جھڑکو''۔ کہیں باقاعدہ ایک مد معیّن کی جاتی ہے: ﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ﴾ (البقرۃ:۱۷۷) ''اور اُس نے دیا مال اس کی محبت کے باوجود قرابت داروں،

یتیموں، محتاجوں، مسافروں اور مانگنے والوں کو اور گردنوں کے چھڑانے میں''۔ اس سے ایک اشتباہ ہوتا ہے کہ شاید اسلام مانگنے اور سوال کرنے کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔

یہاں اسلام کی تعلیمات کے دوسرے پہلو کو بھی سامنے رکھیں کہ اسلام میں سوال کرنے کی انتہائی مذمت ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ((اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِّنَ الْیَدِ السُّفْلٰی))(۴) ''اوپر والا (دینے والا) ہاتھ بہتر ہے نیچے والے (لینے والے) ہاتھ سے۔'' بہتر بنو، کہتر کیوں بنتے ہو؟ اور دوسری طرف ان صدقات کو لوگوں کا میل کچیل قرار دیا۔

ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھیے تو معلوم ہوگا کہ اسلام میں سوال کرنے کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نے وہ واقعات سنے ہوں گے کہ اسلامی تاریخ میں وہ وقت آ گیا تھا جس میں خوشحالی کی ایک انتہا کا نقشہ نظر آتا ہے کہ لوگ اموالِ زکوٰۃ لیے پھرتے تھے اور لینے والا کوئی نہیں تھا۔ اس میں ایک اشکال یہ ہو جاتا ہے کہ خلافت راشدہ میں تو حکومتی سطح پر مال کی زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی تو یہ لوگ کیسے زکوٰۃ کا مال لیے پھرتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دور خلافت راشدہ میں اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ خود دینی ہوتی تھی جبکہ اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ کی وصولی ریاست اور حکومت کی سطح پر ہوتی تھی۔ اب لوگ اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ دینے کے لیے پھر رہے ہوتے اور لینے والا کوئی نہ ملتا۔ اس میں یقیناً ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جس تیزی سے فتوحات ہوئیں اور مالِ غنیمت آیا اس سے عمومی خوشحالی پیدا ہو گئی، تو اب کون ہے جو اس کو قبول کرنے والا ہو؟ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ ان پر اخلاقی تعلیمات کا بھی کافی اثر تھا۔ پھر اس معاملے میں مزید زور پیدا کرنے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ذات اور اپنے خاندان کے لیے زکوٰۃ اور صدقات کو حرام قرار دے دیا، البتہ ہدیہ کو جائز قرار دیا۔ یہ وہ بنیادی بات اور بنیادی پہچان تھی جو ایک عیسائی راہب نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو بتائی تھی کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

(۴) صحیح البخاری، کتاب الزکاۃ، باب لا صدقۃ الا عن ظھر غنی۔ وصحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب بیان ان الید العلیا خیر من الید السفلی ...

کی ایک پہچان یہ ہوگی کہ وہ صدقہ قبول نہیں فرمائیں گے' البتہ ہدیہ قبول کرلیں گے۔

اس تمام گفتگو سے یہ اندازہ ہوگیا ہے کہ اسلام نے مترفین اور محرومین کے مابین مالی فرق و تفاوت کو کم کرنے کی غرض سے اپنے معاشی نظام کی management کے لیے زکوٰۃ اور عُشر وغیرہ کا اہتمام کیا ہے۔ اس کو آپ اجتماعی (collective) انشورنس بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی کی بنیاد پر اسلامی ریاست اپنے شہریوں کی بنیادی ضروریات کی کفیل ہے۔ اس کو آپ subsistance allowance کہہ لیں' unemployment allowance کہہ لیں یا ویلفیئر کہہ لیں' کہ بنیادی ضروریات کی ذمہ دار ریاست ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست فی الحقیقت ایک ویلفیئر سٹیٹ کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو ''کفالتِ عامّہ'' کی ذِمہ داری جس حد تک قبول کرتی ہے اس کا کسی قدر اندازہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول سے کیا جا سکتا ہے کہ ''اگر دجلہ و فرات کے کنارے کوئی کُتّا بھی بھوکا مر گیا تو قیامت کے روز عمر اس کے بارے میں جواب دہ ہوگا۔

البتہ یہ بھی نوٹ کرلیں کہ اگر کوئی شخص اپنی عزّتِ نفس اپنی ہتھیلی پر رکھ کر تمہارے سامنے پیش کر دے' تمہارے سامنے دستِ سوال دراز کرے اور پھر بھی تم اس کو ٹھکرا دو تو یہ تمہاری شرافت اور مروّت کے منافی ہے۔ کچھ دے سکتے ہو تو ضرور دو۔ بعض احادیث میں یہاں تک الفاظ آئے ہیں کہ سائل کو دو چاہے وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آیا ہو۔ تمہیں کیا معلوم اس کے کیا حالات ہیں' اگر نہیں دے سکتے تو اچھے انداز میں رخصت کر دو' لیکن دھتکارنے یا جھڑکنے کی اجازت نہیں ہے۔

محدود سرمایہ کاری اور سرمائے کے بارے میں اسلامی فلسفہ

ایک اور بات جو مشکل تر ہے اور جس تک ابھی مغربی ذہن بالکل نہیں پہنچا' وہ ہے ''محدود سرمایہ کاری'' (controlled capitalism)۔ محدود سرمایہ کاری کا تصوّر اسلام نے دیا ہے کہ جائز ذرائع سے حاصل کی گئی کمائی حلال اور ناجائز ذرائع سے حاصل کی گئی کمائی حرام ہے۔ اس طرح کا کوئی تصوّر مغرب میں ابھی نہیں ہے۔ چنانچہ انٹرسٹ ریٹ اور افراطِ زر (inflation) بڑھتا جا رہا ہے۔ ایک دائرہ خبیثہ (vicious

(circle) ہے جو پھیلتا جا رہا ہے' تباہی نظر آ رہی ہے لیکن ان کے پاس اس کا کوئی حل نہیں ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا اسے کس طریقے سے نیچے لائیں۔ اس کا حل وہ ہے جو درحقیقت اسلام نے دیا ہے' یہاں سوائے اس آسمانی ہدایت کے کوئی اور شے انسان کے بچاؤ (rescue) کے لیے آنے والی نہیں۔ سرمائے کے حوالے سے اسلام کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ سرمایہ کو زنجیریں پہنانی ہیں' اس کے پاؤں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں کچھ ہتھکڑیاں ڈالنی ہیں' کچھ پابندیوں (limitations) کے ساتھ اسے آزادی دینی ہے۔ لیکن اہلِ مغرب نے اس سرمائے کو مادر پدر آزادی دی' جس سے بڑی لعنت اور کوئی ہو نہیں سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے تباہی دیکھ رہے ہیں' خاندانی نظام بکھرتے دیکھ رہے ہیں' اکانومی ڈوبتے دیکھ رہے ہیں' لیکن کر کچھ نہیں سکتے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے سرمائے کو بغیر کسی پابندی کے مکمل آزادی دے دی۔

اسلام کے سماجی اور معاشرتی نظام پر گفتگو کرتے ہوئے مَیں نے ایچ جی ویلز کی تصنیف ''A Concise History of the World'' کا تذکرہ کیا تھا۔ اس نے تسلیم کیا کہ انسان کی حریت' اُخوت اور مساوات کے وعظ تو پہلے بھی دنیا میں کہے گئے تھے لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ انسانی آزادی' اخوت اور مساوات کے اصولوں پر بالفعل ایک معاشرہ تاریخِ انسانی میں پہلی مرتبہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قائم کیا ہے۔

اسی طرح کی ایک عجیب بحث اس نے سرمایہ اور کرنسی سے متعلق بھی کی ہے کہ یہ کرنسی اور سرمایہ بہت بڑی لعنت ہے۔ اس نے کہا کہ اس کا آغاز رومن ایمپائر سے ہوا تھا۔ جب تک کرنسی کا تصوّر نہیں تھا دنیا میں لین دین ہو رہے تھے لیکن تبادلے کی بنیاد پر۔ یعنی اس سے پہلے مبادلۂ اشیاء کا اصول تھا کہ ایک شخص کھیت میں کام کر رہا ہے اور گندم اُگا رہا ہے' دوسرا کرگے پر بیٹھا کپڑا بُن رہا ہے۔ وہ دونوں اپنی ضرورت کے مطابق اشیاء ایک دوسرے سے تبادلہ (exchange) کر لیتے تھے — یعنی تم دو بوری گندم لے لو اور دو تھان کپڑے کے مجھے دے دو — اس طرح مبادلۂ اشیاء سے ضروریات پوری ہو رہی تھیں' لیکن کہیں ارتکازِ سرمایہ کی شکل نہیں تھی۔ کوئی کتنا کپڑا اپنے پاس جمع کر لے گا اور کوئی

کتنی گندم اپنے پاس روک لے گا؟ لہٰذا ارتکازِ سرمایہ کی جو بہت بڑی قوت ہے یہ اس وقت نہیں تھی۔

جب آپ نے کرنسی کا تصوّر دیا کہ ایک تولہ سونا مساوی ہے اتنے مَن گندم کے اور ایک تولہ مساوی ہے اتنے تھان کپڑے کے' تو اب ایک نئی شے انسانی معاشرے کے اندر متعارف ہوئی۔ گویا اس سے انسان کے ہاتھ ارتکازِ دولت کا ایک ذریعہ آ گیا۔ سرمایہ دار کی تجوری کے اندر سونے کی صورت میں ایک بہت بڑا جن بند ہے' اس جن کو وہ release کرے گا اور مارکیٹ کو اِدھر سے اُدھر کر دے گا۔ وہ کوئی ایک مال خرید لے گا اور مارکیٹ کے اندر اس کی کمی پیدا کر کے قیمتیں چڑھا دے گا اور پھر مَن مانی قیمت وصول کرے گا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے سٹاک مارکیٹ کے اندر زلزلہ آیا تھا' اس سے لوگوں کے کروڑوں' اربوں ڈالر آنِ واحد میں ختم ہو گئے۔ یہ سارا کھیل سرمائے کا ہے اور سرمائے کا ارتکاز اس کرنسی اور اس دولت کے سبب سے ہے۔ ایچ جی ویلز نے اس کے بارے میں صرف ایک جملہ لکھا کہ انسان کو معلوم نہیں تھا کہ اس کرنسی کی ایجاد سے اس نے کتنی بڑی لعنت کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیا ہے۔ اس کے بارے میں آپ سمجھ لیجیے کہ یہ ایک شر ہے لیکن ناگزیر شر ہے' ناگزیر بُرائی ہے۔ لہٰذا اس کو استعمال بھی کیا جائے' اسے کچھ کام کرنے کی آزادی (freedom of action) بھی دی جائے اور اس کو کچھ پابند بھی کیا جائے۔ یہ ہے اصل فلسفہ اسلام کا۔ اب دیکھئے کہ اسلام نے سرمائے کو کس طرح پابند کیا ہے۔

سرمایہ' محنت اور موقع

بنیادی طور پر کسی بھی معاشی پیداواری عمل (economic productive activity) میں تین چیزیں شامل ہیں: ایک سرمایہ' دوسری محنت۔ اصل تو یہ دونوں ہی ہیں لیکن ان کے ساتھ ایک تیسرا عامل بھی ہوتا ہے اور وہ ہے موقع (chance) —— کبھی اتنا ہی سرمایہ اتنی ہی محنت کے ساتھ زیادہ پیداوار لے آتا ہے اور کبھی اتنا ہی سرمایہ اور اتنی ہی محنت صَرف ہوتی ہے اور پیداوار کم ہوتی ہے یا بالکل صفر ہوتی ہے۔ اب سرمایہ بھی وہی

ہے' محنت بھی وہی ہے' لیکن یہ چانس کا عنصر بھی ایک مؤثر عامل ہے —— اب اسلام نے معاشی معاملات کے اندر ان تینوں میں سے سب سے زیادہ تحفظ اور سب سے زیادہ عزّت' محنت کو دی ہے جبکہ سرمائے کی حیثیت کم سے کم رکھی ہے۔ اور اگر سرمائے کو صرف اپنی ذاتی حیثیت میں کمائی کا ذریعہ (earning agent) بنا دیا جائے تو اسلام کی نظر میں یہ غلط ہے۔ اس کی بدترین شکل سود اور ربا ہے جو اسلام میں حرام ہے۔ یعنی اسلام نے سرمائے کو بیڑیاں ڈالی ہیں' اسے پابند کیا ہے۔ اسی طرح اسلام نے چانس کو بھی کم سے کم درجہ دیا ہے' چنانچہ جوئے کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ جس کو آپ جوا کہتے ہیں' وہ اصل میں صرف چانس ہے اور کچھ بھی نہیں۔ نہ آپ کی محنت ہے اور نہ آپ کا سرمایہ اس کے اوپر لگا ہے' جو کچھ ہو رہا ہے وہ صرف چانس کا معاملہ ہے جو حرامِ مطلق ہے۔

سود کی حرمت و شناعت

اسلام نے سرمائے پر جو پابندیاں عائد کی ہیں' ان میں ایک درجہ بندی ہے۔ سرمائے کی مادر پدر آزادی یہ ہے کہ: (i) سرمایہ محض بطور سرمایہ earning agent ہو یعنی بغیر کسی محنت کے صرف سرمایہ ہونے کی حیثیت سے کمائی کا ذریعہ بنے (ii) سرمایہ اپنا تحفظ بھی چاہے (iii) پھر وہ نقصان کا رِسک لینے کو تیار نہ ہو' صرف نفع مانگے (iv) اور نفع بھی ایک معیّن سطح پر مانگے۔ یہ چار عناصر سود اور ربا کے اجزائے لاینفک ہیں' جسے اسلام نے اس درجے حرام کیا ہے کہ کسی اور شے کی حرمت ایسی نہیں ہے۔ یعنی یہ کڑوی گولی نہیں گولہ ہے' جس کو ہم سب کھا پی رہے ہیں' مچھلیوں کی مانند اس جوہڑ میں تیر رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اگر کوئی انسان سود سے بچ بھی جائے گا تو سود کے غبار سے نہیں بچ سکے گا۔ dust suspension فضا میں موجود ہے تو آپ لامحالہ اسے inhale کریں گے۔ یہ سود اتنی بڑی لعنت ہے' اتنا بڑا گناہ ہے کہ زنا سے بھی بڑھ کر ہے۔ آپ یوں سمجھئے کہ عقائد میں شرک اور اعمال میں سود سب سے بڑا گناہ ہے۔ قرآن حکیم کے سب سے بڑے رمز شناس حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے سود کی حرمت بیان کرنے کے لیے جو انداز اختیار کیا وہ ہماری ذہنی سطح سے

قریب تر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اَلرِّبَا سَبْعُوْنَ حُوْبًا اَیْسَرُھَا اَنْ یَّنْکِحَ الرَّجُلُ اُمَّہٗ))(۵)

''سود کے ستّر حصّے ہیں' ان میں سب سے ہلکا اس کے مساوی ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں سے زنا کرے۔''

اس سے ایک دفعہ آدمی لرز جاتا ہے بلکہ طبیعت اِبا بھی کرتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسی بات کیوں کہی' یہ اندازِ تعبیر آپؐ نے کیوں اختیار کیا؟ فوری طور پر احساس ہوتا ہے کہ کچھ ناشائستہ سا انداز ہے تعبیر کا۔ اس حوالے سے یہ بات نوٹ کر لیں کہ سود کی قباحت' اس کی شناعت' اس کی خباثت کا جو تاثر دینا مقصود تھا وہ اس کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسان کو بہت سے گناہوں سے طبعی نفرت ہوتی ہے۔ خصوصاً ہمارے ہاں ایک نام نہاد ''دیندار'' مگر اصلاً ''کاروباری'' طبقہ کو نماز روزے سے بڑی دلچسپی ہے' حج کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے اور دارالعلوم و مساجد بظاہر قائم ہی ان کے بل بوتے پر ہیں' شراب سے ان کو بڑی نفرت ہے اور اگر اس پر زنا کا اضافہ ہو جائے تو گویا قیامت آ گئی' مگر ان کو سود سے کوئی نفرت نہیں اور وہ بڑے ذوق و شوق سے سودی کاروبار کرتے ہیں۔ لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ اندازِ تعبیر اختیار فرمایا تاکہ واضح ہو جائے کہ سود معاشرتی بُرائی ہونے کے اعتبار سے زنا کی بدترین صورت (یعنی ماں کے ساتھ زنا) سے بھی ستّر گنا زیادہ بھیانک ہے۔

اس اندازِ تعبیر کی مثال قرآن مجید میں بھی موجود ہے کہ غیبت کو مُردہ بھائی کا گوشت نوچ کر کھانے سے تعبیر کیا گیا ہے: ﴿اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا فَکَرِھْتُمُوْہُ ؕ﴾ (الحجرات:۱۲) ''کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ پس تم اس کو ناپسند کرتے ہو!'' آدمی کی طبیعت ایک دفعہ اِبا کرتی ہے کہ کیسی تمثیل دی گئی ہے' کوئی شخص اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا' لیکن اخلاقی میدان میں کسی کی غیبت بالکل اس کے مساوی ہے۔ جیسے ایک مُردہ اپنے گوشت کا دفاع نہیں کر سکتا'

---

(۵) سنن ابن ماجه' کتاب التجارات' باب التغليظ فی الربا۔

ایسے ہی جو شخص موجود نہیں ہے وہ اپنی عزّت کا دفاع نہیں کر سکتا اور آپ اس کی غیبت کر رہے ہیں۔ وہ موجود ہو پھر اس کی بُرائی کر کے دیکھئے' وہ اپنا دفاع کرے گا۔ چنانچہ غیبت درحقیقت مساوی ہے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے۔ اسی طرح طبعی طور پر ہمیں سود سے وہ نفرت نہیں ہے' لیکن زنا کا لفظ بھی ایک شائستہ آدمی زبان سے بار بار کہتے ہوئے اچھا محسوس نہیں کرتا' کجا یہ کہ ماں سے زنا کی بات کی جائے۔ تو گویا سود اَشَدُّ الحَرَام اور اَبْغَضُ الحَرَام ہے۔ طلاق کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ((اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی الطَّلَاق))(۶) یعنی حلال چیزوں میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسندیدہ طلاق ہے' جبکہ سود تو حرام میں بھی ابغض الحرام ہے۔

اسلام کا نظریہ قدرِ زائد

دنیا میں قدرِ زائد (surplus value) کا تصوّر بہت عام ہے' خاص طور پر مارکس کے نظریے میں۔ قرآن مجید نے قدرِ زائد کے لیے ایک لفظ استعمال کیا ہے ''عفو'' یعنی جو تمہاری ضرورت سے زائد ہے۔ اس عفو کا مصرف کیا ہے؟ آپ سادہ ترین مثال کو سامنے رکھیے' اسی سے باتیں سمجھ میں آتی ہیں اور پھر اس سے پیچیدہ گتھیاں سلجھتی ہیں ـــــ فرض کیجیے آپ سرکاری ملازم ہیں' آپ کو تنخواہ مل رہی ہے جس سے آپ کی ضروریات پوری ہو رہی ہیں اور کچھ آپ بچت کر رہے ہیں۔ وہ بچت جس پر آج بڑا زور دیا جا رہا ہے اور بینکنگ کا پورا نظام اسی کے فلسفے پر اور اسی کی تبلیغ پر چل رہا ہے کہ بچت کرو اور بچت کو پھر کہیں invest کرو۔ آپ کے پاس جو بچت اور فاضل سرمایہ ہے وہ ''عفو'' ہے۔ اب اس کے دو مصرف ہیں۔

ایک یہ کہ آپ اسے اللہ کی رضا کے لیے خرچ کر دیں۔ جیسے قرآن نے فرمایا: ﴿یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ط قُلِ الْعَفْوَ ط﴾ (البقرۃ: ۲۱۹) ''وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجیے: جو ضرورت سے زائد ہو!''☆ یعنی آپ

---

(۶) سنن ابن داؤد' کتاب الطلاق' باب فی کراھیۃ الطلاق۔

☆ بقول اقبال ؎ ◀◀

اپنی ضرورت سے زائد اُن کو دے دیجیے جو ضرورت مند ہیں' اس لیے کہ یہ تو ان کی ہی ملکیت تھا۔ یہ مَیں روحانی نظام کی بات کر رہا ہوں کہ یہ درحقیقت انہی کا حق تھا' تمہیں تو صرف آزمانے کے لیے دے دیا گیا تھا۔ اگر یہ نہیں کر سکتے' اتنا ترفّع ممکن نہیں ہے' تمہاری ہمّت کی نسبت سے اونچائی کچھ زیادہ ہے تو چلو کسی کو قرضِ حسن کے طور پر دے دو۔ کسی شخص کے پاس سرمایہ نہیں ہے تو آپ اسے قرضِ حسنہ دے دیں' اس سے وہ اپنے لیے ایک باعزّت معاش پیدا کر سکتا ہے۔ اسے اگر اتنی سی بھی پونجی مل جائے کہ وہ چھابڑی لے کر چل پڑے یا کوئی کھوکھا لگا لے' کوئی دکان بنا لے تو اسے دے دو اور پھر کچھ عرصہ بعد اپنا اصل زر واپس لے لینا۔ یہ دوسرے درجے میں روحانی ترغیب ہے۔

تیسرے نمبر پر یہ ہے کہ اگر تم اپنی اس بچت کو بھی مزید کمائی کا ذریعہ بنانا چاہتے ہو' تو قانونی نظام میں اس کا جواز موجود ہے۔ آپ اوپر نہیں جانا چاہتے' پستی ہی کی طرف توجہ رکھنا چاہتے ہیں تو قانونی سطح پر اس کے لیے بھی ایک جواز موجود ہے۔ کمزور لوگوں کو بھی شریعت میں accomodate کیا گیا ہے اور ان کے لیے مضاربت کا راستہ کھول دیا گیا ہے۔ آپ اپنا سرمایہ کسی بھائی کو دو' وہ کام کرے گا' نقصان ہو گیا تو پورے کا پورا آپ کو برداشت کرنا ہوگا' اس لیے کہ تمہارا تو یہ زائد مال ہے جبکہ وہ تمہارے سرمائے سے صرف اس لیے کام کر رہا ہے کہ اس کے پاس سرمایہ نہیں ہے' اس لیے وہ مال اس کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اگر نقصان ہوگا تو کلیتاً تمہارا ہوگا۔ ہاں اگر نفع ہو جائے تو اس میں سے کچھ حصّہ تم بھی لے سکتے ہو' یہ جائز ہے' حلال ہے' البتہ پہلے دو درجوں کے مقابلے میں پسندیدہ نہیں ہے۔ اگر آپ اس سے بھی نیچے جائیں گے تو یوں سمجھیے کہ آپ نے اپنے لیے جہنّم کا انتخاب کر لیا —— یعنی آپ کسی کو اپنا سرمایہ دے کر کہیں کہ یہ میرا سرمایہ ہے تم کام کرو' مجھے اس سے غرض نہیں کہ تمہیں نفع ہو' نقصان ہو یا پوری رقم ڈوب جائے' مَیں نے تمہاری گردن پکڑ کر اپنا پیسہ نفع سمیت وصول کر لینا ہے۔ یہ سود ہے جو حرامِ مطلق ہے۔

◀ با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ ہرچہ از حاجت فزوں داری بدہ

''مسلمانوں سے کہو کہ جاں ہتھیلی پر رکھ لیں (یعنی قتال فی سبیل اللہ کے لیے کمر کس لیں) اور جو کچھ ضرورت سے زائد ہو وہ سب (اللہ کی راہ میں) دے ڈالیں۔'' (مرتّب)

مزارعت

مَیں عرض کر چکا ہوں کہ اسلام نے قانونی اور فقہی سطح پر مضاربت کو جائز قرار دے کر کم ہمت طبائع کو accomodate کیا ہے۔ ایک شخص کی محنت اور ایک کا سرمایہ' ان کے امتزاج کا نام مضاربت ہے۔ نفقہ کے اوپر تو دو اور دو چار کی طرح بات واضح ہوگئی کہ نقصان ہوا تو سرمایہ دار برداشت کرے گا اور نفع ہوا تو برابر کے شریک ہوں گے۔ اب اس اصول کو زمین پر لائیے جو سب سے بڑا اور سب سے قدیم ذریعۂ پیداوار ہے۔ جیسے مال کا حق ملکیت ہے ایسے زمین کا بھی ہے' کھیت کا بھی ہے۔ اب یہاں ایک صورت یہ ہے کہ آپ اپنی زمین خود کاشت کیجیے' یہ تو سب سے اعلیٰ صورت ہے۔ یہاں ایک اور بات بھی یاد رکھیے کہ قرآن مجید میں تجارت کے ساتھ ﴿عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾ (النساء:۲۹) ''وہ (تجارت) باہم رضامندی سے ہو'' کی شرط عائد کی گئی ہے۔ آپ مل جل کر باہمی رضامندی سے اپنا سرمایہ بھی جمع کر لیں' محنت بھی جمع کر لیں تو یہ صورت بھی ٹھیک ہے اور بہت عمدہ شراکت ہے۔ لیکن یہ شراکت اگر زبردستی ہوگی تو پھر آزادی والی بات ختم ہو جائے گی۔ اسی طرح زمین میں شراکت کیجیے' collective farming کیجیے اور مل جل کر محنت کیجیے تو یہ ٹھیک ہے' مگر اصل مسئلہ وہاں ہے جہاں سرمایہ کسی کا ہے اور کاروبار کوئی اور کر رہا ہے' محنت کوئی اور کر رہا ہے۔ اس میں مضاربت تک بہرحال جائز ہے' اس سے آگے کا معاملہ سود ہے۔

اسی طرح کا معاملہ مزارعت کا ہے کہ زمین کسی کی' کام کوئی اور کرے۔ اس کی جو صورت ''غیر حاضر زمینداری'' کی ہے یعنی زمین میری ہے باقی سارا کام آپ نے کرنا ہے' بیج آپ کا' بیل آپ کے' ٹریکٹر آپ کا' محنت آپ کی' مَیں دعویٰ سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن میرے مطالعہ کے مطابق یہ شے تو سب کے نزدیک مطلق حرام ہے' اس لیے کہ یہ تو خالص سود ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک مزارعت کی ہر شکل حرام ہے' جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی رائے کھلے کھیت کے بارے میں بہت حد تک وہی ہے۔ یہ جو مزارعت کے جواز کا معاملہ ہوا ہے یہ فقہ حنفی میں صاحبین نے اضافی شرطیں لگا کر

کیا ہے کہ مالک بیج بھی لگائے اور اس کی کچھ اور بھی investment ہو' تا کہ اگر کوئی نقصان ہو' فصل خراب ہو جائے تو سارا بوجھ صرف اس مزارع پر نہ آئے بلکہ مالک کا بھی تو کچھ نقصان ہو۔

یہاں یہ بھی غور کیجیے کہ یہ مضاربت کی صورت بن ہی نہیں سکتی' اس لیے کہ مضاربت میں تو سارا نقصان ربّ المال کا ہوتا ہے جبکہ مزارعت میں سارا نقصان زمین والے کا ممکن ہی نہیں۔ اس کی زمین تو جوں کی توں قائم رہے گی۔ ایک فصل ہی گئی ہے نا' جبکہ مضاربت میں تو سرمایہ بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ زمین میں یہ تو نہیں ہوتا کہ دس ایکڑ تھی اب نو ایکڑ رہ گئی یا آٹھ ایکڑ رہ گئی یا بالکل ختم ہو گئی۔ تو مضاربت کے ساتھ اس کی پوری پوری مشابہت ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا معاملہ انتہائی مشکوک ہے اور یہ مَیں ہلکا ترین لفظ (مشکوک) استعمال کر رہا ہوں' حالانکہ یہ قریب تر ہے سود کے' اور اگر یہ اصول پیشِ نظر رہے کہ "دَعُوا الرِّبَا وَالرِّيْبَةَ"(۷) یعنی ربا کو بھی چھوڑ دو اور ہر اس شے کو بھی جس میں ربا کا شبہ ہو تو پھر اس کے قریب بھی نہیں پھٹکنا چاہیے۔

اس محفل میں الحمد للہ مولانا محمد طاسین صاحب تشریف فرما ہیں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ "مروّجہ نظامِ زمینداری اور اسلام" کتاب تصنیف کر کے انہوں نے علماء کی طرف سے ایک بہت بڑا فرضِ کفایہ ادا کیا ہے اور ایک حُجّت قائم کر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سعادت بخشی کہ ہم نے پہلے "حکمتِ قرآن" میں اسے پندرہ اقساط میں شائع کیا اور

---

(۷) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ ﷺ قَالَ:
إِنَّ آخِرَ مَا نَزَلَتْ آيَةُ الرِّبَا وَإِنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قُبِضَ وَلَمْ يُفَسِّرْهَا لَنَا' فَدَعُوا الرِّبَا وَالرِّيْبَةَ (سنن ابن ماجه' كتاب التجارات' باب التغليظ فى الربا۔ ومسند احمد: ح ۲۳۸ و ۳۳۱)

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"بے شک سود کی (حرمت والی) آیت سب سے آخر میں نازل ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس حال میں انتقال ہو گیا کہ آپؐ نے ہمیں اس کی تفصیلات بتا نہیں فرمائیں۔ پس تم سود کو بھی چھوڑ دو اور ہر اُس شے کو بھی جس میں سود کا شبہ ہو۔"

بعدازاں کتابی شکل میں شائع کیا۔ ٹھیک ہے ہمارے ہاں فقہ حنفی میں اس کے جواز کا فتویٰ ہے اور عام آدمی بھی اس کے خلاف سننے کے لیے بالکل تیار نہیں ہے تو ظاہر بات ہے کہ زمیندار کیسے سنے گا؟ مَیں نے ضیاء الحق صاحب مرحوم کی ''مرحومہ شوریٰ'' جو ان سے کافی پہلے مرحومہ ہو چکی تھی' میں کہا تھا کہ کم از کم ایک کمیشن بنایئے' جس میں جیّد علماء اور بندوبست اراضی کے ماہرین شامل ہوں اور وہ بیٹھ کر نیا بندوبست اراضی طے کریں کہ شریعت کا تقاضا اور منشا کیا ہے' ہمارا دین کیا چاہتا ہے؟ اُس وقت ایک بہت بڑے زمیندار نے کہا کہ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں' ہم تو سب حنفی ہیں اور حنفی ہونے کے ناطے مزارعت بالکل جائز ہے۔ مَیں نے ان سے کہا: کیا آپ کو معلوم ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مزارعت حرام مطلق ہے؟ کہنے لگے ہمیں نہیں معلوم' لیکن حنفی فتویٰ مزارعت کے جواز میں موجود ہے۔

مَیں نے اسلام کے فلسفے کے حوالے سے دو اصول بیان کیے ہیں' ایک یہ کہ سرمائے کو پابند کرنے کی کوشش کرنا اور دوسرا یہ کہ محنت کو تحفظ (protection) فراہم کرنا اور محنت ہی کو اصل شے قرار دینا۔ اگرچہ پروڈکشن میں سرمایہ لازم رہے گا کہ زمین کے بغیر تو کھیتی نہیں ہوگی۔ چنانچہ کچھ نہ کچھ سرمایہ آپ کو ہر کاروبار کے لیے درکار ہے۔ اب یہ بحث کہ سرمایہ پہلے تھا یا محنت پہلے تھی' محنت نے سرمائے کو جنم دیا یا سرمائے نے محنت کو جنم دیا' میرے نزدیک بڑی دقیق فلسفیانہ بحث ہے' جو ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ البتہ بات نوٹ کر لیں کہ کسی بھی پیداواری مرحلے میں یہ دونوں چیزیں لازماً لگیں گی۔ اس میں بس زور (emphasis) اس بات پر ہے کہ سرمائے کے ہاتھ ذرا باندھے رکھو اور یہ بہت بڑا جن ہے اس کو بوتل کے اندر بند رکھو' قابو رکھو' ورنہ یہ آکاس بیل بن کر پورے معاشرے کے اوپر چھا جائے گا۔ سرمائے کے تحفظ کا منطقی نتیجہ ارتکاز و احتکار کی صورت میں نکلتا ہے اور یہ سرمائے کا ایک ننگا کھیل ہے۔

اسلام سرمائے کے بجائے محنت کو تحفّظ دیتا ہے جبکہ سرمایہ داری میں زیادہ تحفّظ سرمائے کو دیا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں سرمائے کے تحفّظ کی مختلف شکلیں ہیں۔

انشورنس

یہ سرمائے کا سب سے بڑا تحفظ ہے۔ ایک تو لائف انشورنس ہے وہ ایک علیحدہ بحث ہے' میں اس کے بارے میں اس وقت گفتگو نہیں کر رہا۔ انشورنس کا تصوّر دنیا میں کب سے آیا ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے' یہ جان لیں ——— بحری جہازوں کے ذریعے تجارت دنیا میں زمانۂ قدیم سے ہوتی رہی ہے۔ ایک تاجر نے لاکھوں روپے کا مال بحری جہاز کے ذریعے کہیں بھیجا' جہاز ڈوب گیا اور سارا مال ضائع ہو گیا۔ اس پر سوچا گیا کہ کچھ نہ کچھ اس کے سرمائے کا تحفظ ہو جائے' وہاں سے یہ تصوّر چلا ہے۔ اب ہوتا کیا ہے' ایک شخص دس کروڑ سے ایک کارخانہ لگاتا ہے۔ اس کارخانے کے لیے آفاتِ سماویہ کا خطرہ موجود ہے' آگ لگ سکتی ہے' سیلاب آ سکتا ہے اور اس کا مال ختم ہو سکتا ہے' لہٰذا وہ اپنے اس سرمائے کے تحفظ کے لیے انشورنس کراتا ہے' اور انشورنس کے لیے جو پریمیئم ادا کرتا ہے وہ پیداواری قیمت پر ڈال دیتا ہے۔ فرض کیجیے کہ اگر ماچس کا کارخانہ ہے تو اس ماچس کی جو قیمت صارف کو دینی پڑ رہی ہے اس میں دیا سلائی اور اس کے اوپر جو مصالحہ لگا ہے اس کی قیمت کے علاوہ جو لیبر لگی ہے وہ بھی اور سرمایہ دار کے سرمائے کے تحفظ کے لیے جو انشورنس کی گئی ہے' اس کا حصّہ بھی شامل ہے' پھر اس کا اپنا نفع بھی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ سرمایہ دار اپنے سرمائے کا تحفظ صارف کی جیب سے کر رہا ہے۔ جب مل میں آگ لگی' اجتماعی سطح پر قومی دولت کا نقصان ہو گیا' لیکن سرمایہ دار اس نقصان کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ ہے سیدھا سیدھا تجزیہ (analysis) اور یہ ہے انشورنس کی اصل حقیقت۔ گویا یہ سرمایہ داروں کی ایک کوآپریٹو ہے' اس کے سوا کچھ نہیں۔ بینکنگ اور انشورنس ساتھ ساتھ اس لیے چلتے رہے ہیں کہ یہ سرمایہ داری کی دو ٹانگیں ہیں جو سرمائے کا تحفظ کرتی ہیں۔

ان تمام چیزوں کو اسلام کے فلسفہ کے حوالے سے حل کریں گے' تو باقی ساری چیزیں بھی خود بخود حل ہو جائیں گی۔ یعنی اسلام سرمائے کو تحفّظ نہیں دیتا' محنت کو تحفّظ دیتا ہے' اور اس کے ساتھ اسلام سرمائے کو کام کرنے کی کچھ آزادی دیتا ہے لیکن مادر پدر آزادی کی مخالفت کرتا ہے۔

اوورٹریڈنگ اور فارورڈ ٹریڈنگ

کچھ اور چیزیں جو شریعت نے حرام کی ہیں ان کے بارے میں بھی جان لیجیے۔ مثلاً فارورڈ ٹریڈنگ' مستقبل کا ایسا سودا کرنا جس میں قیمت اور مبیع (مالِ تجارت) دونوں ادھار ہوں۔ یہ تمام ایڈوانس بزنس جو دنیا میں ہوتے ہیں یہ بھی وہی سرمائے کا کھیل ہے۔ اس میں سٹہ (speculation) اور جوئے کا عنصر بھی شامل ہے' اس طرح یہ حرام در حرام ہے۔ یہ بھی انشورنس کی طرح سرمائے کا ننگا ناچ ہے کہ نہ کچھ دیا نہ لیا' نہ مال ابھی تیار ہوا' لیکن سودے اس کے کئی ہو چکے ہیں' کئی ہاتھ بدل چکا ہے' اس کے اوپر نفع کی تہہ چڑھتی جا رہی ہے' جب تک یہ صارف تک پہنچے گا نمعلوم سرمایہ دار نے اس پر کتنا کچھ پیسہ بنا لیا ہوگا۔ پھر یہ کہ اوورٹریڈنگ ہو رہی ہے' یعنی سرمائے کی لعنت کو آپ نے اور ضرب دے دی۔ ایک شخص کے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں اور وہ اوورٹریڈنگ میں پچاس لاکھ کا مال لے لیتا ہے تو یہ ناجائز ہے۔

اسلام نے فارورڈ ٹریڈنگ کی صرف ایک شکل جائز قرار دی ہے جس کو ''بیع سَلَم'' کہتے ہیں۔ اگر آپ نے مستقبل کا سودا کرنا ہے تو ٹوٹل رقم (payment) اسی وقت ادا کرنی ہوگی' تاکہ کم سے کم اوورٹریڈنگ نہ ہو اور دوسری طرف مال کی فراہمی بعد میں ہوگی (یا بصورت دیگر قیمت ادھار ہو تو مال فوری سپلائی کر دیا جائے)۔ مثلاً آپ کو ایک ہزار مَن گندم لینی ہے مئی کے مہینے میں' تو آپ وقت سے پہلے سودا کر لیجیے اور فی مَن قیمت طے کر کے ساری رقم ادا کر دیجیے اور گندم مئی کے مہینے میں لے لیجیے۔ یہ ہے بیع سلم' اس کے علاوہ کوئی اور صورت فارورڈ ٹریڈنگ کی جائز نہیں۔

آڑھتی (middle-man) اور آڑھت

اسلام کے معاشی نظام میں ایک اور کوشش آڑھتی (middle-man) کو درمیان سے نکالنے کی گئی ہے۔ ایک حدیث ہے جو بار بار پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے' لیکن اس پر کبھی غور نہیں کیا جاتا۔ میرے ساتھ باقاعدہ لطیفے کے انداز میں ایک واقعہ ہوا ہے۔ مَیں

لاہور کے ایک بڑے عالم دین سے ملنے گیا۔ شیخ الحدیث تھے' فوت ہو گئے ہیں' اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ وہ اس وقت حدیث کا درس دے رہے تھے' مَیں بیٹھ گیا۔ انہوں نے یہ حدیث پڑھی: ((لَا یَبِعْ حَاضِرٌ لِبَادٍ))(۸) ''کوئی شہر کا آدمی باہر کے آدمی کا مال فروخت نہ کرے''۔ یہ حدیث متعدّد طُرق سے روایت ہوئی' متن ایک ہی ہے۔ درس ہو گیا' دعا مانگ لی' طالب علم چلے گئے۔ مَیں نے مولانا سے کہا کہ اس حدیث کی روشنی میں آڑھت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ پہلے تو مَیں چونکا جب انہوں نے پوچھا کہ آڑھت کیا ہوتی ہے؟ ہوسکتا ہے کہ واقعتاً ان کے علم میں نہ ہو یا تجاہلِ عارفانہ ہو۔ جب مَیں نے ان کو آڑھت کے بارے میں بتایا کہ سبزیوں' اجناس اور پھلوں کی منڈیوں میں آڑھتی اپنا اڈّا جما کر بیٹھتا ہے' لوگ باہر سے مال لاتے ہیں' وہ مال خریدتا نہیں' صرف بیچتا ہے اور فروخت کنندہ اور گاہک دونوں کی مجبوری اور لاعلمی سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور دونوں سے کمیشن لیتا ہے' یعنی بیچنے والے سے بھی اور خریدنے والے سے بھی۔ وہ شیخ الحدیث یہ سن کر فوراً بولے ''یہ تو مطلقاً حرام ہے''۔ بتایئے کس نے جائزہ لیا کہ ہمارے کاروبار میں سے کون سا کاروبار جائز ہے اور کون سا ناجائز ہے!

دیکھئے اس کا اصل منشا کیا ہے' اس کا فلسفہ کیا ہے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ آپ چیزوں کی حقیقت کو جان لیں۔ ☆ بعض چیزیں دیکھنے میں بہت خوشنما نظر آتی ہیں لیکن حقیقت میں وہ کچھ اور ہوتی ہیں۔ اس آڑھت کی حقیقت بھی سمجھ لیں —— اگر آپ کے پاس سرمایہ ہے تو باہر کا مال خرید لیجئے' دوکان میں رکھیے' لوگ آپ سے خرید لیں گے' مگر اڈا بنا کر بیٹھ جانے میں تو خباثت پر خباثت ہوتی ہے۔ ہر آڑھتی ایک بینکر بن گیا ہے' وہ اپنے علاقے کے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ایڈوانس دیتا ہے اور اس طرح ان کو پابند کرتا ہے کہ

---

(۸) صحیح البخاری' کتاب الشروط' باب ما لا یجوز من الشروط فی النکاح ۔ وصحیح مسلم' کتاب البیوع' باب تحریم بیع الحاضر للبادی۔

☆ بقول اقبال ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا! (مرتّب)

تمہارا مال میرے اڈے سے ہی جائے گا۔ گویا اس قرض کا ایک صلہ لے رہا ہے' اس شکل میں کہ وہ پابند ہو گیا ہے کہ مال اسی دوکان پر لائے گا اور کمیشن لازماً اسی آڑھتی کو ملے گا تو اب صرف آڑھت نہیں رہی بلکہ اس سے بڑھ کر اس میں بینکنگ شامل ہو گئی۔ اس طرح اس میں ایک کے اوپر دوسرا سود کا ردّا چڑھتا چلا جائے گا۔

مقصدِ خطاب: اسلام کے معاشی فلسفے کی پہچان

مَیں اس وقت جو عرض کر رہا ہوں اس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اسلام کے فلسفے کو سمجھ لیا جائے۔ اسلام کا اصل نظام العمل تو ''قُلِ الْعَفْوَ'' والا نظام ہے جس سے اونچا کوئی سوشلزم دنیا میں ہو سکتا ہی نہیں' کسی انسانی تصوّر میں یہ آ سکتا ہی نہیں۔ یہ تو اسلام کی ایمانی' احسانی اور اخلاقی تعلیم ہے۔ دوسری طرف اسلام کا ایک معاشی نظام قانونی اور فقہی سطح پر ہے' وہ ایک محدود (controlled) اور منضبط (managed) سرمایہ داری ہے۔ management والا حصّہ زکوٰۃ اور عُشر کا نظام ہے۔ اس ضمن میں ایک اور بات ذہن میں رکھیے جس پر ہمارے فقہاء کا اجماع ہے کہ اگر کسی وقت ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے کہ معاشرے کے فقراء کی ضروریات' زکوٰۃ اور عُشر وغیرہ سے پوری نہ ہو رہی ہوں' شہریوں کی کفالت کی ذِمّہ داری پوری نہ ہو رہی ہو تو مالداروں سے جبراً زائد بھی لیا جا سکتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ بس اڑھائی فیصد کی شرح پر ہاتھ بندھ گئے۔ وہ ایک نارمل شرح ہے لیکن اس سے زیادہ بھی لیا جا سکتا ہے۔ بہرحال وہ management جو اسلام نے اس وقت کی تھی' اس میں اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا جو حصّہ (contribution) ہے اسے بھی ذہن میں رکھیے جس تک کہ اہلِ مغرب کی رسائی ابھی تک نہیں ہوئی۔ ان اخلاقی تعلیمات میں انسان کی غیرت وحمیت اور اس کی مروّت کو اپیل کیا گیا ہے کہ یہ صدقات مت لو اور اس میں یہ ترغیب بھی ہے کہ کام کرو' محنت کرو۔

ہم نے اپنے سکول کے زمانے میں ایک حکایت پڑھی تھی جسے سن کر ہم بہت متأثر ہوئے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت کا واقعہ ہے:

''ایک انصاری شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس سوال کرنے کی غرض سے آیا۔

آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: کیا تمہارے گھر میں کچھ ہے؟ وہ بولا کیوں نہیں، ایک کمبل ہے جس کا ایک حصہ ہم بچھا لیتے ہیں اور ایک حصہ اوڑھ لیتے ہیں اور ایک پانی کا پیالہ ہے جس سے ہم پانی پیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ دونوں چیزیں میرے پاس لے آؤ! وہ گیا اور اپنی دونوں چیزیں لے آیا۔ آپ ﷺ نے ان دونوں کو ہاتھ میں لے کر فرمایا: ان کا خریدار کون ہے؟ ایک شخص بولا: مَیں ایک درہم میں خریدتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک درہم سے زائد کون دیتا ہے؟ آپ ﷺ نے دو یا تین مرتبہ فرمایا۔ ایک شخص نے کہا: مَیں ان دونوں چیزوں کو دو درہم میں لینے کے لیے تیار ہوں۔ آپ ﷺ نے وہ دونوں چیزیں اس کے حوالے کر دیں اور اس سے دو درہم لے کر اس انصاری شخص کو دے دیے اور فرمایا: ایک درہم کی کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے کر گھر میں ڈال لو اور دوسرے سے ایک کلہاڑی خرید لو۔ وہ کلہاڑی لے کر آپ ﷺ کے پاس آیا۔ آپ ﷺ نے اس میں لکڑی کا دستہ اپنے دستِ مبارک سے ٹھونکا اور فرمایا: جاؤ لکڑیاں کاٹو اور بیچو اور پندرہ دن تک مَیں تمہیں یہاں نہ دیکھوں۔ پس وہ شخص چلا گیا۔ وہ لکڑیاں کاٹتا اور بیچتا۔ کچھ دنوں میں اس نے دس درہم کما لیے جن سے اس نے کچھ کپڑا خریدا اور کچھ کھانے پینے کا سامان۔ آپ ﷺ نے (اس کی خوشحالی دیکھ کر) فرمایا: تمہارے حق میں یہ بہتر ہے اس بات سے کہ قیامت کے دن تمہارے منہ پر مانگنے کی وجہ سے ایک داغ لگا ہو۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا: سوال کرنا درست نہیں مگر تین طرح کے آدمیوں کے لیے، ایک وہ جو نہایت مفلس ہو، خاک میں لوٹتا ہو۔ دوسرا وہ جو پریشان کن قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہو اور تیسرا وہ جس کے پاس دیت میں دینے کے لیے کچھ نہ ہو۔'' (سنن ابی داؤد)

اب یہ اخلاقی تعلیم ہے۔ کفالتِ عامہ اور اجتماعی بہبود کے اندر اگر اخلاقیات کا یہ عنصر شامل نہ ہو تو اس ویلفیئر کا حشر بھی وہی ہوگا جو اُن ممالک کے اندر ہو رہا ہے۔ اس میں بے ایمانیاں بھی ہو رہی ہیں، یعنی کام بھی کر رہے ہیں اور ویلفیئر بھی لے رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر جو کچھ ہمارے پاکستانی سویڈن اور ڈنمارک میں کر رہے ہیں وہ تو ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ ان میں غیرت، شرافت اور حمیت نام کی کوئی رمق باقی

نہیں رہی۔ وہ بڑے عیش اور فخر سے خیرات پر جی رہے ہیں اور اسی وجہ سے ان ممالک میں چپکے ہوئے ہیں' وہاں سے نکل نہیں سکتے' حالانکہ خاندان برباد ہو رہے ہیں۔ اس حوالے سے مَیں صرف اتنا کہوں گا کہ آدمی جب کمینگی اور بے غیرتی کا عادی ہو جائے تو بفحوائے فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے لیے موت زندگی سے بہتر ہے: ((فَبَطْنُ الْاَرْضِ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ ظَهْرِهَا))(۹) ''تب زمین کا پیٹ تمہارے لیے زمین کی پیٹھ سے بہتر ہے!''

معاشرے میں معاشی توازن کے لیے اسلام کی تدابیر

اسلام کے معاشی نظام میں ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی کفالت اسلامی ریاست کے ذمے ہے اور اس کے لیے اس کے پاس زکوٰۃ اور عُشر وغیرہ ذرائع ہیں۔ اس کے علاوہ انسان کو آزادی ہے کہ چاہے زمین سے کمائے' دکان یا کارخانے سے کمائے' محنت کرے' کوشش کرے۔ البتہ آزادی کے ساتھ ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ اس سرمائے کو زنجیر پہنا کر رکھو' سرمائے کا یہ جن ضرورت سے زیادہ نہ کھل کھیلے' ورنہ یہ آکاس بیل بن جائے گا اور پورے معاشرے کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔ اس کے لیے اسلام نے مختلف تدابیر اختیار کی ہیں جن سے معاشرے میں ایک طرح کا توازن پیدا ہوتا ہے۔

(۱) جنسی محرکات پر پابندی: جنسی جذبہ انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے اور یہ جذبہ انسان کے اندر سب سے طاقتور (potent) جذبۂ محرکہ ہے۔ اسلام نے انسان کے اس جذبہ کو مشتعل (exploit) کر کے کمائی کرنے کو حرامِ مطلق قرار دیا ہے۔ چنانچہ ساری فلم انڈسٹری' قحبہ گری کا کاروبار اور فحش لٹریچر کی طباعت و اشاعت اور خرید و فروخت کا سارا دھندا اس اصول کے تحت حرام ہے۔

(۲) منشیات فروشی پر پابندی: اسی طرح انسان کی کمزوریوں کو مشتعل (exploit) کر کے کمائی کرنا بھی حرام ہے۔ چنانچہ شراب' ہیروئن اور دیگر منشیات کو کمائی کا ذریعہ بنانا حرام ہے۔

---

(۹) سنن الترمذی' کتاب الفتن' باب ما جاء فی النهی عن سبّ الریاح۔

(۳) اسراف وتبذیر کی ممانعت: انسان اکثر و بیشتر تعیش کے لیے دولت کماتا ہے' لیکن اسلام نے عیاشی کے تمام دروازے بند کر دیے ہیں۔ قرآن مجید نے اسراف وتبذیر دونوں سے بچنے کا حکم دیا ہے۔ اسراف یہ ہے کہ آپ کے لیے کوئی شے ضروری ہے لیکن آپ نے اس پر ضرورت سے زیادہ خرچ کیا ہے۔ مثلاً غذا آپ کی ضرورت ہے' آپ کی ضرورت ایک سالن روٹی سے پوری ہوسکتی ہے لیکن آپ نے دس دس کھانے پکائے ہوئے ہیں' یہ اسراف ہے۔ تبذیر یہ ہے کہ بلا کسی ضرورت کے محض اپنی دولت کے مظاہرے کے لیے خرچ کرنا' جس طرح ہمارے ہاں شادیوں اور مختلف تقریبات میں ہوتا ہے۔ تبذیر کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيٰطِينِ﴾ (بنی اسراء یل ۲۷) ''بے شک دولت کی نمود و نمائش کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں''۔ یہ مبذرین شیطانوں کے بھائی کس طرح ہیں' اس کو نوٹ کیجیے۔ شیطان کا سب سے بڑا حربہ خمر اور میسر کے حوالے سے قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطٰنُ أَنْ يُّوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ﴾ (المائدۃ: ۹۱) ''شیطان یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمہارے اندر باہمی دشمنی اور بغض پیدا کر دے''۔ یہی کام تبذیر سے ہوتا ہے۔ فرض کیجیے ایک کروڑ پتی کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہے اور ایکڑوں پر پھیلی ہوئی کوٹھی بقعہ نور بنی ہوئی ہے۔ ایک ایک پتے کے ساتھ بلب اور قمقمہ لگا ہوا ہے۔ اسی سیٹھ کا کوئی شوفر ہے' دربان ہے' چوکیدار ہے اور ہوسکتا ہے' کہ اس کی بچی بوڑھی ہو رہی ہو اور اس کے ہاتھ پیلے نہ ہو سکتے ہوں' صرف اس بنا پر کہ بنیادی ضروری چیزیں بھی اس کے پاس نہیں ہیں۔ اس موقع پر اس کے احساسات کیا ہوں گے' اس کی کیفیت کیا ہوگی؟ کیا موقع ملنے پر وہ سیٹھ کا پیٹ نہیں پھاڑے گا؟ یہ ہے وہ بغض اور عداوت جس کی وجہ سے بلاوجہ دولت کی نمود و نمائش کرنے والوں کو شیطانوں کے بھائی قرار دیا گیا ہے۔

اس حوالے سے ایک اسلامی ملک میں قانون سازی ہوسکتی ہے اور دولت کی نمود و نمائش پر پابندی عائد کی جاسکتی ہے۔ یہ بھی طے کیا جاسکتا ہے کہ اتنے رقبے سے زیادہ بڑا

مکان کوئی نہیں بنا سکتا' وغیرہ وغیرہ۔اب اگر یہ پابندیاں لگیں گی تو پھر آدمی دولت کیونکر جمع کرے گا۔ یہ ساری چیزیں توازن اور اعتدال پیدا کرنے والی ہیں۔

حرفِ آخر

مَیں نے اسلام کے معاشی و اقتصادی نظام کا بنیادی فلسفہ اپنی سمجھ کے مطابق آپ حضرات کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اسلامی معیشت کے بارے میں قرآن مجید نے صرف ایک اصول دیا ہے: ﴿كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ﴾ (الحشر:۷) یعنی ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ سرمایہ تمہارے اغنیاء ہی کے مابین گردش میں رہے۔ معاشرے میں سرمائے کی مساوی بنیادوں پر تقسیم (equal distribution) ہونی چاہیے تاکہ عوام کے درمیان معاشی ناہمواری ایک حد سے بڑھنے نہ پائے۔ یہ اسلام کے معاشی نظام کا فلسفہ اور حکمت ہے جو مجھے سمجھ آیا ہے۔ باقی جہاں تک اس کے اصول و مبادی اور باقی تفاصیل کا معاملہ ہے اور خاص طور پر جدید اقتصادی مسائل اور ان کی پیچیدگیاں ہیں' یہ واقعتاً ایسی چیزیں ہیں جن کے لیے ماہرینِ معاشیات کو محنت اور مشقت سے کام کرنا پڑے گا۔

اقول قولی هذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات○○